ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق وفلسفۂ اخلاق ۔ فہمِ قرآن ۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" ۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال ۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" ۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اوّل ۔ اسلام کا نظامِ حکومت ۔ ہمارا ملک ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" ۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر ۔

۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر ومغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن ۔ اسلام کا نظامِ مساجد ۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا ۔

۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابتِ حدیث ۔

۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت ۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

مردوزن حج کے لئے آتے، آپؐ انھیں ملے تو انھوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور آپؐ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تجویز پسند آئی، مکہ میں حالات دن بدن خراب تر ہوتے جا رہے تھے، اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہوتا جا رہا تھا، آپؐ نے اس شرط پر اُن کی دعوت قبول کر لی کہ وہ ہر تلخ و شیریں حالت میں آپؐ کا ساتھ دیں گے اور آپؐ کی اور آپؐ کے ساتھیوں کی ہر قیمت پر حفاظت کریں گے، اس کے مقابل آپؐ نے بھی وعدہ کیا کہ آپؐ اور آپؐ کے مکی رفقا بھی ہر میدان میں ان کے معاون و ناصر ہوں گے، اور مرتے دم تک ان سے جُدا نہ ہوں گے، اس نئی صورتِ حال سے اُفقِ امتِ مسلمہ پر اُمید کا ایک نیا آفتاب طلوع ہوا، اور امید بندھی کہ مکہ میں تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے اہلِ توحید مدینہ پہنچ کر ایک مربوط نظام اور معاشرے میں ڈھل جائیں گے، دشمن سے کامیاب دفاع کر سکیں گے، اور تعلیماتِ قرآن کے مطابق ایک خدا پرست، دیندار، با اخلاق، نافع الناس معاشرے کی تشکیل کریں گے، جو عرب بلکہ عالمِ انسانیت کے پُر فساد ماحول میں چراغِ ہدایت ثابت ہوگا، جنھیں دیکھ کر بنی نوعِ انسان کے قلوب میں از سرِ نو انسانیت، شرافت اور احترامِ آدمیت پر اعتماد پیدا ہوگا، اور دنیا میں عدل، امن اور حق و صداقت کی راہ ہموار ہوگی، چنانچہ جب قریشِ مکہ کے مظالم حد سے بڑھ کر ناقابلِ برداشت ہو گئے، اور امتِ مسلمہ کے اس ہراول دستے کی جان، مال و آبرو کے لئے شدید خطرہ سروں پر منڈلانے لگا، بدی کی قوتوں نے مٹھی بھر فرزندانِ توحید کو کسی نئی جائے پناہ کی تلاش پر مجبور کر دیا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام القریٰ مکہ کے ان زبدۂ الدہر فرزندوں کو یثرب میں اپنے دینی بھائیوں کے پاس ہجرت کر جانے کا حکم دیا، جس کی طرف قرآن کا اشارہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

کاش یہ بے علم کافر جانتے کہ جن لوگوں نے راہِ خدا میں اُن کے ظلم سہنے کے بعد ہجرت کی ہے

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (النحل)	ہم انھیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کیوں کہ ان لوگوں نے راہِ صدق و صفا میں صبر کیا اور اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں۔
۲۔ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران)	پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور انھوں نے دشمنوں سے قتال کیا اور راہِ خدا میں شہید ہوئے ہم اُن کے سیئات کو دور کر دیں گے اور انھیں ان باغوں میں داخل کریں گے جن میں نہریں جاری ہیں یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے، اور اللہ کے ہاں عمدہ بدلہ ہے۔

عالمِ انسانیت کی اس عظیم تحریک کا سنہری باب آخر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیقِ غار سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی ہجرت سے لکھا گیا، خدا کا رسولؐ اور آپ کا رفیقِ سفر دونوں انتہائی خطرناک حالات میں مکہ سے نکلے اور دشمن کی سر توڑ کوشش کے باوجود، اس کے خطرناک ارادوں سے محفوظ رہ کر مدینہ میں اپنے احباب سے جا ملے۔

اسلامی (آسمانی) تحریک کا عظیم ترین انقلاب آفریں دن

یکم محرم الحرام اپنی عظمت، اثر آفرینی اور تعمیرِ انسانیت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صدیوں پہلے قیامِ توحید کے لئے ایثار و محبت کا بلند نمونہ پیش کیا، لیکن یہ ایک انفرادی مثال تھی، لیکن یکم محرم الحرام اُس اُمت، سنت و ملتِ ابراہیمی کے پابند اور آپ کی دُعا کے مصداق ایک عظیم حزب اللہ کی یاد دلا

ہے، جس نے خدائے واحد پر ایمان کی خاطر ہر اُس قربانی کا مظاہرہ کیا، جس کی کسی حق پرست جماعت سے توقع ہو سکتی تھی، انھوں نے پہلے تو سیدنا ابراہیم خلیل اللہؑ کی طرح دشمنوں کے درمیان سالہا سال تک بے چون وچرا جسمانی اور مالی قربانی دی، اور مخالفوں کے جور و تشدد کے دانت کھٹے کئے۔ پھر جب ہجرت کا حکم ہوا تو یہ عاشقانِ اسلام، محبانِ رسولؐ خیر الانام، فرزندانِ توحید، سب کچھ قربان کر کے رضائے الٰہی کی خاطر غیر ملک میں پناہ گیر ہوتے، پھر ایک وقت آیا کہ ملائکہ صفت توحید پرستوں کا یہ گروہ راستے کی صعوبتوں اور خطرات سے بے نیاز، گھربار، زر و مال، کاروبار، اہل وعیال، والدین، بہن بھائی، دوست واحباب، حرمِ کعبہ کی قربت اور وطنِ عزیز کو ترک کر کے خالی ہاتھ، بے یار ومددگار، مگر دولتِ ایمان سے مالامال، مدینہ منورہ جا پہنچا، اور زندگی کے باقی ایام بھی اپنے آقا کے اشارے پر جہاد، مسلسل جہاد میں صرف کر دئے، ان کی قوتِ ایمانی، ایثار اور تبتّل الی اللہ اس قدر زیادہ تھا کہ جب چند سال بعد یہ عظیم ترین اہلِ ایمان فتحیاب ہو کر مکہ لوٹے تو اپنی چھوڑی ہوئی املاک کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور دار الہجرت مدینہ کی سکونت ترک نہ کی، اور دنیا پر ثابت و واضح کر دیا کہ اُمتِ مسلمہ، خاتم الانبیاء کی مزکّیٰ و مطہّر جماعت، جب ایک بار راہِ حق میں قدم اُٹھا لیتی ہے تو پھر اُس کے قدموں میں لغزش نہیں آتی، اور اللہ تعالیٰ کی محبت ہی تمام خواہشات و تعلقاتِ دنیا پر غالب رہتی ہے۔

یہ اہلِ توحید در اصل بے یار ومددگار نہ تھے، اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت انھیں حاصل تھی، قدم قدم پر اللہ کے وعدے، برکات، اور دشمنوں کے خلاف کامیابیاں ان کے مقصد وعمل کی صداقت پر گواہی دے رہی تھیں، مدینہ منورہ کے سرفروش اہلِ ایمان انصار نے ایفائے عہد، ایثار، اخوتِ اسلامی اور ایمانی محبت کا جو نمونہ پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے، انھوں نے ان دینی بھائیوں کو، اپنے بال بچوں اور نفسوں پر ترجیح دی، جس پر قرآنی الفاظ

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ شاہد ناطق ہیں، یہ الفاظ جہاں ان ناصرانِ حق کی عظمت پر گواہ ہیں، وہاں اُس معاشرے کی نشاندہی کرتے ہیں، جو اسلام کا منشا تھا، جو آں حضرت صلعم نے قرآنی روح کے مطابق قایم کیا، جس کا نمونہ ان مٹھی بھر اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ اہلِ ایمان نے آٹھ سال بعد آسی (۸۰) کے قریب چھوٹی بڑی جنگیں لڑکر پیش کیا اور ایک لمحہ بھر بھی ان کے پائے استقامت اور جذبہ جہاد و شہادت میں کمی واقع نہ ہوئی، انصار مدینہ کے اس ایثار و خلوص کے مقابل مہاجرین نے بھی سیر چشمی اور احسان شناسی کی انتہا کردی، اور جب انصار نے انھیں اپنی زمینوں، اموال، باغات، مکانوں، حتیٰ کہ ازواج کو طلاق دے کر نکاح کر لینے کی پیشکش کرکے دینی اخوت کا حق ادا کرنا چاہا تو مہاجرین کے سینے تشکر و امتنان سے بھر گئے، فرطِ مسرت سے ان کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں، مگر اپنے انصار بھائیوں سے کچھ لینے سے انکار کردیا، البتہ اُن کے تعاون سے کاروبار میں لگ گئے اور پھر ان کے ساتھ عزیزوں سے بڑھ کر سلوک کیا۔

بلاشبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا دن تاریخِ انسانیت میں نمایاں مقام رکھتا ہے اور آپ ہی اُمتِ مسلمہ کے قافلے کے ہادی، اسوۂ کامل اور سراجِ منیر ہیں، لیکن آپ کی بعثت کا مقصود، دعائے خلیلؑ و اسماعیلؑ کی مصداق امت مسلمہ کی تشکیل، تطہیر اور تنظیم تھی، کیوں کہ سنت اللہ کے مطابق ہادیان امت درمیان سے اُٹھا لئے جاتے ہیں۔ اور آیندہ رہنمائی کے لئے کتاب اللہ کی صورت میں ان کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ باقی رہ جاتے ہیں، امت ان کی قائم مقام ہوتی ہے۔ جو تبلیغ اور عمل سے آسمانی مشن کو زندہ رکھتی اور آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے، اور ختمِ نبوت اور تکمیل دین کے بعد اب اُمتِ مسلمہ ہی قیامت تک ہادی و معلمِ نوعِ انسان ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں امتِ مسلمہ کی تشکیل و تنظیم کا اولین مظاہرہ ہجرتِ مدینہ کی صورت میں ہوا، جن لوگوں پر نزولِ قرآن ہوا، جن پر آیاتِ الٰہی روز و شب پڑھی جاتی تھیں، انھیں ہجرت کی اہمیت کا پوری طرح احساس

تھا، خود اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کو بار بار مہاجرین و انصار کے ناموں سے یاد کیا ہے، اور اس طرح ہجرت اور سن ہجری کی عظمت کو دلوں میں جاگزیں کرنے کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔
اور اصحابِ رسولؐ نے اس انقلابی واقعہ ہجرت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسلامی سال کی ابتدا ہجرت سے کی، پھر بعد کے ائمہ، فقہاء، اولیاء اور اربابِ فکر و نظر نے اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اس سن کو برقرار رکھا، حتیٰ کہ کفر و نفاق کی آندھیوں نے ہجرت کی اہمیت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور امتِ مسلمہ کے ساتھ ان کا یہ عظیم ترین کارنامہ بھی فراموش کر دیا گیا، پس یاد رہے کہ ماہ محرم الحرام کو غلبۂ اسلام اور اتحادِ عالم میں منفرد مقام حاصل ہے، اور اگر آج امتِ مسلمہ دنیا میں اپنا صحیح اور بلند مقام حاصل کرنے کی متمنی ہے، تو اسے اس دن اور مہینے کی اہمیت کو تازہ کرنا ہوگا۔

قرآنِ حکیم نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزولِ مدینہ سے قبل ایمان لانے والے مہاجرین و انصار کو جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ اس گروہ کی علوِ مرتبت پر شہادتِ کبریٰ ہے۔ اور اس محبت، ایثار اور شفقت کا مظہر ہے جو ان فوق البشر اہلِ ایمان کے سینوں کی زینت ہے، جیسا کہ آیاتِ ذیل سے عیاں ہے

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ
تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ
مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ
حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ
شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

"یہ مال فے (غنیمت) ان نادار مہاجروں
کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور مالوں سے
نکالے گئے محض اس لئے کہ وہ صرف اللہ
کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں، اور اللہ
اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ
ایمانوں میں صادق ہیں، اور وہ جو ان سے
پہلے دار الہجرت مدینہ میں رہتے اور ایمان رکھتے
تھے، وہ ہر اس شخص سے محبت کرتے ہیں،
جو ہجرت کرکے ان کی طرف آیا ہے اور اپنے

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (الحشر)

سینوں میں اُس کی کوئی حاجت نہیں پاتے جوان نادار مہاجروں کو دیا جاتا ہے، اور وہ اپنے آپ پر ان کو مقدم رکھتے ہیں، گو انھیں خود تنگی در پیش ہو اور جو شخص اپنے نفس کے بخل سے بچ جائے، تو وہی کامیاب ہوں گے۔ اور وہ جو اُن کے بعد آئے، کہتے ہیں کہ ہمارے رب ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی مغفرت فرما جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے، اور ہمارے دلوں میں اُن کے لئے جو ایمان لائے حسد وکینہ پیدا نہ ہونے پائے، اے ہمارے رب تو مہربان، رحم کرنے والا ہے"

یہ آیات ۷ھ میں نازل ہوئیں، جب کہ مدینہ کی شہری زندگی کو بنی نضیر کے بدعہد مفسد یہودی عناصر سے پاک کر دیا گیا، اور ان کے اموال مسلمانوں کے تصرف میں آ گئے ان آیات میں تین گروہوں کا ذکر ہے، جن کی فلاح وکامرانی کی شہادت پیش کی گئی ہے، پہلا گروہ ان مہاجروں کا ہے، جو مکہ میں ۱۳ سال تک دامنِ رسول سے وابستہ رہ کر ہر گونہ مصائب وآلام کی بھٹی میں سے گذرے اور آخر کار ارشادِ ربانی پر دنیا اور اس کے علائق سے منہ موڑ کر مدینہ چلے آتے، فدائیانِ رسولؐ کے اس مقدس گروہ نے دنیا کو خدا کی راہ میں ترک کیا تو جب انصار مدینہ نے قوتِ لا یموت کے طور پر انھیں دنیا کا مال پیش کرنا چاہا تو انھوں نے کمالِ استغنا سے اُسے لینے سے انکار کر دیا، اور اپنی محنت کی کمائی، کسب حلال پر اکتفا کیا بلکہ اس سے بھی پس انداز کر کے راہِ حق میں صرف کرتے رہے، اور اس چار سال کی مدت میں جب بدر، احد اور دوسری جنگوں میں جہاد کے لئے پکار آگیا تو خدا اور رسول کا حکم ملتے ہی اپنے نئے کاروبار، گھر بار، اور اہل وعیال

کو خدا کے سپرد کر کے انصار کے پہلو بہ پہلو رسولِ خدا کے پیچھے صف بستہ ہو گئے، اور کسی قربانی سے دریغ نہ کیا، خدا اور اُس کے رسولؐ کی نصرت کی، اور یہ سب کچھ کس لئے؟ وَیَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا، محض اللہ کے فضل اور خوشنودی کے لئے، کیا اجتماعی سرفروشی اور ایثار کا اس سے بلند تر مقام ممکن ہے؟ خدا کی طرف سے یہ سند مبارک ہوا ابوبکر صدیق اکبرؓ کو، عمر ابن الخطابؓ کو، عثمانِ غنیؓ کو، علیؓ بن ابوطالب (عبد مناف) کو، حمزہؓ بن عبدالمطلب کو، عبدالرحمن بن عوفؓ کو، مصعبؓ بن عمیر کو، زبیرؓ بن عوام کو، عثمانؓ بن مظعون کو، طلحہؓ بن عبید اللہ کو، سعدؓ بن ابی وقاص کو، ابو عبیدہؓ بن جراح کو، زیدؓ بن حارث کو، بلال حبشیؓ کو، صہیبؓ رومی کو، خبابؓ بن ارت کو، اور دیگر تمام مہاجرین کو، (رضوان اللہ علیہم اجمعین) جنھوں نے احسن طریق سے خدا اور رسولؐ سے اپنے عہد کو پورا کیا۔

کاروانِ جہاں نو کے ان حُدی خوانوں کا دوسرا حصہ ان انصار مدینہ سے عبارت تھا جو اگرچہ مہاجرین کے بعد دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے، لیکن مہاجرین کی طرح ہجرت سے قبل ایمان لائے تھے اور انھوں نے خطرات کی سنگینی سے واقف ہوتے ہوئے بھی جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر سرورِ عالمؐ اور مہاجرین کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی، اور اپنے ان مہاجر بھائیوں سے متعلق جس جذبہ کا اظہار کیا، وہ محبت کا وہ جذبہ تھا۔ جو تعلقات میں اعلےٰ اور شریف ترین جذبہ ہوتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو کچھ انھوں نے مکانوں اور مالوں کی صورت میں مہاجرین کو دیا، اس کی واپسی کا ان کے قلوب پر مطلق خیال تک نہ تھا، اور یہ ان کی فلاح کا معیار ٹھہرا (وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ) پھر جنگِ بدر، اور جنگِ اُحد وغیرہ میں متواتر تین سال تک آتشِ جنگ میں کود کر وفائے عہد پر مہر ثبت کر دی تھی، ان پر جنگوں میں ان کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا، مگر ان کے حوصلے پست نہ ہوئے، اور جب ایثار و قربانی کے بعد مال و دولت کی تقسیم ہوئی تو پھر بھی یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ کے مصداق تمام مال نادار مہاجرین میں تقسیم کر دیا اور مہاجرین کی طرح ہی بے لوث ایثار سے

فضل ورضائے الہٰی کو اپنا مقصود بنایا، یہ وہ اُمّتِ مسلمہ تھی جو دعائے ابراہیم واسماعیل (علیہما السلام) کے مطابق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کی تھی، یہی قیامت تک آپ کی صداقت پر سند اور پیغام الہٰی کی علمی وعملی تصویر اور حامل ٹھہری۔

تیسرا گروہ ان مومنین کا ہے جو ہجرتِ نبوی کے بعد امتِ مسلمہ میں شامل ہوا یا قیامت تک شامل ہوتا رہے گا، ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو ہجرتِ نبوی کے بعد فتح مکہ تک، یا فتح مکہ سے وصالِ نبوی تک، یا پھر وصالِ نبوی سے تا قیامِ قیامت اس گروہ مہاجرین و انصار کے نقشِ قدم پر چل کر اُمّتِ مسلمہ میں اضافہ کرتے رہے اور کرتے رہیں گے۔ اس گروہ کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ جہاں وہ اپنے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت ورحمت کے طالب ہیں وہاں وہ ان اصحاب وناصرانِ رسولؐ، انصار ومہاجرین یا ان کے بعد آنے والے اہلِ ایمان کے درجات کی بلندی کے لئے شب وروز دعائیں کرتے ہیں، اوران کی دلی تڑپ اس دعا سے عیاں ہے کہ الہٰی ہمارے قلوب میں اپنے ان افضل وبرتر، اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اوران کے بعد آنے والے اہلِ ایمان کے لئے دل کے کسی گوشے میں مخالفانہ خیالات اور جذبات کی آلائش پیدا نہ ہو۔ بلکہ ان کا ایمان، محبتِ الہٰی، ایثار، انابت الی اللہ، خلوص نیت وعمل، جہاد فی سبیل اللہ اور عشقِ رسول، ہمارے لئے مشعلِ ہدایت رہے۔

پس اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلعم کے ارشاد پر ہجرت کرنے والے مہاجرین، ان مہاجرین کی راہ میں آنکھیں بچھانے والے انصار اوران ہر دو گروہوں کی محبت میں سرشار اوران کی روشن کی ہوئی مشعل کو لے کر دنیا میں آگے ہی آگے بڑھنے والے اہلِ ایمان ہی سے حزب اللہ اور امتِ مسلمہ عبارت ہے، جس کی محبت خدا اور رسول کی محبت اور جس سے ایک قدم دوری قرآن کا انکار، کفر، خسران اور گمراہی ہے۔

سورۂ حشر کی ان آیات کی تائید آں حضرت صلعم کے وصال سے ایک سال پہلے نازل شدہ سورۂ توبہ کی درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(سورۂ توبہ)

مہاجرین اور انصار میں سے ایمان میں سبقت لے جانے والے اور وہ لوگ جنھوں نے ان مہاجرین وانصار کی احسن طریق سے پیروی کی، ان تینوں گروہوں سے اللہ راضی ہوگیا اور وہ بھی اللہ سے راضی ہوگئے، اور اللہ نے ان کیلئے باغات تیار کر رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ خدا کے ہاں بڑی کامیابی ہے۔"

اس آیت میں بھی سورۂ حشر میں مذکور تینوں خدا کے محبوب گروہوں کا ذکر ہے، یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزولِ مدینہ سے قبل ہجرت کرنے والے مہاجرین، ان کے مدنی انصار اور ان مہاجرین وانصار کے نقشِ قدم پر چلنے والے بعد کے اہلِ ایمان، امتِ مسلمہ کی اجتماعیت کا خلاصہ یہی مہاجرین وانصار ہیں، یہی خیرِ امت ہیں (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) جو فلاحِ انسانیت کے سلسلہ میں مشعلِ رحمت و ہدایت ہیں، یہی كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کی مصداق عالمی اُمتوں کی سردار اُمت ہے یہی ایمان و عمل کا نمونہ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہیں، یہی اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ناصر ہیں، جنھوں نے رضائے الٰہی کی جنت کے عوض اپنے اموال اور نفوس اپنے اللہ کے ہاتھ فروخت کر دئے ہیں۔ انھوں نے مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ کی صدائے آسمانی پر نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کا نعرہ لگایا، اور اُن کے بعد مومنین، متقین اور صالحین اُمت کا وہ گروہ ہے، جس نے ان مہاجرین وانصار سے دل وجان سے محبت کی، ان کے ایمانی نمونہ پر چلے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روشن کی ہوئی شمع پر پروانہ وار فدا رہے، اور حضورؐ کے لگائے ہوئے چمن سے لطف اندوز ہوتے رہے اور اس کی آبیاری کو عینِ ایمان سمجھا اور سمجھتے رہیں گے، یہی وہ مبارک اُمتِ مسلمہ ہے جس سے تا قیامت اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی کا اعلان کیا ہے، اور جو کوئی بدقسمت

فرد یا گروہ اپنی نابکار پھونکوں سے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اس روشن کی ہوئی شمع کو بجھانے کی ناپاک اور مذموم سعی کرے گا، وہ نامراد رہے گا۔ وَذَالِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۔

سورۃ الواقعہ میں اسی اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی جماعت کو بشارت دی گئی ہے ۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ مُّتَّكِئِیْنَ عَلَیْهَا مُتَقٰبِلِیْنَ (الواقعہ)

اور اہلِ ایمان میں سبقت لے جانے والے سب سے آگے ہی ہیں وہ مقربانِ الٰہی ہیں، نعمتوں والے باغوں میں ایک بڑی جماعت پہلوں میں سے اور تھوڑے پچھلوں میں سے، جڑاؤ تختوں پر ان پر تکئے لگائے ہوئے آمنے سامنے ہوں گے۔

امت مسلمہ کے ان تین اجزاء کا سورۂ انفال میں ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰئِكَ مِنْكُمْ (الانفال)

اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انھیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی یہی سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور عزت والا رزق ہے اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سال کی یہ آیت بھی ان تین سعادت مند، خوش نصیب گروہوں کی مدح و ستائش میں ہے، یعنی ابتدائی دور میں ایمان لانے والے مہاجرین اور مجاہدین فی سبیل اللہ، پھر ان کو پناہ دینے والے مدینہ کے اہلِ ایمان، یہ دونو گروہ پکے اور سچے مومنین ہیں، جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنت اور اس میں عزت والا رزق تیار کر رکھا ہے، پھر وہ سعید لوگ بھی ان ہی کا حصہ اور انعاماتِ الٰہی کے مستحق ہیں، جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آپؐ کی ہجرت

کے بعد اور فتح مکہ سے قبل ایمان لائے۔ ہجرت کرکے آپؐ کے مبارک قدموں میں آ بیٹھے اور مہاجرین وانصار کے گروہ کی معیت میں راہِ خدا میں جہاد کرکے امتِ مسلمہ کے بابرکت وجود کا حصّہ بن گئے اور اسی طرح تاقیامت جو لوگ اس مقدس گروہ کے نقشِ قدم پر چل کر راہِ خدا میں حسبِ ضرورت ہجرت اور جہاد کریں گے، ان کا حشر حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے جاں نثار مہاجرین وانصار اور ان کے کامل متبعین کے زمرے میں ہوگا، انھیں جنت الفردوس میں انعاماتِ سماوی سے نوازا جائے گا اور یہ آسمانِ ہدایت وصداقت پر ستارے بن کر چمکیں گے، رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

ہجرت کے بعد آزمائش کا نیا دور | وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں امتِ مسلمہ ایک سیسہ پلائی گئی دیوار (بنیان مرصوص) بن گئی تھی۔ انھوں نے تیرہ سال تک فرداً فرداً اپنے ایمان، استقامت اور کوہِ وقار صبر کا مظاہرہ کیا تھا اور اب وقت آگیا تھا کہ سیدنا خلیل اللہ کی دعاؤں اور تمناؤں کا ثمر امتِ مسلمہ، غلبۂ حق و اقامتِ دین کے لئے متحدہ ہوکر جہاد کرے۔ مدینہ میں مسلمانوں کے اس اجتماع کو قریش مکہ، یہود ومشرکین مدینہ اور قرب ونواح کے دشمن قبائل نے تشویش اور معاندت کی نظر سے دیکھا اس لئے قریش نے حجاز کے غیر مسلم، اسلام دشمن عناصر کو اپنے ساتھ ملایا اور اس بات کا ارادہ کرلیا کہ اس سے پیشتر کہ مسلمانوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور وہ مدینہ میں مضبوطی سے قدم جما کر ان کے اقتدار، تجارتی مفاد، مذہبی اجارہ داری استحصال اور عظمت وتسلط کے لئے خطرہ کا موجب بن جائیں، وہ سب مل کر اہلِ ایمان کے اس مختصر، کمزور اور پریشان حال گروہ کے وجود کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خطرے کا پوری طرح احساس تھا، اس لئے آپ نے مدینہ میں نزول کے فوراً بعد یہودیوں اور قرب وجوار کے بدوی قبائل سے بیرونی دشمن کے خلاف مل کر مدافعت اور ایک دوسرے کی حفاظت کا عہد وپیمان کیا، گو انصار مدینہ سے دیرینہ

تعلقات و مواعید کی بنا، پر یہود و دیگر قبائل اس عہد و پیمان پر آمادہ ہوگئے، لیکن بالخصوص یہود کو اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اجتماع سے تشویش ہوئی، وہ مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے اپنے آپ کو عربوں پر فائق سمجھتے تھے، مگر ان کے بعض علمار نے اسلام قبول کرلیا تو انھیں اپنی جمعیت منتشر ہوتی نظر آئی پھر مدینہ کی تجارت یہود کے ہاتھ میں تھی، لیکن جب مکہ کے تجارت پیشہ مہاجرین نے مدینہ میں کاروبار شروع کیا تو انھیں اپنی اجارہ داری خطرے میں نظر آئی اس کے ساتھ ساتھ قریش مکہ نے انھیں دھمکی دی کہ اگر تم نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تو قریش تمھیں برباد کردیں گے، اور اگر وہ قریش کا ساتھ دیں تو مسلمانوں کو ختم کردیا جائے اور یہود کی برتری دوبارہ قائم ہوجائے گی، ان وجوہ کی بنا، پر یہود اسلام اور مسلمانوں کی بربادی کے لئے سازشیں کرنے لگے، خود انصار کے قبائل اوس و خزرج کا ایک طبقہ اپنے قبائل کی اکثریت کا ساتھ دیتے ہوئے زبان سے مسلمان ہوگیا، لیکن یہ لوگ دراصل مسلمان نہ ہوئے تھے، اور مہاجرین کی موجودگی کو اپنے اقتدار اور بالادستی کے منافی سمجھتے تھے، منافقین کا یہ گروہ بھی چاہتا تھا، کہ مدینہ سے آں حضرت صلعم اور مہاجرین مکہ کو نکال دیا جائے۔ اور وہ خطرہ ٹل جائے جو مہاجرین کا ساتھ دینے کی وجہ سے کفارِ عرب بالخصوص قریش مکہ کی طرف سے نظر آرہا تھا، اور انھوں نے مسلمانوں میں یہ پروپگنڈہ شروع کردیا تھا کہ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ۔ ان کے دین نے انھیں دھوکے میں مبتلا کردیا ہے اور اب یہ اپنی غلطی کی وجہ سے فنا ہوجائیں گے۔ اور اس سلسلہ میں وہ بھی یہود کے ہمنوا اور شریکِ سازش تھے، ان حالات میں قریش مکہ نے مدینہ کے یہود اور منافقین سے سازباز کی، اور مسلمانوں کے خلاف انھیں اپنے ساتھ ملالیا۔

مسلمانوں کو مدینہ پہنچے بمشکل ایک ہی سال گذرا تھا، کہ انھیں قریش کے معاندانہ ارادے کا علم ہوگیا، انھیں یہ بھی اطلاع ملی کہ رؤسائے مکہ اس تجارتی قافلہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ جو جناب ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے اسلحہ خریدنے گیا ہوا ہے تاکہ نئے اسلحہ سے مسلح ہوکر مدینہ پر حملہ کیا۔

حق و باطل کا یہ معرکہ اس بات کا فیصلہ کرنے والا تھا۔ کہ بنی نوعِ انسان کی تقدیر ایک نئی روشنی و مبارک صبح میں ڈھل جائے گی، اور دنیا میں توحید، وحدت و احترام انسان اور عروج و ارتقاء کا

ایک انقلابی دور شروع ہوگا، یا دنیا کفر و باطل کی کامیابی کی صورت میں فسق و فجور، توہمات، لادینیت، جبر و استبداد، قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، جور و ستم اور رنگ و نسل کے امتیازات کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا منشاء اب یہ تھا کہ حق و باطل میں امتیاز کر دے، اس مٹھی بھر جماعت کو کفر کے کثیر لشکر سے ٹکرا دے اور باطل کی قوتوں کو تہس نہس کر دے، چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کے اس قلیل لتعداد گروہ کو بلایا۔ ان کے سامنے تمام صورت حالات پیش کرکے مشورہ طلب کیا، مہاجرین نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے پر اپنی جانیں پیش کر دیں کہ ہم آپ کے ہر حکم پر دل و جان سے حاضر ہیں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی رائے کے منتظر تھے، اس لیے دوبارہ دریافت کیا تو آں حضرت صلعم کا منشاء بھانپ کر جاں نثار انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کی

"ہم تو ہر حالت میں حضور کے ساتھ ہیں، کسی سے معاہدہ کیجئے، کسی سے معاہدہ کو نامنظور کیجئے، ہمارے زر و مال سے جس قدر منشاء مبارک ہو، لیجئے، ہم کو جو مرضیٔ مبارک ہو عطا کیجئے، مال کا جو حصہ حضورؐ ہم سے لیں گے، ہمیں وہ اس مال سے زیادہ پسند ہوگا، جو حضورؐ ہمارے پاس چھوڑ دیں گے، ہم کو جو حکم حضورؐ دیں گے، ہم اس کی تعمیل کریں گے، اگر حضورؐ مکہ سے بھی آگے جانے کو کہیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے۔ اگر حضورؐ ہمیں سمندر میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم حضورؐ کے ساتھ وہاں بھی چلیں گے، یا رسول اللہ! ہم وہ نہیں ہیں کہ موسیٰؑ کی قوم کی طرح کہہ دیں۔

اِذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (جا تو اور تیرا رب لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں) ہم تو حضورؐ کے دائیں بائیں آگے پیچھے لڑنے کے لئے حاضر ہیں"۔

یہ تھے مہاجرین و انصار، سرکارِ دو عالم کے تربیت یافتہ، اہل ایمان، امتِ مسلمہ کے وہ مٹھی بھر افراد خلیل کا ثمر، محبتِ خدا اور رسولؐ سے سرشار، جان، مال، اہل و عیال سے بے نیاز، مٹھی بھر اہلِ توحید

سا گروہ مگر کفر و باطل کی تمام قوتوں سے ٹکرانے پر مہیا و آمادہ، اور جب تمام افرادی قوت کا جائزہ لیا گیا، تو چھوٹے بڑے، جوان بوڑھے، طاقت ور اور ناتوان، کل تین سو تیرہ افراد نکلے، جن کے پاس صرف دو گھوڑے، آٹھ تلواریں، اور ستر اونٹ تھے، جن کے ہتھیار فرسودہ اور ناکافی تھے، اور مقابلہ پر پرستارانِ باطل اپنے تہرمانی جوش و تکبر کے ساتھ بھرے ہوئے موجود تھے جن کے کان میں ابلیسِ لعین نے لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ کا فسوں پھونکا کہ آج تمہاری قوت کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکے گا، مگر اس امتِ مسلمہ کے دل جوشِ شہادت سے سرشار اور ان کے حوصلے اس پیمانِ الٰہی سے بلند تھے کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ

اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہارا ناصر ہوگا اور تمہارے دشمنوں ہی کے قدم اکھڑیں گے۔

مجاہدینِ توحید کا یہ بے سر و سامان گروہ، تائیدِ الٰہی کے بھروسے پر مکہ کے ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل، پوری طرح مسلح لشکر کو روکنے کے لئے مدینہ کے جنوب میں بدر کے مقام پر پہنچا، نصرتِ الٰہی نے قدم لئے، بارش ہوئی، پانی کی قلت جاتی رہی، کسل و جبن دور ہوگیا، ریتلی زمین سخت ہوگئی، چلنا پھرنا آسان ہوگیا اور اہلِ ایمان رات بھر گہری پرسکون نیند سوتے۔

لیکن میرِ سپاہ، سالارِ لشکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند کہاں آتی تھی۔ اس جنگ میں کامیابی ہی پہ مستقبل میں حق کا بول بالا وابستہ تھا، آپ نے اپنی چودہ سال کی تبلیغی مساعی کا تمام اثاثہ اور ماحصل، اہلِ ایمان کا یہ مختصر سا گروہ، آتشِ جنگ میں جھونکنے کے لئے لا کھڑا کیا تھا اپنی کوتاہی و کمزوری کے مقابل اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور استغنا پر بھی نظر تھی، سجدہ میں سر رکھا، آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور آپ بے چین ہو کر پکار اٹھے:۔

"اے مولا! اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہوگئی تو پھر قیامت تک تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا"

ان انصار و مہاجرین کا کیا ہی بلند اور منفرد مقام ہے، اور کیوں نہ ہو، اس پودے کی آبیاری تو عالمِ انسانیت کے عظیم ترین باغبان نے کی تھی، دعا کے بعد حضورؐ میدانِ جنگ کی

طرف متوجہ ہوئے۔ مٹھی بھر کنکرے کر کفار کی طرف پھینکے، اور بلند آواز سے جاں نثاروں کو یہ بشارت سُنائی۔ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ - دشمن کی جمعیت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گی۔"

بدر کے میدان میں اللہ تعالیٰ نے اس کمزور و ناتواں امتِ مسلمہ کی مدد کی، ان کی تائید کے لئے فرشتے نازل کئے، دشمن کے ستر سردار و جوان قتل ہوئے اور اسی قدر گرفتار ہوئے اور تاریخِ عالم میں اس دَور کا آغاز ہوا جس کے لئے ابتدائے آفرینش سے لاکھوں اہل اللہ اور اہلِ ایمان دعائیں مانگتے، جہاد کرتے اور قربانی دیتے آئے تھے۔

حیرت اندر حیرت | اس جنگ کا ایک ایمان آزما پہلو یہ بھی تھا، کہ اس جنگ میں بھائی کے خلاف بھائی، باپ کے خلاف بیٹا، ماموں کے خلاف بھانجا، چچا کے خلاف بھتیجا، دوست کے خلاف دوست صف آرا تھا، اور یہ وہ لوگ تھے کہ اگر بزرگوں نے خُردوں کو آغوشِ محبت میں پالا تھا تو خُرد بھی بزرگوں کی شفقت و احسان کے زیرِ بار تھے پھر عرب کے قبائلی نظام میں قبیلے کا ایک ایک فرد دُرِّ ناب شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن یہی رشتہ اب ایک دوسرے کے خلاف شمشیر بکف ہوگیا، اور یہ مہاجرین کی جرأتِ ایمانی تھی۔ جس نے انھیں خدا اور اُس کے رسول کے دشمن عزیز و اقارب کی گردنیں کاٹنے پر آمادہ کر دیا اور ان کے اس جذبِ ایمانی کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے بالفاظ ذیل دی:-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوٓا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خٰلِدِينَ فِيهَا رَضِيَ اللّٰهُ

" تو اُن لوگوں کو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں ایسا نہیں پائے گا۔ کہ وہ اُس شخص سے دوستی رکھیں، جو اللہ اور اُس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے، گو وہ ان کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے کنبے کے لوگ، ان ہی کے دلوں کے اندر اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور

عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (مجادلہ)

اپنی روح سے ان کی مدد کی ہے، اور وہ انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ انہی میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں، یہ اللہ کی جماعت ہے۔ سنو اللہ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

اے امتِ مسلمہ کے گلہائے سرسبد! خدا اور رسولؐ کے دشمن رشتہ داروں سے تمھارا جہاد مبارک ہوا، تمھارے سینوں میں ایمان کندہ کر دیا گیا، اور اسے تمھارے سینوں کی زینت بنا دیا گیا، حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ اور کفر و عصیاں سے تمھیں نفرت و حقارت ہو گئی وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ۔ اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں تم أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (الحجرات) کے الفاظ میں رشد و ہدایت کے چراغ ہو، پس اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے تمھاری نصرت کی، تم پر جنت کے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے جس میں تم ہمیشہ رہو گے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کی مہر تمھارے نامۂ اعمال پر ثبت کر دی، اور تم نے بھی سب کی طرف سے منہ موڑ کر رضائے الٰہی کو اپنا قبلہ مقصود قرار دے لیا، تم اللہ کی جماعت ہو، جس نے دنیا کے ہر میدان میں کامیابیاں حاصل کیں، تم نے قیصر و کسریٰ کے استبداد کی گردن توڑی اور مقہور و مظلوم غلام قوموں کو نجات دلائی، تمھاری سنت پر چلنے والے اہلِ ایمان ہمیشہ غلبہ حاصل کریں گے اور تمھارے بدخواہ ہمیشہ نامراد، روسیاہ اور خائب و خاسر ہے اور رہیں گے، صدق اللہ مولانا العظیم۔ باقی

گزارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو، اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی علمی اور ثقافتی حیثیت تاریخ کی روشنی میں

جناب ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب۔ لکچرار۔ شعبۂ فارسی۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ۔ یو پی۔

ہمارے ملک کی سرزمین کئی سو سال سے فارسی زبان اور ادبیات کا گہوارہ رہی ہے۔ لہذا فارسی زبان و ادب کی تاریخ کے مطالعہ کے وقت برِ صغیر ہند کی علمی اور تہذیبی کوششوں اور اس کے اہم رول سے انکار یا صرفِ نظر ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے نتیجہ میں نہ صرف ایرانی زبان اور ادبیات کا ایک بالکل جداگانہ، مستقل اور آزاد باب جس کو ہم ہندوستانی فارسی ادبیات کا باب کہہ سکتے ہیں ـــــ وجود میں آیا ہے بلکہ اس نے تہذیبی سطح پر ایسے لافانی اثرات اور نشانیاں چھوڑی ہیں جو ہند ایرانی تہذیب کا سرمایہ کہی جا سکتی ہیں۔ فارسی آج بھی مختلف حیثیتوں سے ہماری تہذیب کے رگ و ریشہ میں پیوست ہے اور ہمارے کلچر کا کم و بیش ہر گوشہ اس کی فعالیت سے متاثر ہے عام درسیات، علم و فضل، شعر و ادب، اور دوسری علمی و ادبی تخلیقات کا وسیلہ ہونے کے علاوہ فارسی زبان کے اثرات اور نقوش بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کی سیاسی و ملکی، معاشرتی، مذہبی اور

ثقافتی تاریخ کے اوراق پر بہت نمایاں طور سے مرتسم نظر آتے ہیں۔ عہد غزنوی سے لے کر تیموری حکومت کے زوال کے دور تک تاریخ عالم اور تاریخ ہند کا کم و بیش سارا سرمایہ اسی زبان میں قلمبند ہوا ہے خالص علمی یا ادبی کارناموں کے علاوہ مختلف قسم کے افکار و خیالات، معتقدات، نظریات، روایات اور داستانیں جو ہندوستان کے تہذیبی اور فکری دھاروں میں سمو دینے کا کام بھی اسی زبان کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر متاخرین کے عہد تک شعراء فارسی کے بے شمار دواوین اور دوسرے قسم کے شعری و ادبی آثار کے علاوہ مختلف موضوعات پر اور مختلف علوم سے متعلق فارسی میں لکھی ہوئی کتابیں اتنی کثرت سے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ علوم و ادبیات کا کس قدر ضخیم اور قیمتی سرمایہ ہمارے ملک کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کے طور پر موجود و باقی ہے۔ اس کا ثبوت ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بکھرے ہوئے علمی ذخیروں کی وہ مشروح یا غیر مشروح فہرستیں اور دوسرے مآخذ ہیں جن میں ان علمی آثار کا ذکر ثبت ہے۔ خوش قسمتی سے اس بیش بہا سرمایہ کا بیشتر حصہ مخطوطات یا مطبوعات کی شکل میں محفوظ ہے اور اس کی تحقیقاتی تدوین و ترتیب سے ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کے بہت سے مسائل پر روشنی پڑ سکتی ہے اور نئی تعبیریں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان کے طول و عرض میں قلعوں، محلات شاہی، مساجد، خانقاہوں، مناروں

---

[1] مشہور مستشرق (آن جہانی) سی۔ اے۔ اسٹوری (C.A.Storey) کا لافانی کارنامہ Persian Literature اس سلسلہ میں سرفہرست قرار دیا جا سکتا ہے جس میں مصنف نے بڑی تلاش اور تحقیق کے ساتھ حتی المقدور تمام علمی ذخیروں کے مخطوطات کے بارہ میں بیش قیمت اور اہم اطلاعات یکجا کر کے فارسی علم و ادب کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہونِ منت بنا لیا ہے بدقسمتی سے یہ فہرست علوم کے تمام شعبوں پر محتوی نہیں، جو موضوعات شامل ہو سکے ہیں وہ قرآنی ادب، سیرت، تاریخ، علوم اور چند دوسرے موضوعات ہیں۔ فارسی زبان و ادب کے ہر اس طالب علم کے لئے جو ان عنوانات میں سے کسی ایک کو اپنی تحقیق کا موضوع قرار دے، اس وقیع مآخذ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اور دوسری تاریخی عمارتوں پر جا بجا فارسی میں کھدے ہوئے کتبات، نقوش اور طغرے اس زبان کی وسیع و عریض فرمانروائی کا کھلا ہوا ثبوت ہیں[1]۔ بقول پروفیسر نذیر احمد "اگر کوئی شخص نیشنل آرکائوز میں جا کر بچشم خود ملاحظہ کرے تو اس کو اس زبان کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ ہوگا۔ سیاسی اثرات کی شکل یہ ہے کہ سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے سارے کاروبار اسی زبان کے توسط سے عمل میں آتے تھے۔ سرکاری فرامین، دستاویزات اور دوسرے اہم کاغذات فارسی میں لکھے جاتے تھے"[2]

اُردو زبان کی ابتدا اور تدریجی ارتقا میں مقامی حالات، مختلف بولیوں اور ہندوستان کے مخصوص تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی ماحول کے علاوہ فارسی زبان اور اس کے ادب نے جو خصوصی اور اہم رول ادا کیا ہے، اس کا بیّن ثبوت خود اردو زبان اور اس کی زندہ تاریخ ہے اور اس روشن حقیقت سے ہر صاحبِ نظر شخص بخوبی واقف ہے۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، سندھی، کشمیری، گجراتی، مرہٹی[3]، ہندی، بنگالی، تامل، تلیگو، ملایالم وغیرہ کے افکار اور ادبِ عالیہ کا اگر بہ نظر تلاش و تحقیق مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں فارسی کے نفوذ و تاثیر کی کارفرمائی ملے گی۔[4]

برصغیر ہندوستان اس زبان اور اس کے ادب کی ترقی و فروغ میں سیاسی اور ملکی حالات کو بڑا دخل رہا اس اجمال کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اشاعتِ اسلام

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "نقش پارسی بر احجار ہند"، از علی اصغر حکمت۔

[2] تاریخی و ادبی مطالعے۔ ص ۳۵۔

[3] ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق دہلوی کی کتاب "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر" جس میں تفصیل کے ساتھ ان اثرات سے بحث کی گئی ہے جن کا آغاز مہاراشٹر میں کم و بیش تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی اس علاقہ میں آمد کے ساتھ ہوا اور جو آگے چل کر تدریجاً زیادہ نمایاں اور گہرے ہوتے چلے گئے۔

[4] پروفیسر نذیر احمد نے اپنے مضمون Influence of Persian on Indian Languages میں مختلف ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادبیات پر فارسی کے اثرات کا بہت تحقیقی جائزہ لیا ہے (ملاحظہ ہو مجلہ ہند و ایران، شمارہ اول، جلد ۴، اپریل ۱۹۷۲ء)

سے قبل ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات سیاسی اور خاص طور سے تہذیبی، لسانی، علمی اور ادبی سطح پر بہت استوار تھے اور آریائی نسل کی یگانگت نے ان دونوں ملکوں کو قدیم زمانہ سے ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا تھا۔ مختلف ذرایع سے اور متعدد شواہد کی روشنی میں ان باہمی روابط کے وجود اور ان کی قدامت کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ بہت پہلے ایرانی یا زردشتی تہذیب کی روایات ہمارے ملک میں داخل ہوچکی تھیں اس کے علاوہ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کے اواسط میں عربوں کے حملہ اور فتح ایران کے بعد زردشتی عقاید کے ماننے والے پارسیوں کی کچھ تعداد نے (غالباً) اس حملہ کے اثرات سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے ہندوستان کا رُخ کیا[1]۔ اور مغربی اور جنوب مغربی علاقوں یعنی سندھ، گجرات اور موجودہ مہاراشٹر کے مختلف حصوں میں منتشر ہوگئے اور آخر کار وہیں بس گئے۔ اس خیال کی تصدیق پروفیسر عباس مہرین شوشتری کے بیان سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " دراٰن گیرودار برخی از مردم فارس بہ مکران وسیستان ہجرت کردند و اندکی بہ فیرنگ پسر یزدگرد کہ بہ چین پناہندہ شدہ بود، پیوستند و تخمیناً ہفت صد تن خود را بہ کاتیاوار (ہند) رساندند...... برخی از راہِ دریا بہ ساحل جنوب مغرب ہند ہجرت کرد[2]"۔

اس طرح ہندوستان میں ایرانی نژاد لوگوں کے ورود اور دونوں ملکوں کے درمیان زمانہ سابق کے مقابلہ میں زیادہ جدید اور وسیع انداز پر ثقافتی رابطہ کا ثبوت تو فراہم ہوجاتا

---

[1] ایران پر مسلمانوں کے حملہ کے اثرات تخریبی نہ تھے بلکہ خالصۃً تعمیری تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام جس سرزمین میں پہنچا ابر رحمت بن کر برسا۔ اس کا نظام حیات جس کی بنیادیں انسان دوستی، عام رواداری، امن واماں، اور تمام نوع انسان کو ایک رشتہ مساوات میں پرونے کے زرّیں اصول پر قایم ہیں، ایرانی عوام کے لئے جو صدیوں سے ساسانی استعماریت اور ظلم وتشدد کے بوجھ کے تلے دبے ہوئے تھے، پیغام رحمت ثابت ہوا نہ کہ بربادی کا پروانہ۔ کسی تاریخی مآخذ سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ ایرانی عوام کی اکثریت عربوں کے حملہ سے خائف ہوکر جان ومال کی حفاظت کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہوئی ہو۔ ایک ناقابل لحاظ اقلیت کے ترک وطن کے عمل کو اکثریت کے عمل پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

[2] " علایق فرہنگی آریائی ہند وایران " مجلہ آئینہ ہند، سال نہم، شمارہ پنجم، مہر وآبان، ۱۳۵۱، ص ۵

ہے لیکن ہندوستان میں فارسی دری[1] (جو زیر نظر سطور میں ہمارا موضوع سخن ہے) کی ترویج و فروغ کے امکانات اور مواقع گیارہویں صدی سے پہلے وجود میں نہیں آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ فارسی کی نشر و اشاعت میں سلاطین غزنہ کی کوششوں کو دخل تھا جن کے سیاسی مقاصد نے اس زبان کا نقش اولین اس ملک میں قایم کیا۔ محمود غزنوی کی شخصیت بڑی متنوع تھی۔ باذوق اور صاحب کمالات ہونے کے ساتھ وہ بیک وقت سیف و قلم کا دلدادہ تھا۔ اس کے ہم سفر نہ صرف جنگجو اور شمشیر زن سپاہی ہوتے تھے بلکہ علم و ادب، شعر و فن اور اکتسابات سے بہرہ ور علما، خطیبوں، واعظوں اور ارباب کمال حضرات کی تعداد بھی خاص ہوا کرتی تھی اور مقبوضہ علاقوں کے نظم و نسق اور امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلہ میں ان کے انشا و تحریر اور قلم و بیان کی ضرورت ناگزیر طور پر رہا کرتی تھی۔ محمود کے دربار کا جلیل القدر اور باکمال عالم، منجم، فلسفی، ریاضی دان اور مورخ ابوریحان البیرونی خوارزمی (۳۶۲ - ۴۴۰ھ) جو اس کے خاص مصاحبین میں سے تھا، ہندوستانی معرکوں میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ بیرونی نے متعدد تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ خیال ہے کہ وہ سنسکرت کا بھی عالم تھا اور ریاضی کے موضوع پر لکھی ہوئی کتاب سدھانت (Siddhanta) کے کچھ اجزا اور چھٹی صدی عیسوی کے مشہور ہندوستانی ریاضی دان عالم وراہا مہیرا (Varahamihira) کی ایک تصنیف کا ترجمہ اس نے عربی میں کیا تھا[2]۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اس نے ہندوستانی علوم، تاریخ، جغرافیہ، مذہب اور معاشرت، معتقدات اور سماجی حالات کا گہرا مطالعہ

---

[1] فارسی دری سے مراد وہ کلاسیکی فارسی ہے جو دراصل پہلوی زبان (فارسی میانہ) کی ترقی یافتہ شکل ہے اور جو ایران پر عربوں کے حملہ اور تسلط کے کم و بیش دو سو سال بعد مختلف لسانی صرفی اور نحوی تغیرات سے گذر کر ایک نئے قالب میں نمودار ہوئی اور اس نام سے موسوم ہوئی یہ وہی فارسی ہے جو ہم عام طور سے لکھتے پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ زبان و ادب کی تاریخ کی ایک اصطلاح کے مطابق یہ فارسی جدید بھی کہلاتی ہے لیکن یہ فارسی جدید، اس موجودہ اور عصری زبان سے بہت مختلف ہے جو آج ایران میں رائج ہے اور جس کو ہم دونوں کا فرق واضح کرنے کے لئے ——— جدیدترین فارسی کا نام دے سکتے ہیں۔

[2] دکتر ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران، ج ۱، ص ۲۰۲۔

کیا تھا اور یہاں کے دانشمندوں اور علماء کی صحبتوں میں شریک رہا تھا۔ غالباً ہندوستانی تمدن و تہذیب سے اسی شناسائی کی بنیاد پر اس نے ایک اہم اور مشہور تصنیف بنام "تحقیق ماللہند" (عربی) جس کا عام فہم نام کتاب الہند ہے، مرتب کی تھی جو ایک وقیع علمی کارنامہ ہے اور ہندوستان کے بارہ میں اطلاعات کا ایک بیش بہا مخزن اور مآخذ۔ اس کتاب میں ہندوؤں کے رسم و رواج۔ مذہبی عقاید و خیالات، فلسفہ و حکمت، رہن سہن اور دوسرے تاریخی اور اجتماعی مسائل[1] پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ملک الشعرا عنصری اور فرخی سیستانی جیسے شاعروں کو بھی ہم سفر اور ہم رکاب ہونے کا فخر حاصل رہا۔ محمود کو مخاطب کرتے ہوئے فرخی کہتا ہے:

بار باتو بدریائی بیکرانہ شدم   نہ موج دیدم و نہ (نی) ہیبت نہ شکوہ نہ شر
یا: ز آنکہ مرا رنج و خستگی رہ قنوج   کوفتہ کردہ است دخیرہ مغز و سبکسار

عنصری کے قصیدوں میں ہندوستان کے واقعات اور معرکوں کے بارہ میں اہم تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ فرخی نے بھی اپنے کلام میں ہندوستان کی فتوحات، مقامات اور واقعات وغیرہ کے بارہ میں شہادتیں پیش کی ہیں[2] جو تاریخ اور ادب دونوں کے لحاظ سے بڑی اہمیت اور دلچسپی رکھتی ہیں۔

بعد میں لاہور جو نئے مقبوضات کا مستقر تھا، مرکزِ علم و فن بھی قرار پایا۔ علم دوست اور معارف پرور حکمرانوں، شہزادوں اور امرا کی ادب نوازیوں کے سایہ عاطفت میں نئی زبان

---

[1] ان موضوعات پر مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو "سرزمین ہند" (فارسی) از علی اصغر حکمت
[2] سومنات کے سفر اور فتح کے بیان میں اس نے ایک قصیدہ موزوں کیا تھا جس کا مشہور مطلع یہ ہے: فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر + سخن نو آر کہ نو را حلاوتی ست دگر۔ دیوان حکیم فرخی مروزی (تصحیم طاہری شہاب، انتشارات ابن سینا، ص ۱۲) میں لکھا ہے کہ "ظاہراً در ین سفر (سومنات) کہ از دہم شعبان ۴۱۶ تا دہم صفر ۴۱۷ طول کشید ...... یگانہ شاعری کہ باری (محمود) بہ سومنات رفتہ است۔ فرخی است"

اور اس کے ادب کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ غزنوی اور غوری سرداروں نے نہ صرف فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت دے رکھی تھی بلکہ وہ علوم اور ادبیات کی سرپرستی اور ترویج کی روایت بھی اپنے ساتھ لے کر آتے تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی اور ملکی مصالح اور ضروریات کے تحت بھی اس زبان کا ترقی پذیر ہونا ناگزیر تھا، اسی بناء پر مسلم اقتدار کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ شمالی مغربی علاقوں میں اور پھر تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی سلطنت کے قیام کے دوش بدوش فارسی کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو گئی اور جا بجا علم و ادب، درس و تدریس اور علوم و فنون کے مراکز قایم ہونا شروع ہو گئے تحقیق کی روشنی میں ہمارے سامنے متعدد ایسے علماء و فضلاء، ادیبوں، شاعروں اور اہلِ قلم حضرات کے نام آتے ہیں جن میں سے اکثر کے کارنامے آج بھی محفوظ ہیں اور جن کے وسیلہ سے تاریخی تسلسل کی رعایت کو قایم رکھتے ہوئے ہندوستان کی مربوط اور تا حال قایم شدہ فکری اور ثقافتی تاریخ کی تدوین میں بڑی مدد ملتی ہے۔

کسی زبان کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ اس کی ادبی، درسی اور علمی حیثیت کے علاوہ عام مقبولیت کے لحاظ سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اگر ایک طرف سیاسی ضرورت کے تحت فارسی کو ایک مدت دراز سے مسلم حکمرانوں کے عہد اقتدار میں سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا تھا تو دوسری جانب خالص عوامی اور معاشرتی سطح پر بھی اس کے جاننے، لکھنے پڑھنے اور سمجھنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے آج بھی جب کہ بادی النظر میں اس کے بازار میں بے رونقی کا سکہ چل رہا ہے اور وہ اپنا گذشتہ وقار کھو بیٹھی ہے، ع "آثار پدید است صنادید عجم را" کے مصداق اس کی عظمت کے آثار اور نشانات کی تلاش ناممکن نہیں۔ یہ زبان اُردو ادب کے متعدد ممتاز ترین ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا طرۂ امتیاز اور خیالات کے اظہار کا وسیلہ بھی رہی ہے یہاں تک کہ چند عظیم المرتبت شاعروں نے اپنے کلام کو فارسی سے مزین اور آراستہ کرنے میں فخر محسوس کیا ہے۔ غالب زندگی بھر اپنے

فارسی کلام ہی کو سرمایۂ حیات سمجھتے اور اس پر فخر کرتے رہے۔ شاعر مشرق اقبال کے افکار و نظریات کی شرح و بسط میں فارسی نے جو کردار ادا کیا ہے اس سے ہر باعلم شخص بخوبی آگاہ ہے اس کے علاوہ آج بھی ایسے موزوں طبع افراد مل جائیں گے جو اس زبان میں سخنوری کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک بیرونی زبان کی حیثیت سے داخل ہونے کے باوجود اپنی شیرینی، تروتازگی، دل کشی اور ہمہ گیری کی صفات کی بنا پر بہت جلد اس زبان نے ایک تہذیبی اور علمی درجہ حاصل کرلیا اور نہ صرف یہاں کے ثقافتی سرچشموں سے کسب فیض کیا بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اپنے فکری، علمی اور ادبی سرمایہ کو بہ حیثیت مجموعی ہندوستانی ثقافت کے مخزن میں ایک بیش قیمت اضافہ کی شکل میں جذب کرنا شروع کیا۔

مختلف جماعتوں، فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کی تہذیبی اور مذہبی زندگی میں فارسی ادب کے وسیلہ سے ایسے خیالات اور نظریات کی درآمد ہوئی جنھوں نے فکری اعتبار سے ہند اور ایران کو ایک کر دیا۔ تصوف کے افکار و نظریات کسی نہ کسی شکل میں فارسی ادب ہی کے ذریعہ سے یہاں زیادہ واضح صورت میں جڑ پکڑ گئے اور ویدانت کے فلسفہ نے ایک نیا روپ دھارا۔ مثال کے طور پر گرونانک اور دوسرے پیشواؤں کی تعلیمات میں وحدت ذات اور عرفان کا فلسفہ اسی دھارے کے وسیلہ سے گھل مل گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کے عناصر کی آمیزش وجود میں آئی۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس زبان نے غیر مذاہب کے لوگوں کو بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں (غالباً) پہلی بار لودی عہد میں ہندوؤں نے نہ صرف اس زبان کو پڑھنا لکھنا سیکھا بلکہ اس کے ادب کی سرزمین میں اپنے جوہر اور کمالات دکھلاتے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہندوستان میں فارسی زبان اور علوم کی روایت اور اس کا نقش اولیں امرائے غزنوی کی علم دوستی، سیاسی مصالح اور ادب نوازی کا نتیجہ تھا اور اس حیثیت سے

وہ بانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہندوستانی فارسی کے اولین معمار انھیں کے عہد میں نہ صرف زندہ تھے بلکہ ان کے خوانِ کرم کے خوشہ چین بھی تھے۔ تذکرہ لباب الالباب کے مصنف سدید الدین محمد عوفی نے ان ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں سے متعدد کے اشعار غزنوی سرداروں کی مدح میں ہیں۔ اس سلسلہ میں ابو عبداللہ النکتی، ابوالفرج رونی[1] اور مسعود سعد سلمان[2] کے نام سرِ فہرست ہیں اور قابلِ ذکر۔ اس کے علاوہ تصوف کے موضوع پر فارسی میں پہلی کتاب کشف المحجوب غالباً ہندوستان ہی میں غزنویوں کے زمانۂ حکمرانی میں لاہور میں لکھی گئی۔ اس اہم کتاب کے مصنف شیخ ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی الهجویری (متوفی ۱۰۷۲ء) ملقب بہ داتا گنج بخش اگرچہ غزنین میں پیدا ہوئے تھے لیکن اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے لاہور میں گذارا جہاں ان کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ہندوستان میں مسلمان فاتحین کی آمد کے بعد گویا تمدنِ اسلامی اور فارسی زبان و علوم کی درآمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذیل میں فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کے امکانات اور حالات سازگار ہوتے۔ جا بجا مدرسے، کتاب خانے اور مراکزِ علم کھلنے لگے اور علم و ادب کا پرچار وسیع پیمانہ پر شروع ہو گیا۔ جب محمود غزنوی کے ورثاء نے بجائے غزنہ لاہور کو اپنا مرکزی مقام بنایا[3] تو علم و ادب کی روایات بھی وہیں منتقل ہو گئیں اور

---

[1] چند سال پہلے شایع ہونے والی فارسی ادبیات کی تاریخ History of Persian Literature (مؤلفہ Jan Rypka) میں جان ریپکا نے ابوالفرج کے بارہ میں لکھا ہے کہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نیشاپور کے پاس ایک مقام رونہ میں پیدا ہوا تھا یا لاہور کے قریب ایک گاؤں رونہ میں۔ پروفیسر اقبال حسین نے اپنی کتاب Early Persian Poets of India میں لکھا ہے کہ وہ لاہور کے پاس پیدا ہوا تھا۔ یہی بات عوفی نے لباب الالباب میں لکھی ہے۔ متقدم الذکر کتاب میں Jan Rypka نے لکھا ہے کہ وہ خود لاہور میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کے خاندان والے نیشاپور کے پاس ایک مقام رونہ کے رہنے والے تھے۔ [2] یہ خوش اعتقادی کہ وہ ہندی کا بھی شاعر تھا۔ غالباً صحیح نہیں۔ یہ بیان خصوصاً دیباچۂ کلام میں ملتا ہے بہرحال ہندی یا ہندوستانی ہونے کے سبب سے اس نے دوسری نظموں کے علاوہ ہندوستان کے موسم برسات پر بعنوان برشکال ایک دلکش نظم لکھی ہے۔ [3] محمود کے بعد اس کے ورثاء میں سے کوئی اتنی اہلیت نہیں رکھتا تھا کہ اس کی قائم کردہ وسیع سلطنت کو برقرار رکھتا۔ غوریوں اور پھر سلجوقی اور خوارزمیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ حکومتِ غزنہ سے دست بردار ہو جائیں اور ہندوستانی مقبوضات ہی پر اکتفا کریں۔

لاہور" غزنین خورد" کہلانے لگا۔ ١١٨٦ء میں آخری غزنوی حکمران خسرو ملک کی شکست کے بعد غوریوں کا اقتدار ان علاقوں میں مسلّم ہوگیا اور مرکز حکومت لاہور سے ملتان اور اُچّہ اور پھر بعد میں دہلی منتقل ہوگیا۔ غوری سردار بھی بڑے علم پرور تھے۔ حسن نظامی نیشاپوری[1] (مصنف تاج المآثر) کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں متعدد مدرسے قایم کئے تھے[2] جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے پہلے مدرسے تھے۔ اس کے علاوہ ناصر الدین قباچہ، التمش اور بعد کے اکثر و بیشتر مسلم فرمانرواؤں نے اپنے اپنے دائرۂ عمل میں درسی و علمی اداروں کے قیام کے سلسلہ میں اقدامات کئے اور یہ روایت تیموریوں (مغلوں) کے عہد تک قایم رہی۔

غوریوں کے نائبین سلطنت قطب الدین ایبک اور ناصر الدین قباچہ نے علماء و فضلاء کی تربیت و نوازش میں نمایاں حصہ لیا[3]۔ محمد بن منصور المعروف بہ فخر مدبر نے اپنی تصانیف شجرۂ انساب اور آداب الحرب والشجاعت بالترتیب قطب الدین ایبک اور التمش کے نام معنون کی تھیں[4]۔ بدایونی نے منتخب التواریخ (ج ١، ص ٥٥) میں لکھا ہے کہ ایبک جود و کرم میں ضرب المثل تھا اور لاکھ روپیہ بطور انعام دینے کی رسم اسی نے جاری کی تھی۔

---

[1] ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ بسطام کا رہنے والا تھا لیکن اسٹوری (Persian lit. Sec II. Fasc. - s.p. 493) نے لکھا ہے کہ اس کا وطن نیشاپور تھا۔

[2] ملاحظہ ہو۔ Glimpses of Medieval Indian Culture

[3] عوفی نے ایبک کی علم دوستی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے جود و کرم سے فیض یاب ہونے والے ادیبوں اور شاعروں میں جمال الدین محمد بن ناصر علوی، قاضی حمید الدین اور بہاؤ الدین اوشی جیسی ممتاز شخصیتوں کا نام لیا ہے۔ بہاؤ الدین اوشی کا ذکر بدایونی نے بھی منتخب التواریخ (ج ١، ص ٥٥) میں کیا ہے اور ایبک کی مدح میں کہے ہوئے اس کے دو مندرجہ ذیل اشعار نقل کئے ہیں۔

اے بخشش لک تو در جہان آوردہ ‌ ‌ ‌ کان را کف تو کار بجان آوردہ

از رشک کف تو خون گرفتہ دل کان ‌ ‌ ‌ وز لعل بہانہ درمیان آوردہ

[4] ملاحظہ ہو ڈاکٹر ممتاز علی خان کی کتاب Some Important Persian prose writings of the Thirteenth Century A.D. in India

تیرھویں صدی عیسوی کی چند دوسری اہم فارسی کتابوں میں جو ہندوستان میں تصنیف یا ترجمہ ہوئیں حسن نظامی نیشاپوری کی تاریخ موسوم بہ تاج المآثر[1]۔ محمد علی بن حامد بن ابی بکر کوفی کی تاریخ کا عربی سے فارسی میں ترجمہ بنام چچ نامہ (یا فتحنامہ سندھ یا تاریخ ہند و سند) موید بن محمد جاجرمی کے قلم سے امام غزالی کی مشہور عربی تصنیف احیاء العلوم الدین اور ابوبکر کاسانی کے قلم سے بیرونی کی کتاب صیدنہ (موضوع طب یا دارو شناسی) کا ترجمہ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں[2]۔ اسی عہد میں (۶۲۳ھ سے قبل اور التمش کے دور کے ذرا بعد) شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور تصنیف عوارف المعارف کا ترجمہ فارسی میں قاسم داؤد نے ملتان میں کیا اور اسے تاج الدین ابوبکر نامی ایک سردار کے نام معنون کیا جو کچھ مدت کے لئے اس علاقہ میں بادشاہ ہو گیا تھا

اس عہد کی ممتاز ترین شخصیتوں میں سدید الدین محمد عوفی کا شمار ہوتا ہے۔ عوفی کے بارہ میں (مرحوم) شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ وہ واعظ خطیب اور ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا اور یہ کہ دربار قباچہ کے علم پرور اور ادب نواز ماحول میں اس نے الفرج بعد الشدۃ کا فارسی میں ترجمہ کیا[3]۔

غوری اور مملوک سلاطین کے وزراء بھی اپنی علم دوستی میں کچھ کم نہ تھے۔ ناصر الدین قباچہ کا وزیر عین الملک اشعری ذاتی طور پر صاحب کمال اور با ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ ارباب علم و فن کی سرپرستی کی صفت میں بھی ممتاز تھا۔ اسی کے سایہ حمایت میں عوفی نے شعراء کا مشہور تذکرہ لباب الالباب پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ عوفی کے متعدد قصاید قباچہ اور عین الملک کی مدح

---

[1] اشوری کا کہنا ہے کہ اس نے یہ کتاب ۶۰۲ھ (مطابق ۱۲۰۵ء) میں لکھنا شروع کی اور اس میں سلطان معز الدین محمد بن سام، قطب الدین ایبک اور التمش کے کارناموں اور ہندوستان کے معرکوں کا ذکر ہے۔ ایبک ہی کے ایماء پر یہ کتاب مرتب ہوئی اور اسی کے نام منسوب ہے۔

[2] یہ تفصیلات بیشتر ڈاکٹر ممتاز علی خان کی مذکرہ بالا کتاب سے جس میں بڑی کاوش کے ساتھ تیرھویں صدی کی چند اہم فارسی تصانیف کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے، ماخوذ ہیں۔ [3] ارمغان پاک، ص ۲۷

میں ملتے ہیں۔ اس کی دوسری تصنیف جوامع الحکایات ولوامع الروایات کا آغاز قباچہ ہی کی خواہش پر ہوا تھا۔ اس مشہور ادیب کو سلطان شمس الدین التتمش کے دانشمند اور علم دوست وزیر قوام الدین نظام الملک محمد جنیدی کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ احیاء العلوم کا ترجمہ (جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے) حقیقتاً اسی وزیر کی خواہش کا نتیجہ تھا غوریوں کے عہد اقتدار میں جس کا اختتام التتمش کے ہاتھوں قباچہ کی شکست پر ہوتا ہے، ہندوستان (خاص طور سے شمالی اور مغربی علاقہ) فارسی زبان اور علوم کا اتنا بڑا گہوارہ نہیں بن سکا تھا جتنا کہ تیرھویں صدی عیسوی میں دہلی سلطنت کے قیام کے دوران اور اس کے بعد ہوا، گویا ایک مرکزی حکومت کے قیام نے علم وادب کی پیشرفت کے لئے بڑے مساعد حالات پیدا کر دئے اور تہذیب وتمدن کی راہیں زیادہ روشن کردیں۔ اس زمانہ میں ایران اور دوسرے بلاد اسلامی پر تاتاری حملہ نے جو قیامت کی تباہی، غارتگری اور قتل وخون کی مصیبت نازل کی، اس کے نتیجہ میں بالعموم ایرانیوں اور خصوصاً خراسانیوں اور ترکوں نے ایک بہت بڑی تعداد میں ہندوستان کو اپنی گریزگاہ اور ملجا وماوی قرار دیا۔ التتمش کے مراحم خسروانہ اور دارالخلافہ دہلی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج جوزجانی لکھتا ہے کہ:

"واین شہر بکثرت انعامات وشمول کرامات آن پادشاہ دیندار محط رجال (رحال؟) آفاق گشت، وہر کہ از حبایل حوادث بلاد عجم ونکبات کفار مغل بفضل ایزدی خلاص یافت، ملاذ وملجا ومہرب درامن حضرت جہان پناہ آن پادشاہ ساخت"[1]

ان شاعروں کے علاوہ جن کا ذکر لباب الالباب میں ملتا ہے، جیسے حمیدالدین مسعود بن سعد شالی کوب[2] (دورۂ اول)، محمد الکاتب البلخی[3] فضلی ملتانی (ص ۴۲۳)

---

[1] طبقات ناصری، عبدالحی حبیبی، کابل اڈیشن، ج ۱، ص ۴۴۱۔

[2] عوفی نے لکھا ہے کہ "از احرار خطہ لوہور بود .... وشعر وی قرین عنصری ورودکی" الخ۔ (لباب، ج ۲، ص ۲۱۱)

[3] عوفی (ایضاً، ص ۴۲۰-۴۲۱) نے لکھا ہے کہ "در شعر عدیل انوری بود" الخ

اور ضیاء الدین سجزی (ص ۶۲۲ھ)[1] اور ناصری، اور امیر روحانی وغیرہ (عہد وحد با التتمش[1])
سلطنتِ دہلی کے اولین اور ممتاز شاعروں میں سراج الدین خراسانی المتخلص بہ سراج
یا سراجی[2] جمال الدین ہانسوی اور تاج الدین ریزہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ان حضرات نے فارسی شعر و ادب کی ترقی کے لئے زمین ہموار کی اور کاروانِ فن و
سخنوری منزلِ ارتقاء کی سمت چل پڑا۔ اس عہد میں عام طور سے صنفِ قصیدہ کا چلن
زیادہ تھا اور شعراء کے کلام کا بیشتر حصہ مدحیہ شاعری پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان سخنوروں کے علاوہ
جن کا ذکر ابھی ہوچکا ہے، اس صدی کے دوسرے شعراء یعنی شہاب مہرہ، عمید سنامی[4]
شمس دبیر وغیرہ کے کلام میں بیشتر یہی رنگ غالب ہے۔

اس روشِ عام سے ہٹ کر ہندوستانی فارسی ادب، علوم اور خاص طور سے
شاعری کو حیاتِ تازہ عطا کرنے والی شخصیت امیر خسرو (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) کی تھی[5]
جنھوں نے اس زمین کو آسمان بنا دیا۔ بقول شیخ محمد اکرام "ہندوستان میں اب شعر و سخن کی
زمین تیار تھی، فقط کسی صاحبِ کمال کا انتظار ہو رہا تھا جو اس زمین کا رتبہ آسمان تک پہنچا
دے۔ وہ کمی امیر خسرو نے پوری کر دی جو اقبال سے پہلے پاکستان و ہند کے سب سے برگزیدہ

---

[1] موخر الذکر تین ناصر الدین قباچہ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔
[2] بدایونی، ج ۱، ص ۶۵۔
[3] شیخ محمد اکرام نے ارمغانِ پاک (ص ۳۹) میں لکھا ہے کہ "بھارت کا سب سے پہلا فارسی شاعر غالباً
تاج الدین ریزہ" تھا لیکن پروفیسر نذیر احمد کی تحقیق کے مطابق دہلی سلطنت کا پہلا بڑا شاعر سراجی
تھا جو تاریخی اعتبار سے شیخ جمال الدین ہانسوی اور تاج ریزہ پر تقدم رکھتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں پروفیسر نذیر احمد
نے سراجی کا مکمل دیوان مع مقدمہ حواشی اور تعلیقات شائع کیا ہے۔
[4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالہ بعنوان "تیرھویں صدی کا ایک اہم شاعر ـــ عمید تولکی سنامی"
از پروفیسر نذیر احمد، فکر و نظر، اکتوبر ۱۹۶۳ء۔
[5] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مضمون "حضرت امیر خسرو دہلوی ـــ افکار و شخصیت" (فکر
و نظر اکتوبر ۱۹۶۹ء) میں اس عظیم فنکار و ادیب کی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔
نیز ملاحظہ ہو۔ امیر خسرو۔ عہد، فن اور شخصیت از عرش ملسیانی۔

شاعر تھے اور جن کا سکہ ماننے والوں میں سعدی اور جامی جیسی مشہور ہستیاں تھیں[۵]۔

کون سا میدانِ ادب و شعر تھا جس کو اس صاحبِ کمال ادیب، انشا پرداز اور شاعر نے تشنہ چھوڑا ہو۔ خارجی شاعری کے علاوہ داخلی اور کیفیاتی شاعری کے لئے انھوں نے غزل اور مثنوی سے کام لیا۔ صاحب ارمغانِ پاک نے جامی کا بیان یوں نقل کیا ہے:

"امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ در شعر ہمتشنا است، قصیدہ و غزل و مثنوی ورانۂ وہمہ بکمال رسانیدہ ...... غزلہای او بواسطہ معنی آشنائی کہ ارباب عشق و محبت بحسب ذوق و وجدان خود آزا در می یابند، مقبول ہمہ کسی افتادہ است۔ خمسۂ نظامی را بہ ازدی کسی در جواب نگفتہ"[۱]۔

دولت شاہ سمرقندی نے تذکرۃ الشعراء (ص ۲۴۰) میں لکھا ہے کہ (تیمور کے پوتے اور شاہرخ کے بیٹے) سلطان سعید بایسنغر نے اپنے ذوقِ ادبی کی بنا پر امیر خسرو کے کلام کی جمع آوری، تدوین اور ترتیب میں بڑا اہتمام کیا تھا، اس کو امیر کی ذات اور کمالات سے اس قدر شغف تھا کہ وہ خواجہ خسرو کے خمسہ کو خمسہ نظامی گنجوی پر ترجیح دیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس الغ بیگ (شاہرخ کا دوسرا بیٹا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا) چونکہ شیخ نظامی کا معتقد تھا لہٰذا خمسہ نظامی کو برتر اور بہتر خیال کرتا تھا اور بایسنغر کی رائے سے متفق نہ تھا۔ متعدد باران دو عالم و فاضل شہزادوں کے درمیان اس اختلاف رائے نے شدت اختیار کی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں خمسوں کے ہر ہر بیت کا باہم موازنہ اور مقابلہ کرنا پڑا[۲]۔

---

[۵] ارمغانِ پاک، ص ۴۲۔

[۱] ارمغانِ پاک، ص ۴۳۔ لیکن اس عبارت کے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ نفحات الانس، مطبوعہ نول کشور میں خسرو یا نظامی گنجوی کے ذکر کے ذیل میں جامی کا یہ بیان نہیں ملتا۔

[۲] اس اقتباس سے نہ صرف خسرو کی عظمتِ سخنوری کا ثبوت فراہم ہوتا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی مترشح ہوتی ہے کہ تیموری شاہزادے علم و ادب کے کس قدر دل دادہ، کتنے باذوق اور معارف پرور تھے اور علم و فن اور شعر و ادب کا کس قدر زبردست شعور ان کو حاصل تھا۔

نکتہ سنجانِ علم و فن اور نقادانِ شعر و سخنوری بہ اتفاقِ رائے ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی گو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی ساحرانہ شخصیت میں مجاز اور معنویت کا حسین سنگم ملتا ہے۔ سلطان المشائخ حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاء کے چہیتے مرید اور ایک صاحبدل صوفی کی حیثیت سے سلوک و طریقت کے مدارج بھی انھوں نے طے کئے تھے[1]۔ فنِ موسیقی میں مہارت، ذوق وجدان اور درکِ معنوی نے ان کی شخصیت کے جمال و کمال کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک نہایت کامیاب ندیم اور درباری بھی تھے محمد قاسم ہندو شاہ استرابادی جوان کو ہندوستان کے مشائخ میں شامل و شمار کرتا ہے لکھتا ہے کہ وہ بانوے (۹۲) کتابوں کے مصنف تھے "....... و برکات آن بجدی ظاہر شد کہ نود و دو کتاب در سلک نظم کشیدہ[2]...."

بقول استوری اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کے آثار کا بیشتر حصہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ بہر نوع اس جامع کمالات ادیب اور شاعر کے علمی اور ادبی کارناموں میں حسب ذیل آثار آج بھی محفوظ ہیں اور ہماری دسترس سے باہر نہیں۔

۱- پانچ دواوین ـ تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال۔

۲- خمسہ نظامی کی تقلید میں پانچ مثنویاں یعنی مطلع الانوار، شیریں و خسرو، مجنون لیلی، آئینہ سکندری اور ہشت بہشت۔

---

[1] جامی نے لکھا ہے کہ اپنے پیر کی خدمت میں انھوں نے روحانی مجاہدے کئے تھے اور شراب معرفت کی لذت اور چاشنی سے بہرہ ور تھے اور اس ذوقِ دردن کا ثبوت ان کے اشعار سے ملتا ہے۔ اسی کیفیت عشق کی بنا پر وجدان و حال کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن ہر شخص کسی نہ کسی چیز پر فخر کرے گا اور مجھے اپنے ترک اللہ یعنی خسرو کے سوز قلبی پر فخر و مباہات کا موقعہ ہوگا (نفحات الانس، نول کشور ص ۳۹۸) یہی بات دولت شاہ نے تذکرۃ الشعراء (ص ۲۳۹) میں یوں لکھی ہے ــــ شیخ الشیوخ نظام الحق والدین الاولیاء بارہا برزبانِ مبارک راندی کہ روز حشر امید دارم کہ مرا بسوز سینۂ این ترک بچہ بخشند۔"

[2] تاریخ فرشتہ، نول کشور، ج ۲، ص ۴۰۲۔

۳۔ نثر مرصع یا فن واصول ترصیع نگاری پر رسایل الاعجاز یا اعجاز خسروی۔

۴۔ کتاب افضل الفواید۔ اقوال و ملفوظ حضرت نظام الدین اولیاءؒ (اس کی نسبت خسرو کی جانب مشکوک ہے)

۵۔ تواریخی منظومات میں مثنویات بعنوان قران السعدین، مفتاح الفتوح، نہ سپہر اور تغلق نامہ۔

۶۔ خزاین الفتوح (یا تاریخ علائی) میں سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات کا تذکرہ بڑی مرصع نثر میں پیش کیا گیا ہے۔

۷۔ مثنوی دول رانی خضر خان (یا عشیقہ یا عشقیہ) میں علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خان اور راجہ کرن کی بیٹی کے معاشقہ کا حال نظم کیا ہے۔

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی اور وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔[1]

صاحب تاریخ فرشتہ ان کو 'نادرۂ روزگار' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں خسرو کی ذات اور صفات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

---

[1] اگرچہ خسرو پر بہت زیادہ نہیں لکھا گیا ہے لیکن جو کچھ بھی تحقیقی اور تنقیدی کام اب تک ہوا ہے ان میں ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب Khusrau life and work (جس کا ایک اردو ترجمہ و خلاصہ بھی شایع ہو چکا ہے) ہماری حقیر رائے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے مثنوی نہ سپہر بھی ۱۹۴۸ء میں کلکتہ سے شایع کی۔ نیز ملاحظہ ہو Hazrat Amir Khusrau of Delhi از مرحوم پروفیسر محمد حبیب (علی گڑھ) اور مولانا احسن مارہروی (مرحوم) کی اردو تصنیف "حیات و کلام امیر خسرو" (علی گڑھ)۔ ابھی حال میں حضرت امیر خسرو کی ساتویں سو سالہ برسی کے موقع پر نیشنل امیر خسرو سوسائٹی (۱۹۷۵ء) کی طرف سے جو مختصر کتابچہ شایع ہوا ہے اس میں صرف علی گڑھ سے شائع ہونے والی تالیفات کی تعداد گیارہ بتائی گئی ہے اور ان میں خمسہ، مثنوی دول رانی خضر خان، قران السعدین، دیوان وسط الحیات، جواہر خسروی (تصنیف امین چریاکوٹی، ۱۹۱۸ء) خزاین الفتوح اور مفتاح الفتوح شامل ہیں۔ مثنوی تغلق نامہ ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد سے شایع ہوئی۔ اسی کتابچے میں چند اور متنوں اور تصانیف کا ذکر ہے جو ابھی شایع نہیں ہوئیں۔

"۔۔۔۔۔۔ واز شعرای وقت پادشاہ علاء الدین کہ دارالملک دہلی بلکہ تمام ہندوستان بوجود عدیم المثال ایشاں زیب وزینت داشت وصیت سخنوری ایشاں عالم را فراگرفتہ بود، وچندکسی کہ دربای تخت بودند، سرآمد ایشاں امیر خسرو بود کہ در فنون سخن واختراع معانی ید بیضا داشت وآثار فضل ومناقب او از تصنیفاتی کہ در نظم ونثر کردہ واضح ولایح است۔[1] معہذا صوفی صاحب وجد وحال بود واکثر اوقات او در صوم وصلوٰۃ گذشتی واز عشق ومحبت نشاط تمام داشتی۔۔۔"

خسرو کی شخصیت میں ہمیں اپنی گنگا جمنی تہذیب کی تصویر پوری برنائی کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔ حقیقتاً وہ اس مشترکہ کلچر کی نمایندگی کرتے ہیں جس کی اساس ہند ایرانی ثقافت کے لطیف ترین عناصر کی باہم آمیزش پر قایم ہے وہ خود کو "ترک ہندوستانی" کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے تنہا اپنی ذات سے ہندوستانی تہذیب کو مختلف حیثیتوں سے بہت کچھ دیا ہے۔

وجد وحال کی محفلوں میں ان کی غزلیں اور گیت آج بھی جس ذوق وشوق سے گائے جاتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ان کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔

سلوک وتصوف، عشق معنوی اور عرفان وآگہی نے جو سوز دروں ان کو بخشا تھا وہ ان کی مترنم اور والہانہ غزلوں کے روپ میں جھلکا۔ ان کے روحانی تاثرات اور مسلک وحدت پرستی نے جس میں مذہب وملت کی تفریق نہ تھی اور جو انسان دوستی کے مستحکم ستون پر قایم تھا ہمارے ملک کے مختلف صوفی رہنماؤں کے اقوال اور افکار ونظریات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ، نول کشور، کانپور، ج ۱، ص ۱۲۱۔

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس
اور
میرے مشاہدات و تاثرات
(۳)

(سعید احمد اکبر آبادی)

ایران کے شاہ اور شاہ بانو پاکستان آ رہے تھے، اس لئے مولانا کوثر نیازی اس ڈنر کے بعد اسلام آباد چلے گئے اور کانفرنس کے لاہور سیشن سے غائب رہے۔

مولانا ظفر احمد انصاری | یہاں مولانا ظفر احمد صاحب انصاری سے بھی ملاقات ہوئی، موصوف آج کل پاکستان نیشنل اسمبلی کے ممبر اور سیرت کمیٹی کے رکن ہیں، اسی وجہ سے وہ کانفرنس کے ساتھ چل رہے تھے، ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر ظفر اسحق انصاری، میرے قیام کینیڈا کے زمانہ کے شاگرد ہیں، اُن کی محبت، اخلاص، دینداری اور اعلیٰ قابلیت و لیاقت کے باعث اُن سے عزیزانہ تعلقات ہیں، میکگل یونیورسٹی سے ڈاکٹر ہونے کے بعد کچھ عرصہ امریکہ میں رہے۔ اب آج کل سعودی عرب کے ایک پٹرولیم انجنیئرنگ کالج میں پروفیسر ہیں، مولانا ظفر احمد انصاری پاکستان کی ایک مشہور شخصیت ہیں، مکہ مکرمہ کے رابطۃ العالم الاسلامی اور جنیوا کے اسلامک سینٹر کے رکن ہیں ان سے سب سے پہلی ملاقات

عجب ڈرامائی انداز میں ۱۹۶۵ء میں حجازِ مقدس میں ہوئی تھی، میں اس سال گورنمنٹ آف انڈیا کے حج ڈیلی گیشن میں گیا تھا۔ عرفات اور مزدلفہ سے فارغ ہوکر منا میں ہندوستانی سفارت خانہ کا مہمان تھا، ایک روز مغرب کے بعد مدحت کامل صاحب قدوائی سفیر ہند میرے کمرہ میں آئے تو مولانا اُن کے ساتھ تھے۔ چند ماہ پیشتر ہندوستان پاکستان کی جنگ اگرچہ ختم ہوگئی تھی لیکن تناؤ اب تک تھا، اس لئے قدوائی صاحب نے جب مولانا کا تعارف کرایا تو مجھے مسرت آمیز تعجب ہوا، مولانا اس کو تاڑ گئے اور یوں گویا ہوئے :۔ میں ابھی منا کے بازار میں سے گذر رہا تھا کہ قدوائی صاحب مل گئے، انھوں نے علیک سلیک کے بعد اس وقت شرکتِ طعام کی دعوت دی، میں نے جواب دیا : آخر میں آپ کے ہاں کھانا کیوں کھاؤں! قدوائی صاحب بڑے ڈپلومیٹ تھے، انھوں نے کہا : ہمارے ہاں ہندوستان کے چند مشہور حضرات ٹھہرے ہوئے ہیں، ممکن ہے اُن میں کوئی صاحب آپ کی دلچسپی کے بھی ہوں۔ میں نے پوچھا : مثلاً ! " قدوائی صاحب بولے : مثلاً سعید احمد اکبرآبادی" میں نے یہ نام سنا تو فوراً بولا : بہت بہتر! اب میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا " اب مولانا نے فرمایا : میں آپ سے ایک عرصہ سے واقف ہوں، ظفر اسحٰق سے بارہا ذکر آیا، برہان میں اور دوسرے اخبارات و رسائل میں پڑھا۔ مگر جب سے آپ کی کتاب صدیق اکبر پڑھی ہے۔ آپ سے بڑی محبت ہوگئی ہے، اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہونا ضروری ہے " مولانا اور اُن کے فرزند دونوں انگریزی زبان کے بھی بڑے ماہر اور ادیب ہیں، میں نے عرض کیا : " تو پھر آپ ہی ترجمہ کیجئے، میں اجازت دیتا ہوں "

اب اتنے برسوں کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی اور صدیق اکبر کا پھر ذکر آیا اور دوسری باتیں بھی ہوئیں تو بڑی خوشی ہوئی۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مولانا ضعیف بہت ہوگئے ہیں لکڑی کے سہارے چلتے ہیں، باتیں کم کرتے ہیں، کانفرنس کے دوران برابر ملاقاتیں رہیں اور میں ان کی عنایات و الطاف سے متمتع ہوتا رہا۔ علم و فضل، تعلیم جدید اور ساتھ ہی

دینداری کے اعتبار سے مولانا اور اُن کا گھرانہ "این خانہ ہمہ آفتاب ست" کا مصداق ہے، کثر اللہ أمثالهم۔

مقالات کی نشست | دوسرے دن یعنی ۶ مارچ سے مقالات کی نشست شروع ہوئی، کانفرنس کا پروگرام یہ رہتا تھا کہ صبح نو سے ساڑھے دس بجے تک، اس کے بعد آدھے گھنٹہ کا وقفہ چائے کافی وغیرہ کے لئے پھر گیارہ سے ڈیڑھ بجے تک، بس مقالات کا وقت یہی تھا، اس کے بعد لنچ، استقبالیہ؛ روزانہ یہ پروگرام رہتا تھا، لنچ اور ڈنر پر کم مگر استقبالیہ کے موقع پر متعدد تقریریں ادھر اور اُدھر دونوں طرف سے ہوتی تھیں، مقالات کی نشست کا آغاز تلاوت کلام مجید کے بعد حکیم محمد سعید صاحب کی مختصر تقریر سے ہوتا تھا جس میں وہ تحریک صدارت کرتے اور مقالات کا تعارف کراتے تھے، کانفرنس کی زبان چونکہ عربی اور انگریزی دونوں تھیں اس لئے صدر بجائے ایک کے بیک وقت دو ہوتے تھے، آج کے ابتدائی اجلاس کے صدر رانا اقبال احمد وزیر اوقاف، پنجاب اور ڈاکٹر یوسف ہاشم الرفاعی تھے۔ اس نشست میں متعدد مقالات پڑھے گئے، لیکن سب سے اہم مقالہ پروفیسر واٹ منٹگمری کا تھا جس کا عنوان تھا "دنیا کے سیکولر مورخین اور مقدس پیغمبر اسلام۔

پروفیسر واٹ منٹگمری | اس مقالہ میں پروفیسر موصوف نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ صلیبی جنگوں کے اثرات کے باعث سب سے پہلے مغرب میں ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارہ میں سخت معاندانہ کتابیں لکھیں اور اُن میں حقائق و واقعات کو توڑ مروڑ کر اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق نہایت مکروہ ہرزہ سرائی کی صلیبی جنگوں کے باعث مغرب کا بچہ بچہ مسلمانوں کے خلاف جذبۂ انتقام سے لبریز تھا اس لئے ان مصنفوں کی کتابیں گھر گھر پھیل گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام اور اُن کے مذہب کے متعلق یورپ کا ایک خاص ذہن بن گیا، ان کتابوں کے اثرات اس درجہ عمیق، دور رس اور ہمہ گیر تھے کہ اس دور کے بعد جب سائنٹیفک اصول پر تاریخ نگاری کا عہد آیا تو اس عہد میں جن مغربی مصنفین نے

پیغمبرِ اسلام پر کتابیں لکھیں اور اُن میں تاریخ نگاری کے سائنٹفک اصول کی رعایت کا دعویٰ کیا وہ بھی دورِ اول کی متعصبانہ کتابوں کے اثرات سے بالکل محفوظ نہیں رہ سکے۔

پروفیسر واٹ منٹگمری نے کہا: قرونِ وسطیٰ میں اسلام نے جو عظیم الشان مادی اور تہذیبی کامیابی حاصل کی تھی اُس نے اُس عہد کے مغربی علماء میں ایک نفسیاتی ردِ عمل یہ پیدا کیا کہ انھوں نے اپنے مذہب اور اُس کی روحانیت کی فوقیت و برتری کا اور اُس کے بالمقابل اسلام کی کمتری اور اُس کی منقصت کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا، انھوں نے کہا کہ "مسیحیت ایک روحانی مذہب ہے اور اسلام تلوار کا مذہب"!

انھوں نے مزید کہا: بہرحال اب یورپ میں اسلام اور اُس کے پیغمبر کو اُن کے صحیح اور اصلی رنگ میں دیکھنے اور اب تک ان دونوں کے ساتھ مسلسل ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں اُن کی تلافی کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے جو برابر ترقی کر رہا ہے، اِس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی کہا۔ کہ آج اخلاقی اور تہذیبی سطح پر دنیا کو جو عظیم خطرہ درپیش ہے اُس کا کامیاب مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جو قومیں خدا پر ایمان رکھتی ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ افہام و تفہیم کی راہ و رسم پیدا کریں، اگر مسلمانوں اور دوسری خدا پرست قوموں میں یہ ربط پیدا ہو گیا تو یقیناً اس سے مقدس پیغمبرِ اسلام کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے میں یورپ کو مدد ملے گی۔

واٹ منٹگمری صاحب کا پورا مقالہ سب نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا، جب مقالہ ختم ہوا تو ایک نوجوان جو پچھلی صف میں بیٹھے تھے فوراً جوش میں اُٹھے اور بولے: "منٹگمری صاحب! معاف کیجئے! کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ جب ہمارے حضور کے متعلق آپ کے خیالات اتنے اچھے ہیں تو آپ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے" اس پر اس زور کا قہقہہ لگا کہ پورا ہال گونج اُٹھا۔ اسی عالم میں منٹگمری صاحب نے بھی قہقہہ لگاتے ہوئے جواب میں ایک آدھ فقرہ کہا مگر وہ میرے پلّہ نہیں پڑا۔ میرے پاس

جو عرب بیٹھے ہوئے تھے وہ انگریزی سے بالکل ناآشنا تھے، اس لئے اُن سے پوچھنا بیکار تھا۔ شیخ رفاعی جو مقالہ کے نوٹ لیتے رہے تھے انھوں نے اس کا عربی ترجمہ کیا تھا اس کے بعد ڈاکٹر محمد عبدالرؤف (واشنگٹن) نے اس مقالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: مغربی مصنفین نے مقدس پیغمبرِ اسلام کے متعلق یہ ایک عام اور غلط تاثر پیدا کیا ہے کہ عیسائی اور یہودی جماعتیں جو اس زمانے میں مکہ اور مدینہ میں رہ رہی تھیں پیغمبرِ اسلام نے اپنے بہت سے افکار و خیالات ان سے مستعار لے لئے ہیں۔ مغربی مصنفین کو اپنے اس طرزِ فکر کی اصلاح کرنی چاہیے۔ پروفیسر منٹگمری نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمانوں کو تاریخ نگاری میں سائنٹفک طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے، اس کے جواب میں ڈاکٹر عبدالرؤف نے کہا کہ امام بخاری نے احادیث کا انتخاب سائنٹفک اصول پر ہی کیا ہے، آخر میں انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ یورپ میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے متعلق غلط اور بیہودہ باتیں جو یورپین مصنفوں نے پھیلا رکھی تھیں اُن کو درست کرنے کا جو رجحان اب پیدا ہوا ہے اور ترقی کر رہا ہے اُس کی بنیاد خلوص نیت اور نیک ارادوں پر ہوگی۔

شیخ رفاعی کافی وقفہ کے بعد کانفرنس کی کارروائی مسٹر مولود قاسم وزیر امور اسلامیہ، الجزائر، اور جسٹس حمود الرحمٰن پاکستان کی مشترکہ صدارت میں شروع ہوئی تو سب سے پہلے شیخ یوسف ہاشم الرفاعی نے "اسلام واحد ذریعہ امن ہے" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ آج کل یہ عنوان بیش پا افتادہ ہے۔ جس کو دیکھئے اس پر طبع آزمائی کر رہا ہے چنانچہ اس کانفرنس میں خود اسی موضوع پر چھ سات مقالات سے کم نہیں پڑھے گئے ہوں گے۔ خود میں بھی اسی موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ بصورت لکچر ۱۹۶۱ء میں مدراس میں پڑھ چکا ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جب تک مندرجہ ذیل دو باتوں کا وافی و شافی جواب نہ ملے اس مضمون کا حق ادا نہیں ہوتا۔

(۱)۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جب اسلام کے پیرو اور اس کے ماننے والے ہی

کبھی امن سے نہیں رہ سکے، مسلمانوں کی پوری تاریخ خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کی تاریخ ہے، بھائی نے بھائی کی گردن کاٹی ہے۔ بھتیجہ نے چچا کے ساتھ فوج کشی کی ہے، ایک خاندان دوسرے خاندان سے معرکہ آرا ہوا ہے۔ اور اب تک جو ہوتا رہا ہے وہ آج بھی ہوتا ہے۔ پس جب اندرونِ خانہ ہی امن نہیں تو اسلام دنیا میں کس طرح امن کی ضمانت ہوسکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات اسی وقت برگ و بار پیدا کرسکتی ہیں جب کہ پہلے تزکیۂ نفس ہو۔ اور تزکیۂ نفس کی سب سے مقدم اور بنیادی شرط ہے حقیقی معنی میں ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرۃ، اس لئے یہ دعویٰ کرنے سے پہلے کہ اسلام دنیا میں امن کا ضامن ہے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے گھروں میں، خاندانوں میں اور اپنے ملکوں میں اس کا عملی نمونہ قائم کریں، یعنی امن جن اسباب سے تباہ ہوتا ہے، مثلاً خود غرضی، بے قید زندگی، طبقاتیت، معاشی عدم مساوات، استحصال بالجبر، غربت و افلاس، افراطِ زر، اخلاقی مسئولیت کی طرف سے بے پروائی، وغیرہ وغیرہ! جب تک مسلمان مملکتیں اسلام کی تعلیمات کے مطابق ان سب دواعی نقضِ امن کا استیصال اپنے ہاں سے نہیں کردیں گی۔ انھیں اس قسم کے دعویٰ کا کوئی حق نہیں ہے۔ ورنہ دنیا کہہ سکتی ہے :-

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت — دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

کانفرنس میں ایک عرب ملک کے نمائندے نے کہا کہ آج نظریوں کی جنگ کا زمانہ ہے۔ میں نے اُن سے کہا: آپ غلط کہتے ہیں، آج زمانہ یہ دیکھنے کا ہے کہ کونسا نظریہ عملاً سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ اس لئے اب اسلام کی حقانیت پر کتابوں کا انبار لگانے کے بجائے آپ اپنے ملک میں اسلام کو اس کے ہمہ جہتی نظام کے ساتھ عملاً قائم کر دکھائیے تو وہ دنیا کے لئے ایک موثر دعوتِ امن ہوگا۔ ورنہ آپ قرآنِ مجید کی وعید کبُرَ مقتاً عند اللہِ ان تقولوا مالا تفعلون کا مصداق ہوں گے۔

(۴)۔ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ جب تک اس امر کی مکمل وضاحت نہیں ہوتی کہ اسلامی سماج میں غیر مسلموں کی پوزیشن اور ان کی حیثیت کیا ہے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے علائق و روابط اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی امور و معاملات میں ان کے اشتراک و تعاون کی شرعی طور پر کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں، اسلام کو دنیا میں امن کی ضمانت نہیں کہا جا سکتا۔

شیخ رفاعی نے اپنے مقالہ میں اس دوسرے پہلو پر بھی بحث کی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ میرے نزدیک ناقص اور ناتمام تھا۔ اس بنا پر ان کے مقالہ کے بعد فوراً میں کھڑا ہو گیا اور جناب صدر کی اجازت سے تقریر شروع کر دی۔ ابھی تقریر جاری ہی تھی کہ شیخ رفاعی نے کہا: یہ آپ نے کیا بحث چھیڑ دی۔ ان مسائل پر گفتگو کا یہ کونسا موقع ہے جناب صدر نے بھی ان کی تائید کی اس لیے میں تقریر کو ناتمام چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر بھی جو کچھ میں نے کہا تھا دوسرے دن سب اخبارات نے اسے نقل کیا۔ اور ٹیلی وژن اور ریڈیو پر بھی اس کا ذکر آیا۔ دوسرے دن کانفرنس میں حکیم محمد سعید صاحب اور بعض اور اہل علم نے کہا: آپ نے بہت اہم اور ضروری پوائنٹس پر گفتگو شروع کی تھی افسوس ہے کہ آپ تقریر پوری نہیں کر سکے۔ میں نے کہا شیخ رفاعی اور جناب صدر کو یہ شبہہ ہوا کہ بحث کا رُخ سیاسی ہو جائے گا۔ حالانکہ میں خالص علمی نقطۂ نظر سے بعض گوشوں کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

یہاں یہ جتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ شیخ رفاعی کی لیاقت و قابلیت اور ان کی دینداری میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ اپنے افکار و خیالات میں بے حد قدامت پرست اور ان کے اظہار میں بڑے بے باک ہیں اور غیر مسلموں کے بارے میں ان کا رویہ صلح جویانہ اور روادارانہ نہیں ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال

ماہِ نومبر میں بہت سے عرب حضرات جن میں شیخ ازہر بھی تھے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جشن سے فارغ ہو کر دہلی آئے اور حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز، نئی دہلی کی طرف سے ان سب حضرات کو عصرانہ واستقبالیہ دیا تو شیخ رفاعی جو اس وقت موجود تھے وہ محض اتنی ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھے کہ انسٹیٹیوٹ کا نام اسلامک ہے، لیکن اس کے باوجود حکیم صاحب نے اس کا افتتاح عرب لیگ کے سکریٹری مقیم نئی دہلی سے کرایا جو عرب عیسائی تھے اگرچہ اُن کا نام بالکل مسلمانوں جیسا تھا، گویا شیخ رفاعی کے پہلو میں مولانا جلال الدین رومی کا سوز و گداز عشق سے لبریز وہ دل نہیں ہے جس نے اُن سے کہلوایا تھا:-

چہ خوش باشد کہ سرِّ دلبران گفتہ آید در حدیثِ دیگران

مولانا سید ابوبکر غزنوی اس مقالہ کے بعد متعدد مقالات ہوئے، اُن میں ایک مقالہ مولانا سید ابوبکر غزنوی کا بھی تھا، مولانا تحریکِ خلافت کے مشہور لیڈر مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند تھے، خود نہایت فاضل، پرجوش خطیب اور بڑے جذبہ کے مسلمان تھے، علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد ایم۔اے بھی کیا تھا، ۱۹۶۹ء میں جب میں پاکستان گیا تھا تو ایک دن کراچی کی شام ہمدرد میں اسلامی معاشیات پر اُن کی تقریر سنی اور اس کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی تو چونکہ برہان کے ذریعہ پہلے سے واقف تھے اس لئے بڑے تپاک اور محبت سے ملے اُس زمانہ میں یہ کسی گورنمنٹ کالج میں شعبہ اسلامیات کے صدر تھے، پھر جس صبح کو میں لاہور سے وطن کے لئے روانہ ہونے والا تھا اور اس کی شب میں عزیزی میاں اسلم نے اپنے مکان پر میرے لئے ایک پرتکلف الوداعی ڈنر کا اہتمام کیا تھا جس میں لاہور کے تقریباً سب ہی میرے دوست احباب جمع تھے اُن میں مولانا سید ابوبکر غزنوی بھی تھے، اس کے بعد اب کانفرنس میں اُن سے پھر ملاقات ہوئی تو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب وہ جامعۂ عباسیہ، بہاول پور کے وائس چانسلر ہیں

حسب معمول بڑے تپاک سے ملے، دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، صحت بہت اچھی تھی، چہرہ پر بڑی رونق اور توانائی تھی، اور مرض کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اپریل کے ماہنامہ الرشید لاہور میں اچانک ان کی وفات کی خبر پڑھی تو سخت صدمہ ہوا، إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ۔

مولانا مرحوم کے علاوہ مقالہ پڑھنے والوں میں، چودھری نذیر احمد خاں، پاکستان ڈاکٹر اسماعیل بامک (آسٹریا) مولوی ایم۔ ایچ بابو (سنگاپور) ڈاکٹر امان اللہ اور مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی (پاکستان) بھی تھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال | دوسرے دن یعنی ۷ مارچ کو سردار محمد اقبال چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ کی صدارت میں کانفرنس کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے ڈاکٹر جاوید اقبال کا نہایت شاندار، پرمغز اور فکر انگیز مقالہ ہوا، جاوید علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند ہیں اور ناک نقشہ ڈیل ڈول اور رنگ میں اپنے والد سے بڑے مشابہ ہیں، ان کو دیکھتے ہی مجھ کو وہ زمانہ یاد آگر تڑپا گیا جب جاوید اور اُن کی بہن منیرہ علامہ اقبال کے پاس کھیلا کرتے تھے، اس وقت ان کی عمر پانچ چھ برس کی ہوگی، علامہ کو ان دونوں بچوں سے بڑی محبت تھی اور انھیں کے لئے انھوں نے جاوید منزل کے نام سے کوٹھی بنائی تھی، اس کوٹھی میں علامہ کے حصّہ میں ایک کمرہ آیا تھا جو نہایت سادہ اور اعلیٰ فرنیچر سے معرا تھا، ایک اسپرنگ دار مسہری تھی، علامہ اُسی پر بیٹھتے اُٹھتے اور حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے، اسی میں آنے جانے والوں کے لئے کچھ کرسیاں اور کچھ مونڈھے پڑے رہتے تھے ڈاکٹر جاوید اقبال نے پہلے انگریزی اور فلسفہ میں الگ الگ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، پھر کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور لندن سے بار۔ ایٹ۔ لا ہوئے، بڑی خوشی کی یہ بات ہے کہ اسلامی حمیت و غیرت اور جذبۂ دجوش ایمانی میں اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کا مصداق ہیں، آج کل لاہور ہائی کورٹ میں جج ہیں، ۱۹۶۹ء میں جب میں پاکستان گیا تھا تو اُس وقت ایوب خاں مرحوم کی حکومت

ختم ہو چکی تھی اور جماعت اسلامی اور کمیونسٹ گروپ میں سخت جنگ برپا تھی، کمیونسٹ طبقہ علامہ اقبال کو بھی کمیونسٹ ثابت کرنے کی قسم کھائے بیٹھا تھا اور انگریزی اور اُردو میں اُن کے مضامین نکل رہے تھے، اس وقت سب سے زیادہ پامردی اور جوش کے ساتھ انگریزی میں جو شخص اس طبقہ کے مزعومات کے خلاف مسلسل لکھ رہا تھا وہ جاوید اقبال تھے، انھیں دنوں آغا شورش کاشمیری مرحوم اور شیخ محمد اشرف، مشہور پبلشر و ناشر کتب نے میرے اعزاز میں جو نہایت شاندار ڈنر دیئے تھے ان دونوں میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر جاوید اقبال بھی موجود تھے اور یہیں ڈاکٹر صاحب نے اپنے مذکورۂ بالا مضامین کے اخباری تراشے مجھے بھی دیے تھے، جنھیں میں نے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔

ان کے اس وقت کے مقالہ کا عنوان تھا: "آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور جدید انسان"، اس میں انھوں نے پہلے یورپ اور امریکہ میں صنعتی اور معاشی انقلاب کے وجوہ و اسباب، اس انقلاب کے تہذیبی اور معاشرتی نتائج و ثمرات اور اُن کے باعث اعلیٰ اقدارِ حیات کی پامالی کا ذکر کیا اور اُس کے بعد کہا: دنیا کے موجودہ معاشی بحران میں جدید انسان (MODERN MAN) نہیں، بلکہ اخلاقی انسان (MORAL MAN) ہی دنیا کو اُس بربادی اور تباہی سے بچا سکتا ہے جس کے کنارے وہ اس وقت کھڑی ہے، تہذیب جدید نے انسان میں یہ زعم پیدا کیا تھا کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک ہے، لیکن اس وقت انرجی کرائسس، اشیا کی گرانی اور پھر یہ اندیشہ کہ ایک صدی کے اندر اندر عالمی طاقت کے تمام ذرائع ختم ہو جائیں گے ان سب نے مل جل کر جدید مفکرین عالم میں ایک فکری رجحان یہ پیدا کیا ہے کہ اب تک ہم نے انسانی ترقی کا انحصار جن چیزوں پر رکھا تھا وہ غلط تھا اور ہمارا یہ سمجھنا بھی درست نہیں تھا کہ انسان اپنی تقدیر کا مالک ہے۔" یہ حضرات اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ٹکنالوجی کو جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اُس نے مطمئن اور مسرور زندگی بسر کرنے کے اسباب کے بجائے قتل عام کے اسباب زیادہ پیدا کئے ہیں اور اب ان ملکوں کے پاس کوئی سماجی نظام

ایسا نہیں ہے جو اس احساس شکست سے اُن کو محفوظ رکھ سکے۔

اس کے بعد انھوں نے کہا: قرآن کی دعوت دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہے اور اسلام کا کام ہی ہے انسان کے لئے حقیقی مسرت اور اطمینان کا سروسامان کرنا، یونانی سمجھتے تھے کہ مسرت کا حصول صرف اس دنیا میں ممکن ہے۔ اس کے بالمقابل عیسائیت کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ دنیا ناپاک درنجس ہے اور مسرت صرف عالم آخرت میں حاصل ہو سکتی ہے، ان دونوں کے برخلاف اسلام نے دوگانہ مسرت کا نظریہ پیش کیا، اُس نے اُن عالمگیر اخلاقی اصول کو پیش کیا جن کے قبول کر لینے سے انسان کو یہاں اور وہاں دونوں عالموں میں مسرت حاصل ہونی یقینی ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق اور کردار سے جو نمونہ عمل قائم کیا تھا وہ ساری دنیا کے لئے اسوۂ حسنہ بن سکتا ہے، لیکن دین کا معاملہ ہو، خوشی اور مسرت کا موقع ہو یا غم اور حزن وملال کا، فتح ہو یا شکست، جنگ ہو یا امن، دوستوں سے سابقہ ہو یا دشمنوں سے، فاقہ کشی ہو یا خوش حالی، غرض کہ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر حالت اور ہر موقع پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اعلیٰ کردار اور اخلاق، یعنی طہارتِ نفس، امانت و دیانت، بے غرضی و بے نفسی، عہد کی پابندی (قیام علی الحق، صبر و ثبات، استقلال و پامردگی، اعلیٰ ہمتی و بلند حوصلگی، پاکبازی و عفت ارادہ و عمل کا مظاہرہ کیا ہے اور جس سے دنیا کی کایا پلٹ کردی، زندگی ایک خارزار تھی اُسے چمن بنا دیا، جن ویرانوں میں خاک اڑ رہی تھی ان میں لالہ و گل کھلا دئے، جو رو رہے تھے انھیں ہنسا دیا، جو درد وکرب کے مارے کراہ رہے تھے انھیں تندرست و توانا کردیا، جو ضعف اور کمزوری کے باعث دو قدم نہیں چل سکتے تھے انھیں دوڑنا سکھا دیا، اور جو اپنے گھروں اور رشتہ داروں میں چین اور سکھ سے نہیں رہ سکتے تھے انھیں دشمنوں کے ساتھ گذارہ کرنے کے گُر اور ڈھنگ بتا دیئے[1]) ـــــ یہ وہ اعلیٰ اخلاق اور کردار ہیں جن کی پیروی آج دنیا کو اس قیامت سے محفوظ رکھ سکتی ہے

[1] قوسین میں جو عبارت ہے وہ میری اپنی ہے، "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

جو اُس کے سر پر منڈلا رہی ہے، اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے کہا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اخلاق جو کچھ بھی تھے اُس کا آئینہ قرآن مجید ہے (حضرت عائشہ نے فرمایا: وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ) اور قرآن ایک زندہ کتاب ہے۔ ساری دنیا کے لئے ہے، ہر شخص اُس کو سمجھ سکتا اور اُس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔" یہ سب کچھ کہنے کے بعد ڈاکٹر ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ اس پر ختم کیا: " پس آج دنیا کو ضرورت ماڈرن مین کی نہیں بلکہ مورل مین (Moral Man) کی ہے۔

مسٹر بھٹو پر اس تقریر کا ردعمل اس مقالہ پر مختلف تبصرے ہوئے، امام حرم کعبہ شیخ عبداللہ بن سبیل نے کہا :۔ آج دنیا کو جو مسائل درپیش ہیں صرف اسلام ہی اُن کا حل پیش کر سکتا ہے ور مسرت صرف ایمان کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔" کویت کے وزیر اوقاف و امور دینیہ شیخ عبداللہ ابراہیم المفرج نے کہا: ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی موجودہ نسل کو حقیقی معنی میں اسلامی روح سے بھرپور اور سچے اسلامی معاشرہ میں تبدیل کریں، پہلے ہمیں خود اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہیئے، تب ہی ہم دنیا سے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اُس کی سب مشکلات کا حل ہے۔" شیخ حسن خالد مفتی اعظم لبنان نے بھی یہی بات کہی، لیکن معلوم نہیں وزیر اعظم مسٹر بھٹو کو یہ تقریر کن لفظوں میں پہنچی، اُن پر اُس کا اثر یہ ہوا کہ مقررین نے ماڈرن مین کی نفی کر کے سائنس اور ٹکنالوجی کی موجودہ ترقیات اور اُن کی افادیت و اہمیت سے انکار کر دیا اور صرف اخلاق پر زور دیا ہے چنانچہ کراچی میں اپنے شاندار استقبالیہ میں (جس کا تذکرہ آگے اپنے موقع پر آئیگا) مسٹر بھٹو نے جو ایک طویل تقریر کی اس میں ڈاکٹر جاوید اقبال کا نام لیئے بغیر انہوں نے حسب عادت بڑے زور سے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ لاہور کے اجلاس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہمیں ماڈرن مین کی ضرورت نہیں بلکہ مورل مین کی ہے " میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے، بلکہ ہم کو درحقیقت ضرورت Modern man cum moral man کی ہے، یعنی ایسا انسان جو بیک وقت ماڈرن

بھی ہو اور مورل بھی،

یہ مقالہ میں نے از اول تا آخر بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا تھا اس لئے اچانک مسٹر بھٹو کا یہ ریمارک جسے انگریزی میں (mysterious) (پر اسرار) کہنا چاہیے سنا تو تعجب ہوا لیکن پھر معاً خیال آیا کہ آج کل پاکستان میں نظریاتی اختلافات بہت زیادہ ہیں، اُن کی وجہ سے ایک دوسرے سے بدگمانی عام ہے، اس بنا پر ممکن ہے فکری اور نظریاتی اعتبار سے ڈاکٹر جاوید اقبال کا رجحان یا تعلق کسی ایسی جماعت کے ساتھ ہو جسے مسٹر بھٹو پسند نہ کرتے ہوں (اور ممکن ہے یہ جماعت جماعت اسلامی ہو) اس بنا پر مسٹر بھٹو جو پاکستان کو ایک اعلیٰ درجہ کی ماڈرن اسٹیٹ بنانے کی غرض سے سائنس، ٹکنالوجی، اور سوشلزم پر بہت زور دے رہے اور ہر تقریر میں اس کا اظہار کر رہے ہیں انھوں نے ڈاکٹر جاوید اقبال کے مقالہ کو خود اپنے اوپر اور اپنی پالیسی پر ایک بالواسطہ حملہ (Indirect Hit) خیال کیا اور اس لئے وہ ریمارک کر گئے، ممکن ہے اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی صفائی کی ہو اور اس پر مسٹر بھٹو نے جگر کے الفاظ میں معذرت کی ہو:-

خطا معاف زمانہ سے بدگمان ہوکر تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گذرے

قرآن اور تصوف

مؤلفہ جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب مرحوم

تصوف اور اُس کی تعلیم کا اصل مقصد عبدیت اور الوہیت کے مقامات کا تعلق اور اُن کے ربط و تعلق کا حصول ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ مختلف قسم کی ذلتوں کا سرچشمہ بن کر رہ گیا ہے۔ مؤلف نے کتاب و سنت کی روشنی میں تمام الجھنوں اور نزاکتوں کو نہایت دل نشین اور عالمانہ پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ صفحات ۱۸۰، تقطیع متوسط، طبع آفسٹ، قیمت -/5 مجلد 8/- پتہ:- ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی

علامہ فضل حق خیر آبادیؒ

اور

اُن کا ادبی ذوق

مولانا ریاض الانصاری صاحب

علامہ کی زندگی متضاد اوصاف کی حامل ہے، ادباء اور منطقیین کے درمیان ہمیشہ سے چشمک رہی ہے اس کا اندازہ مولانا محمد ادریس صاحبؒ کاندھلوی محشی مقامات حریریؒ کے اس مقدمے سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے مقامات حریری پر رقم فرمایا ہے۔ لیکن علامہ اس فارسی مصرعہ کے مصداق ہیں ع

درکف جام شریعت درکف سندان عشق (حافظ)

اگر علامہ ایک طرف امام المنطق والفلسفہ علوم معقولات ومنقولات کے مجمع البحرین جنگ آزادی کے ہیرو یا روح رواں تھے تو دوسری طرف ادب نوازی، سخن پروری، ادبی شعور اور شعری ذوق ان کو خدا نے بدرجۂ اتم عطا فرمایا تھا۔ اس مختصر مقالہ میں آخر الذکر عنوان پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، اس مقالہ کا اہم جز "فضل حق و مرزا غالب" ہے کہ علامہ نے غالبؔ کو کیا دیا، اور غالب نے کس کمال عقیدت سے اسے قبول کیا۔

علامہ کے علمی مقام کا اندازہ سرسید مرحوم کی معرکۃ الآرا کتاب "آثار الصنادید اور غالب کے فارسی خطوط (جو علامہ کے نام تحریر فرمائے یا جن کا تعلق علامہ کی ذات گرامی سے ہے نیز مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مباحثوں اور مناظروں سے کیا جاسکتا ہے اس کے علاوہ تذکرہ نویسوں کے تذکرے، اور خود علامہ کی تالیفات وتصنیفات

اور درس و تدریس کا پچاس سالہ سلسلہ ہے۔ آج بھی معقولات میں ہر شخص اس سلسلے کو جو ہندوستان کے سب سے بڑے معقولی اسکول خیرآباد (اودھ) سے وابستہ ہے قابل فخر و امتیاز شمار کرتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنے استاد مولانا محمد قمرالدین صاحب گورکھپوری زید مجدہٗ کی زبان سے سنا۔" وہ فرماتے تھے جب علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ اور حضرت مولانا فخرالدین احمد، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے درمیان معقولات پر بات چیت ہوتی، تو علامہ بلیاوی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب میرا سلسلہ معقولات میں خیرآباد سے ملتا ہے اور آپ کا بھی لیکن مجھے فخر اس پر ہے کہ میرا سلسلہ ایک واسطے سے علامہ فضل حق تک پہونچتا ہے اور آپ کا دو واسطوں سے۔"

ماحول علامہ جس دور میں پیدا ہوئے اور جس ماحول میں آپ کی ساخت و پرداخت ہوئی وہ فارسی ادبیات کے زوال اور اردو ادبیات کے عروج کا زمانہ تھا فارسی ادبیات کے زوال کا نقشہ حالی نے کھینچتے ہوئے علامہ جیسے صاحبان علم و فضل کے مذاق شعر و سخن کو خوب سراہا ہے:

"اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی، مگر حسن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دارالخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدہلوی، مولانا مفتی محمد صدرالدین خاں متخلص بہ آزردہؔ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومنؔ، نواب مصطفےٰ خاں حسرتیؔ، نواب ضیاءالدین احمد خاں نیرؔ، سید غلام علی خاں وحشتؔ وغیرہم ہیں۔[1]

[1] یادگار غالب ص۱۰۱۔ مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد۔

علامہؒ کا ذوق شاعری

علامہ کا تعلق اس دور کے سربرآوردہ علماء و شعراء سے تھا۔ علامہ خود ایک مسلم الثبوت فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ سرسید مرحوم نے آثار الصنادید میں "انھیں فرزدقِ عہد و لبید دوراں"[1] کے نام سے یاد کیا ہے

علامہ عربی و فارسی میں شعر کہتے تھے فارسی میں فرقتی تخلص فرماتے تھے چنانچہ آپ کا ایک فارسی شعر بہت مشہور ہے ؎

فرقتی در کعبہ رفتی بارہا

نا مسلماں نا مسلمانی ہنوز

آپ کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے زائد بتائی جاتی ہے۔ اکثر اشعار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح (ستائش) میں اور بعض اشعار کفار و مشرکین کی ہجو میں کہے تھے نظمہ یتزید علی اربعۃ الاف شعر فاکثر قصائدہ فی مدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبعضھا فی ہجو الکفار[2] ——— نظمش ترا ید بر چہار ہزار اشعار خواہد بود۔[3] ——— عربی اشعار میں قصیدہ ہمزیہ، قصیدہ دالیہ (قصائد فتنۃ الہند) بہت مشہور ہیں جو علامہ نے نے بزمانہ قید جزیرہ انڈمان موزوں کئے تھے آپ عربی اشعار کی اصلاح سراج الہند مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے لیتے تھے۔ آپ کے شعری ذوق کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے جو بچپن میں پیش آیا تھا۔

"ایک مرتبہ بچپن میں ایک قصیدہ اشعر الشعراء امراء القیس کے قصیدے کے

---

[1] آثار الصنادید باب چہارم ص ۶۳

[2] نزہتہ الخواطر ج ۷، ص ۳۴۲   [3] تذکرہ علماء ہند ص ۱۶۴

طرز پر لکھا۔ علامہ عربی اشعار حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کو دکھایا کرتے تھے چنانچہ اس قصیدے کو بھی شاہ صاحب کے سامنے سنایا۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں علامہ نے متقدمین کے بیس اشعار بطور دلیل پڑھ دیئے۔ آپ کے والد علامہ فضل امامؒ وہاں موجود تھے وہ فرمانے لگے کہ بس حدِّ ادب، [۱]

علامہ کے عربی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

فؤادی هائم والدمع هام
وسهدی دائم والجفن دام

فقلب ما فتی بجوی ولوع
ولوع فی اضطراب واضطرام

ودمع بل دم صرف جری من
یناطی ساجما ای انسجام

وطرف ادمد یوزیه غمض
ولیل سرمد ساجی الظلام

طویل لا یقاس به زمان
فساعته کشهر بل کعام

علت کواکب الجوزاء نیطت
باجفان دوام بالدوام

---

[۱] باغی ہندوستان مرتبہ عبدالشاہد شروانی۔

حمامی حاضر والوجد باد
وجسمی ذابل والشوق نام

یرانی الحب حتی لن ترانی
فلولا انّنی جھلوا مقامی

اذاب الشوق احشائی و ادری
نطی فی اضلعی وبلا عظامی

لتھضمنی ھوی کشح ھضیم
ومال علی معدلة القوام[۱]

آپ کے اس ذوقِ عفیف اور فنِ لطیف کا صحیح عکس آپ کی صاحبزادی حرماں خیرآبادی میں موجود تھا۔ حرماں ایک پرگو شاعرہ تھیں لیکن ان کے اشعار زینت محفل نہ بنے بلکہ زینت خانہ ہی رہے وہ فرمایا کرتی تھیں، "میں پردے میں میرے اشعار پردے میں" ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے

خانۂ یار کا کیا تم کو پتہ بتلاؤں
جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

یہ حرماں خیرآبادی حضرت مضطر خیرآبادی کی والدہ اور اس دور کے مشہور شاعر جاں نثار اختر کی دادی تھیں۔

علامہ اور مرزا غالب یہ حسن اتفاق ہے کہ علامہ اور مرزا کا سن ولادت ۱۲۱۲ھ ہے ہم عمر ہونے کے ساتھ ہم مزاج اور ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی تھے ایک دوسرے کی بڑی قدر اور عزت کرتے تھے مرزا علامہ کے معتقد تھے۔

---

[۱] منقول از آثار الصنادید باب چہارم ص ۴۲۔

کے عہدے سے استعفاء کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں اپنے دوست مولوی سراج الدین کو لکھتے ہیں اور ساتھ ہی اس خبر کو اخبار "آئینۂ سکندر" میں شائع کرنے کی درخواست بھی کرتے ہیں جس سے علامہ کی قدر و منزلت جو مرزا کے دل میں تھی صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اس خط کی چند سطور نقل ہیں :۔

نہفتہ مباد کہ قدر شناسی حکام رنگ آں ریخت کہ فاضل بے نظیر والمعی یگانہ مولوی فضل حق از سر رشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وا رہاند۔ حقا کہ اگر از پایۂ علم و فضل و دانش وکنش مولوی فضل حق آں مایہ بکاہند کہ از صد یک وا ماند، و بازاں پایہ را بسر رشتہ داری عدالت دیوانی سنجیدہ۔ ہنوز ایں عہدۂ دون مرتبہ وی خواہد بود [۱]

ایک خط میں غالب نے علامہ کو خط نہ لکھنے کی شکایت لکھی ہے جس سے ان کے دوستانہ تعلقات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔[۲] اسی طرح جب غالب کو لالہ ہیرا لال کے خط کے ذریعے علامہ فضل حق کے مکان کے قریب آگ لگنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے فوراً ایک طویل خط علامہ کے نام لکھا جس میں تمام احوال و کوائف معلوم کئے ہیں[۳]

علامہ بھی مرزا کی سخن فہمی و سخن سنجی کے مداح تھے مولانا حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے :۔

"مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور ان کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے"[۴]

اس کا اندازہ ان سطور سے بھی ہوگا۔ جن کو حالیؔ نے بطور لطیفہ کہہ کر ذکر کیا ہے

---

[۱] یادگار غالب ۱۲۱ [۲] یادگار غالب ۲۸۲۔ [۳] یادگار غالب ۳۶۰ [۴] یادگار غالب ۵۷

حالانکہ یہ لطیفہ محض لطیفہ نہیں ، لکھتے ہیں "

مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصر علی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے ، انھوں نے کچھ معنی بیان کئے ، اس نے وہاں سے آکر مولانا سے کہا " آپ مرزا کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کرتے ہیں ، آج انھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کئے ، اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اس کے معنی کہے تھے بیان کئے ۔ مولانا نے کہا کہ پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے ۔ اس نے کہا کہ برائی کچھ ہو یا نہ ہو مگر ناصر علی کا یہ مقصود نہیں ہے ۔ مولانا نے کہا کہ اگر ناصر علی نے وہ معنی مراد نہیں لئے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اس نے سخت غلطی کی [۵]

علامہ اور مرزا کے درمیان اسی قسم کے مخلصانہ تعلقات تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا ہر اس اصلاح کو کمال عقیدت سے قبول فرمالیتے تھے جو علامہ اپنے ادبی شعور اور شعری ذوق کے پیش نظر کرتے تھے ۔

حالی نے یادگار میں اشارۃً و کنایۃً علامہ کی اصلاحات کا تذکرہ کیا ہے ۔ ...
. . . . علامہ کی سخن فہمی و سخن سنجی کا مذاق غضب کا تھا ہمیشہ مرزا کو راہ راست پر چلنے کی تلقین کرتے رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا کو غالب بنانے میں جتنا ہاتھ علامہ مرحوم کا ہے شاید کسی دوسرے کا نہیں ۔ چونکہ مرزا نے سب سے پہلے ایسی راہ اختیار کی تھی اور ایسی راہ پر جا پڑے تھے کہ شاید آج ہندوستان میں کوئی اتنا قدرداں نہ ہوتا جتنی قدر و منزلت آج غالب کی ہو رہی ہے ۔ فن اور فنکار کی محنت پژوہی و جگر کاوی رائیگاں جاتی ۔ علامہ ہی کے ادبی شعور نے انھیں اس راہ پر لگایا جس کے متعلق میر تقی میر نے پیشین گوئی کی تھی کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد

---

[۵] یادگار غالب ۱۹۲ ۔

مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔[1]

چنانچہ بقول حالی :- "اس پیشنگوئی کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں"[2] لیکن علامہ جیسے صحیح المذاق وسلیم الطبع اور عبقری شخصیت کے مالک مخلص دوست نے فن اور فنکار کو بام عروج تک پہونچا کر مرزا کو لاجواب شاعر بنادیا۔

مولانا حالی رقمطراز ہیں :- "جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ ورسم بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خالص ومخلص دوست اور خیرخواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا۔ دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا"[3]

مولانا حالی نے صراحتاً ایک شعر کی نشاندہی بھی کی ہے، مرزا نے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب میں ایک شعر یوں لکھا تھا ؎

ہم چناں در تتق غیب نمودے دارند
بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

جب مرزا نے یہ شعر علامہ کو سنایا تو انھوں نے فرمایا کہ اعیان ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اس نمود کی جگہ ثبوت بنادیجیے چنانچہ طبع ثانی میں مرزا نے اسے حذف کر کے لفظ ثبوت بنادیا ؎

ہمچناں در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں (غیر مطبوعہ)

---

[1] یادگار غالب ۱۰۶ [2] یادگار غالب ۱۰۸ [3] یادگار غالب ۱۰۹، ۱۱۰۔

۳۰ / جون ۱۹۷۶ء

حج کمیٹی

پارلیمنٹ کے ایکٹ نمبر ۵۱ سنہ ۱۹۵۹ء کے

تحت تشکیل شدہ

پروگرام حج سنہ ۱۹۷۶ء

بمبئی سے بحری جہازوں کی روانگی : ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ذیل میں حج سنہ ۱۹۷۶ء کے لئے جہازوں کی روانگی کا عارضی پروگرام پیش کرتے ہیں ۔

بمبئی سے روانگی			جدّہ سے واپسی		
۱۔ اکبر	تقریباً	۲۸ / ستمبر سنہ ۱۹۷۶ء	۱۔ اکبر	تقریباً	۸ / دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء
۲۔ نورجہاں	"	۲ / اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء	۲۔ نورجہاں	"	۱۱ / دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء
۳۔ اکبر	"	۱۳ / اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء	۳۔ اکبر	"	۲۳ / دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء

۴۔ نورجہاں تقریباً ۱۶؍اکتوبر ۱۹۷۶ء	۴۔ نورجہاں تقریباً ۲۷؍دسمبر ۱۹۷۶ء
۵۔ اکبر ” ۲۸؍اکتوبر ۱۹۷۶ء	۵۔ اکبر ” ۸؍جنوری ۱۹۷۷ء
۶۔ نورجہاں ” ۳۱؍اکتوبر ۱۹۷۶ء	۶۔ نورجہاں ” ۱۲؍جنوری ۱۹۷۷ء
۷۔ محمدی ” ۲؍نومبر ۱۹۷۶ء	۷۔ محمدی ” ۲۰؍جنوری ۱۹۷۷ء
۸۔ اکبر ” ۱۲؍نومبر ۱۹۷۶ء	۸۔ اکبر ” ۲۵؍جنوری ۱۹۷۷ء
۹۔ نورجہاں ” ۱۵؍نومبر ۱۹۷۶ء	۹۔ نورجہاں ” ۲۷؍جنوری ۱۹۷۷ء

کرایہ جہاز: بمبئی جدہ بمبئی کے سفر کا کرایہ مندرجہ ذیل ہے، صرف واپسی ٹکٹ جاری کیے جائیں گے

	کرایہ مع خوراک	محصول صحت و کرایہ مکان	ہاربر ٹریول ٹیکس	پی پی ٹی وغیرہ کی فیس	معلم پاس وغیرہ کی فیس	★ حج ہاؤس فنڈ	مجموعی رقم
فرسٹ کلاس (بالغ)	۲۸۵۰ روپے	۱۰۵ روپے	۸۱ روپے ۲۵ پیسے	۱۰ روپے	۳۲ روپے	۵۰ روپے	۳۱۲۸ روپے ۲۵ پیسے
” بچہ ایک تا دو سال	۹۶۲ روپے ۵۰ پیسے	—	۱۲۰ روپے ۵۰ پیسے	۱۰ روپے	۳۲ روپے	—	۱۱۲۵ روپے
• اسپیشل فرسٹ ایرکنڈیشنڈ بالغ	۱۹۰۰ روپے	۱۰۵ روپے	—	۵ روپے	۳۲ روپے	۲۵ روپے	۲۰۶۷ روپے
” بچہ ایک تا دو سال	۱۴۷۵ روپے	—	۵۹ روپے ۵۰ پیسے	۵ روپے	۳۲ روپے	—	۱۵۷۱ روپے ۵۰ پیسے
+ اسپیشل کیبن ایرکنڈیشنڈ بالغ	۱۸۰۰ روپے	۱۰۵ روپے	—	۵ روپے	۳۲ روپے	۲۵ روپے	۱۹۶۷ روپے
” بچہ ایک تا دو سال	۱۴۵۰ روپے	—	۵۶ روپے ۲۵ پیسے	۵ روپے	۳۲ روپے	—	۱۵۴۳ روپے ۲۵ پیسے
× بنک کلاس (بالغ)	۱۷۰۰ روپے	۱۰۵ روپے	—	۵ روپے	۳۲ روپے	۲۵ روپے	۱۸۶۷ روپے
” بچہ ایک تا دو سال	۱۴۲۵ روپے	—	۵۳ روپے ۲۵ پیسے	۵ روپے	۳۲ روپے	—	۱۵۱۵ روپے ۲۵ پیسے
ڈیک کلاس بالغ	۱۶۵۰ روپے	۱۰۵ روپے	—	۵ روپے	۳۲ روپے	۲۵ روپے	۱۸۱۷ روپے
” بچہ ایک تا دو سال	۱۴۱۲ روپے ۵۰ پیسے	—	۵۱ روپے ۵۰ پیسے	۵ روپے	۳۲ روپے	—	۱۵۰۱ روپے

★ یہ رقم حج ہاؤس بمبئی کی تعمیر کے سلسلے میں وصول کی جارہی ہے۔

• یہ انتظام صرف ایم وی نورجہاں میں مزید سہولتوں مثلاً آرام دہ آٹھ تا دس بستروں والے ایرکنڈیشنڈ فرسٹ کیبن کے ساتھ کیا گیا ہے

+ یہ انتظام صرف ایم وی نورجہاں میں مزید سہولتوں مثلاً آرام دہ ۶ تا ۸ بستروں والے ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ کے ساتھ کیا گیا ہے

× یہ انتظام صرف ایم وی اکبر ——— اور ایم وی نورجہاں میں مزید سہولتوں مثلاً آرام دہ ۶ تا بارہ بستروں والے کمپارٹمنٹ

کے ساتھ کیا گیا ہے۔

• یہ انتظام صرف محمدی میں ہے۔

ایک سال سے کم عمر کے بچوں سے صرف ۳۷ روپے برائے پلگرم پاس اور بی پی ٹی وغیرہ کی فیس وصول کی جائے گی۔

بچے جن کی عمر ۲ اور سولہ سال کے درمیان ہوگی ان کو حج پر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی البتہ والدین اپنے ساتھ صرف دو سال تک کی عمر کے بچے لے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسے بچوں کی عمر جہاز پر سوار ہونے کی تاریخ تک دو سال سے زیادہ نہ ہو۔ جس کے لئے متعلقہ حکام سے حاصل کردہ پیدائشی سرٹیفکیٹ درخواست کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔

پابندیاں :۔ حکومت ہند نے عازمین حج کے مفاد میں اور اُن کی بھلائی کے پیش نظر بعض پابندیاں عائد کی ہیں، لہٰذا عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان عائد کردہ پابندیوں کو اچھی طرح سمجھ کر درخواست دیں، درج ذیل عازمین کی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۱) وہ افراد جو گذشتہ پانچ سال یعنی ۱۹۷۲ تا ۱۹۷۵ کے درمیان ہندوستان کے کسی بھی حصہ سے فریضہ حج ادا کر چکے ہیں، ایسے افراد حج بدل پر بھی نہ جا سکیں گے۔

(ب) بچے جن کی عمر دو اور سولہ سال کے درمیان ہوگی۔ (ج) وہ عازمین جن کے پاس غیر ملکی زرمبادلہ ایک ہزار نو سو پچاس سعودی ریال سے کم ہوگا۔ گذشتہ سال ایک ہزار نو سو پچاس سعودی ریال برابر تھے پانچ ہزار ایک سو نو روپے کے، اس سال کی ہندوستانی رقم اس کے لگ بھگ ہی ہوگی، لیکن صحیح رقم بعد میں بتائی جائے گی۔

(د) وہ خواتین جنھیں جہاز پر سوار ہوتے وقت پانچ ماہ یا اس سے زیادہ کا حمل ہوگا۔

(س) درج ذیل بیماریوں اور معذوریوں میں مبتلا افراد :۔

(۱) دماغی امراض۔ (۲) تپ دق یا سل۔ (۳) قلبی امراض۔ (۴) شدید دمہ۔ (۵) متعدی جذام دیگر شدید متعدی بیماریاں یا جسمانی معذوری۔

(نوٹ) شدید بیماری یا کسی خاتون کے حمل پر شبہ کی حالت میں بمبئی میں ان کا طبی معائنہ کیا جائے گا، لہٰذا عازمین حج غلط بیانی سے درخواست نہ دیں۔

درخواست بھیجنے کا طریقہ ۔ حج ۱۹۷۶ کے تمام عازمین حج کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ حج کمیٹی سے بلا قیمت تقسیم کئے جانے والے نئے درخواست فارم اور ہدایات کا پرچہ حاصل کریں۔ پرانے فارم پر کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ (۱) عازمین حج جن کی درخواستیں گذشتہ پانچ سال میں

مسترد ہو چکی ہوں ان کو اعلان کے مطابق فوقیت دی جائے گی بشرطیکہ وہ گذشتہ کی نامنظور شدہ درخواستیں نئی درخواست کے ساتھ منسلک کریں۔ (۲) تمام عازمین حج اپنی درخواستیں اور کرایہ کی رقم بینک ڈرافٹ کی صورت میں حج کمیٹی بمبئی کے دفتر میں روانہ کریں۔ (۳) تمام بینک ڈرافٹ "حج کمیٹی" کے نام سے جاری کئے جائیں۔ (۴) کرایہ کی رقم کسی اور شکل میں، مثلاً منی آرڈر، بیمہ، چیک یا نقد ہرگز نہیں قبول کی جائیں گی۔ (۵) درخواست کے دونوں فارم ہر طرح سے مکمل ہونے چاہئیں، ایک سال سے کم عمر کے بچے کے علاوہ تمام عازمین حج کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ پاسپورٹ سائز کا نیا فوٹو ہر درخواست فارم پر چسپاں کریں اور مزید چار فوٹو (کل چھ فوٹو) جن کی پشت پر دستخط کنندہ کا پورا نام لکھا ہو، درخواست کے ساتھ منسلک کریں خواتین کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے چھ فوٹو مشمل مرد محرم کے درخواست فارم کے ساتھ روانہ کریں (۶) ریاست جموں و کشمیر، منی پور جزائر انڈومان و نکوبار اور لکشا دیپ سے آنے والی درخواستوں کا انتخاب ریاستی حج کمیٹی یا ایڈمنسٹریٹر کرتے ہیں لہذا ان مقامات کے عازمین حج صرف مقامی حکام کو درخواستیں دیں گے۔

درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ حج ۱۹۷۶ کے لئے مقررہ فارم پر تمام درخواستیں ہدایت کے مطابق ہر اعتبار سے مکمل اور رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعہ اس طرح روانہ کی جائیں کہ "حج کمیٹی" کے آفس میں ۱۴ راگست ۱۹۷۶ کو یا اس سے قبل پہونچ جائیں ۱۴ راگست ۱۹۷۶ کے بعد پہونچنے والی کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی بلکہ اسے بھیجنے والے کو واپس کر دیا جائے گا۔

درخواست فارم نئے جاری کردہ درخواست فارم اور ہدایت کا پرچہ برائے حج ۱۹۷۶ صرف عازمین حج کو ان کی گذارش پر حج کمیٹی مفت تقسیم کرتی ہے، عازمین حج کے لئے لازمی ہے کہ وہ حج ۱۹۷۶ کے لئے چھپے ہوئے نئے فارم کا استعمال کریں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہئے کہ درخواست فارم مہیا کرنے کی اور کرایہ کی رقم وصول کرنے یا اس طرح کا کوئی کام انجام دینے کے لئے حج کمیٹی انڈیا نے اپنا کوئی شعبہ، نمائندہ یا ایجنٹ مقرر نہیں کیا ہے۔

ضروری اور اہم اس سال سے حج کے لئے درخواستوں کی وصولی اور قرعہ وغیرہ کا پورا کام حج کمیٹی نے لے لیا ہے لہذا تمام خط و کتابت عازمین حج صرف "حج کمیٹی" سے کریں، مغل لائن سے اب خط و کتابت نہ کریں مکمل تفصیلات اور درخواست فارم کی طلب اور مزید خط و کتابت حسب ذیل پتہ پر کیجئے۔

(مذکورہ بالا معلومات حج ۱۹۷۶ کے لئے حج کمیٹی کے جاری کردہ اعلان کا اختصار ہے)

حج کمیٹی صابو صدیق مسافر خانہ

فون نمبر ۲۶۲۹۸۹

لوکمانیہ تلک مارگ

بمبئی ۴۰۰۰۰۱

مسعود حسن صدیقی
ایگزیکیٹو آفیسر

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم'۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم 'خلافتِ راشدہ'۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرمایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم 'خلافتِ بنی امیہ'

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن حصہ چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم 'خلافتِ ہسپانیہ'۔ تاریخ ملت حصہ پنجم 'خلافتِ عباسیہ اول'

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم 'خلافتِ عباسیہ دوم'۔ بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم 'تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ'۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم 'خلافتِ عثمانیہ'۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

شاہ طیب فاروقی بنارسیؒ

(م ۱۰۴۲ھ)

ایک نایاب مخطوطہ "مناقب العارفین" کی روشنی میں

از مولانا محمد ارشد اعظمی فاضل مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد۔

...ہ طیب فاروقی بنارسی قدس اللہ سرہٗ العزیز گیارھویں صدی ہجری میں سرزمین بنارس کے ...الم دین و باکرامت ولی اللہ گزرے ہیں۔ احیائے سنّت و احکامِ شریعت کے عمل و نفاذ ...ا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ ہیں۔ مگر ...ند وسطیٰ کے عام تاریخی ماخذ اس عظیم ترین ہستی کے کارناموں سے یکسر خالی ہیں شاہ طیب فاروقی ...ارسیؒ کے خلیفۂ اقدس شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ نے اپنے ملفوظات "مناقب العارفین" میں شاہ طیبؒ کے حالات و کمالات کو قدرے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ مناقب العارفین فارسی کا ایک قلمی نسخہ بحالتِ شکستہ کرم خوردہ شہر بنارس کے کتب خانہ مظہر العلوم میں موجود ہے۔ میں اپنے ذوق و کاوش سے اس کی اردو تلخیص پیش کر رہا ہوں۔ جس میں شاہ طیب فاروقی بنارسیؒ کے فضل و کمال اور آپ کے خلفاء کا مختصر تذکرہ ہے۔

خالق کائنات نے تخلیقِ آدم کے بعد ہی سے اشرف المخلوقات کو خالص اپنی عبدیت کی ...گانے اور گم گشتگانِ بادیۂ ضلالت کو اپنی معرفت کی تابانی عطا فرمانے کے لئے اپنے

برگزیدہ بندوں کو مبعوث فرمایا۔ چنانچہ ہر زمان و مکان میں کوئی نہ کوئی قدسی نفس ضرور آیا۔ جس نے اپنی مسیحائی سے باطل کے پرستاروں اور خوابِ غفلت کے متوالوں کو جھنجھوڑا اور بیدار کیا۔ یہی عبدیت اور معرفت کا نسخہ کیمیا، ہدایت و رحمت کا خزینہ لے کر آفتابِ عالم تاب رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہوئے۔ پھر اس شمعِ ہدایت کے پروانوں نے اپنے اخلاق کردار کی ضیار بار کرنوں سے سارے عالم کو جگمگایا اور اس کے بعد تو رشد و ہدایت کے چاند تارے افقِ عالم پر نمودار ہوتے ہی چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی یہی لطف و رحمت کبھی صدیقؓ و فاروقؓ بن کر نمایاں ہوئی کبھی ذی النورینؓ و شیرِ خداؓ بن کر چمکی، تو کبھی حسن بصریؒ و عمر بن عبدالعزیزؒ بن کر اُفقِ عالم پر نمودار ہوئی اور کبھی امام ابوحنیفہؒ و امام مالکؒ کے عکسِ جمیل میں جلوہ فگن ہوئی تو کبھی ابراہیم بن ادہمؒ و فضیل بن عیاضؒ بن کر سایہ زن ہوئی اور کبھی سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ و خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی ہیئتِ نورانی میں رونما ہوئی تو کبھی قطب الدین بختیار کاکیؒ و بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے ہاتھوں چشمۂ فیض بن کے رواں ہوئی اور پھر نصیرالدین چراغ دہلیؒ و نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ روحانیت میں تسکین کا پیام دے گئی اور کبھی شیخ تاج الدین جھوسویؒ اور شاہ طیب فاروقی بنارسیؒ کی مسندِ ارشاد سے گھٹا بن کے برسی اور ایک عالم کو سیراب کر گئی اور یہ بھی نظامِ قدرت تھا کہ شاہ طیب فاروقی بنارسیؒ کی خانقاہ "شریعت آباد بنارس" سے روحانیت کے تاجدار قطب الاقطاب دیوان عبدالرشید جونپوریؒ مولانا شیخ ناصر الدینؒ اور حضرت مخدوم شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ جیسے مایۂ ناز روزگار نکھر کر سنور کر اُبھرے ہیں، یہ وہ شاہ طیب ہیں جنہیں "شریعت پر کمالِ استقامت" کی دولت نصیب تھی، اور جو "در اجرائے امور شرعی بے تاب بود" کے مصداق تھے، سرزمینِ بنارس کو یہ سعادت اور فخر حاصل ہے کہ شاہ طیب فاروقیؒ جیسی یگانۂ روزگار صاحبِ فضل و کمال ہستی اس پر گذری ہے، سلفِ صالحین کے حالات، اولیاء اللہ کے تذکرے ملت کا اثاثہ اور تاریخ کا سرمایہ ہیں اسی میں ایمان و روحانیت کا درس ملے گا تعلیم و تربیت کا نمونہ ملے گا، اتحاد و یکجہتی کا پیام ملے گا، سرور و محبت کا کیف آور جام ملے گا، یہ مردانِ حق آگاہ وہ ہیں جن کی بارگاہِ عالی سے اہلِ دنیا

کو انسانیت کا پیام مِلا، توحید و معرفت کا پیغام ملا، اور شاہ طیب بنارسیؒ بے شک اُنھیں مردانِ حق آگاہ میں سے ہیں آج کی بزمِ نورانی میں آپ ہی کا تذکرۂ نذریں موضوعِ سخن ہے، عام مؤرخین کے تاریخی مآخذ آپ کے تذکرہ سے خالی ہیں مگر شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ اپنے ملفوظات "مناقب العارفین" فارسی قلمی میں آپ کو بایں القاب و آداب نذرانۂ عقیدت پیش فرماتے ہیں کہ "شیخ الاسلام والمسلمین شیخی و مولائی و مقتدا العالمین حضرت شیخ طیب بن معین الدین البنارسی آں فردِ یگانہ آں غوثِ زمانہ آں جامع معانی و دقائق آں منبع اسرارِ حقائق آں نہنگ دریائے شریعت آں شیر بیشۂ طریقت آں شاہبازِ عالم ملکوت آں بلند پرواز بفضائے لاہوت الخ[1] ۔ شاہ

(۱) ولادت و نسب طیب بنارسیؒ کا سلسلۂ نسب امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے شاہ صاحبؒ کے جدِ اعلیٰ حضرت شیخ[2] قطب فاروقیؒ سرزمینِ عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور موضع "بہتری" ضلع غازی پور میں سکونت اختیار فرمائی اور اسی جگہ آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ خلیل فاروقیؒ کی ولادت ہوئی، شیخ خلیل فاروقی جب جوان ہوئے تو ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں "منجھوارہ" چلے آئے اور یہیں رہ پڑے، آپ کے دو[3] پوتے حضرت شیخ فرید قطب فاروقیؒ اور حضرت شیخ داؤد قطب فاروقیؒ تحصیلِ علم کی غرض سے بنارس آئے تو تکمیلِ علوم کے بعد بنارس ہی کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں شادی وغیرہ بھی کرلی، حضرت شیخ قطب فاروقیؒ کی اولاد

---

[1] مناقب العارفین فارسی قلمی ص ۳

[2] مولانا عبدالسلام نعمانی بنارسی نے اپنی کتاب "مشائخ بنارس" میں شاہ طیب فاروقی بنارسیؒ کے . . . . جدِ اعلیٰ کے بارے میں لکھا ہے کہ "آپ کے جدِ اعلیٰ شیخ ولایت عرب کی طرف سے ہندوستان تشریف لائے (ص ۳۲)" جب کہ مناقب العارفین ص ۴ پر صاف طور سے یہ لکھا ہوا ہے کہ "جدِ اعلیٰ وی قدوۃ الصالحین زبدۃ المتورعین شیخ خلیل فاروقی از جانب زمین عرب بایں ولایت تشریف آوردہ" (ص ۴۔ تشریف کا نقطہ کرم خوردہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "شریف" ہے حالانکہ غور و فکر کے بعد "تشریف" معلوم ہوتا ہے) اب نہ معلوم کن مآخذ کی بنیاد پر مولانا نعمانی نے یہ کیسی تاریخ بیانی میں جدِ اعلیٰ "شیخ ولایت" کو ٹھہرا دیا ہے اس کا کوئی حوالہ درج نہیں ہے، مولانا کی تحریر میں کوئی تاویل بھی نہیں ہوسکتی ہے کیوں کہ جدِ اعلیٰ کے بعد اور ولایت سے قبل "شیخ" کا لفظ موجود ہے لہذا یہ اضافۂ شیخ تاویل کی راہ جواز بھی متعین نہیں کرسکتا، اغلب یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام نعمانی صاحب سے یہاں فہم عبارت میں چوک ہوئی ہے، محمد ارشد عفا اللہ عنہ۔

چونکہ زیادہ ہوگئیں اور سب ہی نے مضافات غازی پور و مقامات اعظم گڈھ و بنارس میں بود و باش اختیار کرلی، اسی طرح شیخ فرید و شیخ داؤدؒ سے بنارس میں جو سلسلۂ اولاد چلا اُن میں حضرت شاہ طیب فاروقی بنارسیؒ حضرت شیخ داؤدؒ کی ہی اولاد میں اُن کے پرپوتے ہیں نسب نامہ یوں ملتا ہے شاہ طیب بنارسیؒ بن شیخ معین الدینؒ ابن حضرت شاہ حسن داؤدؒ بن شیخ داؤدؒ[1] تاریخ ولادت و سن کی نشان دہی نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ کے والد ماجد حضرت شیخ معین الدینؒ نے تینتیسؔ سال کی عمر میں وصال فرمایا اُس وقت شاہ طیبؒ کی عمر شریف دسؔ سال کی تھی، والدہ ماجدہ بقید حیات تھیں مگر پرورش آپ کی پھوپھی صاحبہ نے فرمائی۔ جب حضرت شاہ طیب بنارسیؒ کے والد محترم شیخ معین الدینؒ

(۲) تعلیم و تربیت کی رحلت ہوئی تو اُس وقت شاہ صاحبؒ قرآن پاک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس سے فراغت کے بعد فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں، اِسی درمیان بنارس ہی کے اُستاذ الفضلاء شیخ نظام الدین بنارسیؒ کی درسگاہ میں حاضر ہوگئے اور صرف و نحو کی کتابوں کا درس لیا، شیخ نظام الدینؒ اپنے یہاں تحصیل علم کے دوران شاہ طیب بنارسیؒ کے طور وطریق انداز وضع کو بہت پسند فرماتے تھے اور غایت درجہ نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے، اور اُستاذ الفضلاءؒ اکثر شاہ طیبؒ کی طرف متوجہ ہوکر فرماتے کہ "اس لڑکے سے مشیخت کی بُو آتی ہے، ایک عالَم اس کے انوار و برکات سے حصہ پائے گا اور اس کا خاندان اس کی ذات سے روشن ہوگا"[2] بچپن میں اکثر لوگوں نے تہجد کے وقت شاہ طیبؒ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سُنا ہے ؎

گر صد ہزاراں قرن ہمہ خلق کائنات | فکرت کنند در صفت و ذات اے خدا
آخر بعجز معترف آیند کہ اے الٰہ | دانستہ شد کہ ہیچ ندانستہ ایم ما

[1] مناقب العارفین ص ۴ - و ۸۸ - ۸۹ -

[2] مناقب العارفین ص ۴ -

(ترجمہ :- اے اللہ اگر آپ کی ذات وصفات میں کائنات کی ساری مخلوق
سیکڑوں ہزاروں صدیوں تک بھی غور کرتی رہے تو آخرکار وہ عاجز ہو کر اعتراف
کرے گی کہ اے اللہ ؟ یہی جانا گیا کہ اب تک ہم لوگوں نے کچھ نہیں جانا -)

یہ اشعار آپ پڑھا کرتے اور چشم اشکبار رہا کرتی اِسی حالت میں صبح ہو جاتی اور نماز کا وقت آجاتا، شیخ نظام الدین بنارسیؒ کی درس گاہ سے فراغت کے بعد شیراز ہند جونپور تشریف لے گئے اور افضل العصر شیخ نور اللہ انصاری ہرویؒ[1] کی خدمت اقدس میں رہ کر شرح وقایہ، حسامی، رفقہ، اصولِ فقہ کی کتابوں کو مکمل فرمایا[2] ایام طالب علمی ہی میں باطنی (۳) احسان وتصوف | صلاحیت اور روحانی استعداد نکھرتی اور سنورتی معلوم ہونے لگی تھی وہ بایں طور کہ جب شاہ طیّب بنارسیؒ شیراز ہند جونپور میں شیخ نور اللہ کے دریائے علم سے اپنی تشنگی بجھا رہے تھے ناگہاں شیخ وقت مرشد طریقت مخدوم العلما حضرت مولانا خواجہ کلاںؒ[3]

---

[1] شیخ نور اللہ انصاریؒ حضرت ملا عبد الجلیل جونپوریؒ کے برادرِ خورد اور تلمیذ تھے، علماء میں افضل تھے، علمِ ظاہر و باطن میں فاضل وکامل تھے، ہمیشہ مطالعہ کتب و درس وتدریس میں مشغول رہتے، کمالاتِ علمی میں آپ کی شہرت تمام جگہ تھی، سلطنتِ اورنگ زیبؒ میں مختلف صوبوں کی صدارت فرمائی، ۱۱۰۲ھ میں آپ نے وفات پائی مزار جونپور میں ہے (تاریخ شیرازِ ہند جون پور ص ۷۱۸)

[2] مناقب العارفین ص ۴ -

[3] مولانا خواجہ کلاں جھوسوی الہ آبادیؒ اسد العلما حضرت شیخ نصر الدین جھوسویؒ کے صاحبزادے ہیں صدیقی الاصل ہیں، شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ بایں القاب آپ کا تذکرہ فرماتے ہیں "آں قدوۂ مشائخ زماں، آں امام علمائے جہاں، استادِ اربابِ شریعت، آں مرشدِ اصحابِ طریقت، آں کاشفِ اسرارِ حقیقت، آں موصوف بخلق احسان، آں قبلۂ اہلِ زمین وزمان الخ"، صرف ونحو اصولِ فقہ وفقہ کی اکثر کتابیں اپنے والد حضرت شیخ نصر الدین اسد العلماءؒ سے پڑھیں اصولِ فقہ کی مشہور ترین کتاب "حسامی" کی تعلیم جب اپنے والد اسد العلماءؒ سے حاصل کر رہے تھے تو ایک جوانمرد فاضل اور شیر شاہ سوری کا مقرب جن کا نام نامی "شیخ پیارے" تھا اسد العلماءؒ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تو مولانا خواجہ کلاںؒ کے ہاتھ میں "حسامی" دیکھا شیخ پیارے نے دریافت کیا کہ، آپ حسامی پڑھتے ہیں ؟ خواجہ کلاںؒ نے جواب دیا کہ ہاں ! شیخ فاضل پیارے نے کچھ اصولی سوالات حسامی سے کئے، مولانا خواجہ کلاںؒ جواب نہیں دے سکے اس لئے کہ تعلیم میں منہمک نہیں

اور آپ کے خلیفۂ اقدس سراج السالکین امام العارفین شیخ تاج الدین[1] جھوسویؒ دونوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رہتے تھے بلکہ شہزادگی اور پیرزادگی کے اثرات نمایاں تھے، اسد العلماء شیخ نصیر الدینؒ نے جب دیکھا کہ خواجہ کلاںؒ جواب نہیں دے سکے تو شیخ پیارے کے اُن ہی سوالات پر اشکالات و اعتراضات کی طوفانی بارش کر دی جس سے مناظرہ کی فضا پیدا ہو گئی اور خواجہ کلاں کی طرف سے توجہ ہٹ کر گفتگو تے باہمی مرکز ہو گئی مسلسل تین گھنٹہ کی مناظرہ بازی کے بعد مطلب حقیقی پر اتفاق ہوا [ارے تو والد محترم حضرت شیخ نصیر الدینؒ کا لقب بھی تو اسد العلماء تھا] پھر ما حضر کے تناول اور طعام سے فراغت کے بعد شیخ پیارے تشریف لے گئے، اسد العلماء نے مولانا خواجہ کلاںؒ سے فرمایا کہ "خوب عزتِ ما نگہداشتی"؟ خواجہ کلاں نے اُس وقت تو کوئی جواب نہیں دیا مگر تھوڑی دیر کے بعد والد صاحبؒ سے فرمایا کہ "گھر پر آرام و راحت کی وجہ سے تعلیم میں جد و جہد ہو ہی نہیں سکتی (اگرچہ تعلیمی سہولت یہاں پر میسر ہے) مجھے آپ جونپور رخصت کر دیجئے میں وہاں جا کر تعلیم میں محنت کروں گا" اس جواب سے اسد العلماء خوش ہوئے اور دعا دی فرمایا کہ :- جہاں تمہارا دل لگے شفیق اُستاذ ملے وہاں جا سکتے ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے عزیز اوقات کو کھیل کود اور بے کاری میں مت گنوانا" اب مولانا خواجہ کلاں جونپور کے لئے روانہ ہو گئے مگر جونپور میں طبیعت لگتی ہی نہیں تھی تو وہاں سے شاہ پور چلے گئے وہاں افضل الوقت قاضی بیاری [کتاب میں بیاری عبارت لکھا ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ پیارے ہو یا قدیم رسم الخط کے مطابق بہاری ہو] درگاہ میں از سر نو تعلیم حاصل کی کافیہ، حاشیہ کافیہ، معانی، فقہ، اصول فقہ سب کتابیں پڑھیں اور خوب محنت کی، تقریباً پانچ سال کے بعد والد صاحب کی خدمت گرامی میں تشریف لائے اتفاقاً پھر وہی صاحب "شیخ پیارے" شیر شاہ سوری کے مقرب اور فاضل گرامی، حضرت اسد العلماء کی ملاقات و زیارت کے لئے وارد ہو گئے مولانا خواجہ کلاںؒ موجود ہی تھے پھر کچھ سوالات کر دئیے "این مرتبہ وی چوں بحر امواج در جوش آمدہ و جواب شروع نمود آں فاضل متبحر تقریر وی شدہ در لجۂ حیرت اُفتاد"، مولانا خواجہ کلاں اس بار ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح جوش میں آگئے اور جواب کی ایسی تقریر فرمائی کہ "فاضل شیخ پیارے" بحر حیرت کی بے انتہاء گہرائی میں غرق ہو گئے، مولانا خواجہ کلاںؒ نے شیخ پیارے کو خاموش کر دیا آگے وہ بات نہیں کر سکے، لیکن انھوں نے اعتراف حقیقت کی بنیاد پر خواجہ کلاں کو آفریں اور شادباشی دی اس بار تو اسد العلماء بھی خوش ہو گئے۔ مولانا کلاں کو شرف ارادت و عقیدت تو حضرت شیخ حبیب اللہؒ سے حاصل ہے [جو شاہ طیب بنارسیؒ کے پردادا حضرت شیخ قطب فاروقیؒ اور شاہ طیبؒ کے حقیقی دادا حضرت شاہ حسن داؤدؒ کے خلیفہ تھے] مگر اسد العلماء کی آغوش تربیت میں باطنی صلاحیت نکھری ہے، خرقہ اور خلافت اپنے والد اسد العلماء ہی سے پایا ہے، مولانا کلاں عابد و زاہد تھے خُلقِ عظیم سے متصف تھے طبیعت میں سلامتی تھی، اکثر و بیشتر فقراء کی خدمت میں مصروف رہتے تھے، مشاہدہ اور استغراق کی کیفیت اس قدر غالب تھی کہ وعظ و نصیحت جیسے امور میں نہیں مشغول ہو سکے، اسّی سال کی عمر پائی، جمعہ کے دن ۱۰۳۰ھ میں ذکر اللہ کرتے ہوئے واصل بحق ہو گئے، انا للہ الخ، آپ کے خلیفہ حضرت شیخ تاج الدین جھوسویؒ نے آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی نعش شریف کو والد گرامی حضرت شیخ نصیر الدین اسد العلماء کے پہلوئے مبارک میں جھوسی الہ آباد ہی میں دفن فرمایا، مناقب العارفین ص ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۵، ۶۶۔

---

[1] حضرت شیخ تاج الدین جھوسویؒ بھی صدیقی الاصل ہیں، مولانا خواجہ کلاںؒ کے برادر عم ہیں والد مکرم کا نام نامی شیخ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جونپور تشریف لے گئے، اور مولانا خواجہ کلاںؒ سے شاہ طیبؒ کو آغاز طالب علمی ہی سے عقیدت و محبت تھی، چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو ارادت کی آتش شوق بھڑک اٹھی، شاہ طیبؒ نے خواجہ کلاںؒ سے اپنی واردات و کیفیات بیان کیں اور بیعت کی درخواست کی، مولانا خواجہ کلاںؒ کی نگاہِ حقیقت شناس نے دیکھا کہ یہ جوہر قابل ہے چنانچہ مائل بہ کرم ہوتے اور بزرگانہ شفقتوں سے نواز کر اپنے سلسلۂ زریں میں داخل فرما کر اجازت بھی مرحمت فرما دی[1]

مولانا کلاںؒ کی محبت و شفقت کے اثرات اور آپ سے بیعت ہونے کا شرف، بعد میں پیدا ہونے والی کیفیات و حالات کو شاہ طیب بنارسیؒ نے خود اپنی زبانی اپنے خلیفہ و خادم خاص شاہ محمد لیسینؒ سے اس طرح بیان فرمایا کہ :- میری خواہش ایک عرصہ سے یہ بھی کہ اپنے جدِ محترم حضرت شاہ حسن داؤد نا ردقی بنارسیؒ کے کسی خلیفہ سے بیعت کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) منہاج الدینؒ ہے صالح اور متقی تھے، شیخ تاج الدینؒ کی والدہ ماجدہ آپ کے بچپن ہی میں انتقال فرما گئی تھیں، اس لئے مولانا خواجہ کلاںؒ نے آپ کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، اور بہت ہی محبت و شفقت سے پرورش کیا، والدِ محترم شیخ منہاج الدینؒ کے ایماء پر صغر سنی ہی میں حضرت سید رکن الدین ابو الفتح فیض اللہ ظفر آبادیؒ سے شرفِ ارادت حاصل کر لیا تھا، سن بلوغ کو پہنچنے تک قرآن مجید و کتب فارسیہ کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور رسائل صرف وغیرہ اسد العلماء حضرت شیخ نصیر الدینؒ سے پڑھا پھر شیراز ہند جونپور تشریف لے گئے وہاں شیخ نور النصر انصاری ہرویؒ سے بقیہ علوم کی تکمیل فرمائی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے خزانۂ رحمت سے علم لدنی بھی عطا فرمایا تھا، جتنے علوم آپ حاصل کرتے گئے سب کے دروازے آپ پر بہت جلد کھلتے چلے گئے، بے نظیر قوتِ حافظہ پائی تھی، شیخ ابو الفتح ظفر آبادیؒ سے مرید تھے ہی مولانا خواجہ کلاںؒ کی تربیت و تزکیہ نے اوجِ کمال پر پہنچا دیا، دونوں باکرامت ہستیوں کی خصوصی توجہ گرامی نے شیخ تاج الدینؒ کی ذات اعلیٰ صفات کو درخشندہ و تابندہ بنا دیا تھا اس لئے دونوں ہی بزرگانِ دین نے آپ کو خلافت عطا فرما کر خلقِ خدا کی رشد و ہدایت کے لئے ولایت جھوسی الہ آباد پر مامور فرمایا وہیں سے آپ نے دینِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت فرمائی، اور ہزاروں نے آپ سے راہِ ہدایت پائی، بادشاہ عالمگیر کے عہد میں [illegible]ھ میں آپ کی وفات ہوئی، مزارِ مبارک جھوسی (ضلع الہ آباد) میں ہے۔ مناقب العارفین ص ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۵۷، ۶۴، ۶۵، تاریخ شیراز ہند جونپور ص ۹۷۹، ۹۸۰۔

[1] مناقب العارفین ص ۵،

سعادت اور روحانیت کی حقیقی دولت ملے چنانچہ وہ آج نصیب ہوئی کہ شاہ حسن
داؤد فاروقیؒ میرے حقیقی دادا ہیں اور اُن کے خلیفۂ گرامی حضرت مولانا خواجہ کلاں جھوسویؒ
ہیں، مگر اس دشتِ محبت میں قدم رکھنے کے بعد ہی سے یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ دل دنیا
سے اُچاٹ ہوگیا، ریاضاتِ شاقہ کی دشوار گذار گھاٹیاں سامنے آئیں اور اُنھیں پار
کرنا پڑا، اکثر سرسبز و شاداب باغات کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں طبیعت سکون
پاتی یا پھر گوشۂ عزلت میں لطف ملتا، ذکراللہ کا سرور، عشقِ خداوندی کا کیف محسوس
ہونے لگا، دیوانگی اور مستانگی کی یہ حالت ہوگئی کہ دل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے،
اور قرآنِ پاک کی کثرت کی طرف رغبت پیدا ہوگئی میں ان ہی حالات سے دوچار تھا
کہ میرے بعض احباب نے حج بیت اللہ کے لئے رختِ سفر باندھا مجھے بھی داعیہ ہوا
اور تیاری کے بعد چل نکلنے والا ہی تھا کہ یک بیک الہامِ ربّانی ہوا کہ " ابھی آپ حج بیت اللہ
اور طوافِ کعبہ کے لائق نہیں ہیں پہلے کسی مرشدِ طریقت اور اللہ والے کے پاس رہ کر معرفت
کی تابانی حاصل کیجئے جب مکین کا عرفان نصیب ہوجائے تو زیارتِ مکاں اور اس
عظیم سفر کا قصد فرمایئے " جب اس حقیقت کا انکشاف ہوا تو سفرِ حج ملتوی کردیا۔
اور والدہ صاحبہ و پھوپھی صاحبہ سے رخصت و اجازت لے کر محلہ شیخ پورہ قصبہ جھوسی ضلع الٰہ آباد
کا قصد کیا اور حضرت مولانا خواجہ کلاںؒ کی بارگاہِ عالی میں شرفیاب و قدمبوس ہوا۔ اور حقیقتِ
حال بیان کی۔ مولانا بہت خوش ہوئے۔ اور تسلّی و دلجوئی فرمائی۔ اس بار حاضری میں حضرت
شیخ تاج الدین جھوسویؒ بھی شیخ پورہ حضرت خواجہ کے یہاں تشریف فرما تھے۔ اور آپ سے بھی
طالب علمی ہی کے ایام سے تعارف و ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ خدمتِ اقدس میں
گیا تو بہت توجہ فرمائی۔ اور لطف و مہربانی سے پیش آئے۔ اس مرتبہ کی حاضری
میں چند روز مقیم رہ کر مستفیض ہوا۔ اور بنارس واپس چلا آیا۔ مگر دل بے قرار رہا۔
ملاقات کی آتشِ شوق تیز تر ہوگئی۔ اور پھر جلد ہی شیخ پورہ جھوسی روانہ ہوگیا۔ لیکن اس

دفعہ لباس فقیرانہ یعنی لنگی اور کلاہ زیب تن کئے ہوئے پیدل ہی چلا اور دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جب ان دونوں اللہ والوں نے مجھے دیکھا تو بہت ہی مسرور ہوئے اور بشارتیں سنائیں۔ اس بار میں نے بھی طویل قیام کیا۔ کبھی مولانا خواجہ کلاں سے مستفید ہوتا اور کبھی شیخ تاج الدین سے فیضیاب ہوتا۔ غرضیکہ اس طرح ایک عرصہ تک آمد ورفت و استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ منڈواڈیہہ سے شیخ پورہ حاضری میں کم وبیش ایک شب و روز صرف ہوتا۔ خدمتِ شیخ میں باریابی کی دھن اور لگن ایسی ہوتی کہ اثنائے راہ میں نہ کہیں آرام کرتا نہ کچھ کھاتا پیتا۔ صرف نماز پنجگانہ کی ادائیگی ہی کے لئے راہ میں توقف کرتا۔ دل کو قرار، راحت وطعام کا لطف تو شیخ کے قدموں ہی میں میسر آتا۔ شیخ تاج الدین جھوسوی سے متعلق ہونے کے بعد سے ہی میرے تزکیۂ باطن میں پوری طرح متوجہ اور مصروف تھے۔ ایک سال رمضان المبارک کے موقع پر حاضری ہوئی تو آخیر عشرۂ رمضان میں اسد العلماء حضرت شیخ نصر الدین کے روضۂ اقدس کے پاس اعتکاف کا حکم فرمایا۔ اس مرتبہ اپنی توجہ تام سے ترقی کی شاہراہ دکھادی۔ اور عید کے روز خواجگانِ چشت کا پیراہنِ خاص اور دیگر اذکار وادعیہ کی تلقین فرما کر تکمیل کردی اور خلافت واجازت عطا فرمائی۔ پھر بنارس رخصت فرمایا۔ یعنی ولایتِ بنارس میں رشد وہدایت کے منصب پر فائز کیا گیا۔ شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ اب جھوسی کا سفر کم سے کم کریں۔ طالبا دین کی خدمت اور سالکان راہِ خدا کی تربیت میں مشغول رہیں۔ میں بنارس خود ہی آیا کروں گا۔[1]

شاہ طیب بنارسیؒ کو اعمال واوراد کی اجازت۔

(۴)۔ سفر دہلی | حضرت مولانا خواجہ کلاں جھوسویؒ اور سلاسلِ سہروردیہ وقادریہ کی اجازت و خلافت شیخ تاج الدین جھوسویؒ سے حاصل تھی، ان کمالات کی تحصیل کے بعد مشائخِ طریقت کی زیارت کے لئے دہلی کا سفر فرمایا۔ اُس وقت وہاں پر حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی

---

[1] مناقب العارفین ص ۷-۸-۹-۱۰۔

قدس اللہ سرہٗ مرجع عوام وخواص تھے اللہ کی ایک مخلوق آپ کے علوم اور روحانیت کے
دریائے ناپیداکنار سے مستفیض و سیراب ہو رہی تھی شاہ طیب بنارسیؒ بھی حضرت محدث
دہلویؒ کی خدمتِ گرامی میں حاضر ہوئے اور استفادہ فرمایا شیخ محدث دہلویؒ نے سلسلۂ قادریہ
کی خلافت واجازت بھی شاہ طیب بنارسیؒ کو عطا فرمائی[1]

(۵) شجرۂ بیعت | حضرت شاہ طیب بنارسیؒ کے ارادت وخلافت کا سلسلہ وشجرہ اس طرح ہے،
شاہ طیب بنارسی من شیخہ تاج الدین جھوسوی من شیخہ مولانا خواجہ کلاں من شیخہ وابیہ اسد العلماء
نصر الدین جھوسوی من شیخہ شاہ حسن داؤد بنارسی من شیخہ وعمہ شیخ فرید قطب بنارسی من شیخہ خواجہ
مبارک سوندھو بنارسی من شیخہ مخدوم محمد عیسیٰ تاج جونپوری من شیخہ شیخ فتح اللہ اودھی من شیخہ شیخ
صدر الدین طبیب من شیخہ شیخ محمد نصیر الدین محمود چراغ دہلی من شیخہ سلطان المشائخ نظام الدین
اولیاء قدس اللہ اسرارہم الی آخرہم۔

(۶) نکاح | شاہ طیب بنارسیؒ خلوت پسند تھے، الگ تھلگ رہنے والا ذوق پایا تھا، مگر احباب
وارباب حقوق نے آپ کی تنہائی کو پسند نہیں کیا بلکہ نکاح والی زندگی کو ترجیح دی تو شاہ طیب بنارسیؒ
نے بھی اتباعِ سنت میں نکاح فرمایا[2]، جب مولانا خواجہ کلاںؒ اور شیخ تاج الدین جھوسویؒ نے

(۷) مسندِ ارشاد | حضرت شاہ طیب بنارسیؒ کو اجازت وخلافت سے نواز کر سرزمین بنارس
کی طرف رخصت فرمایا تو شاہ صاحبؒ "منڈواڈیہہ" تشریف لائے اور کچھ مدت یہیں قیام
فرمایا مگر جب جمعیتِ خاطر وہاں نصیب نہیں ہوئی تو آپ نے گنگا وجمنا کے سنگم اور
پرانے قلعہ کے قریب کھنڈرات میں خانقاہ تعمیر کرائی اور وہیں مسندِ ارشاد پر متمکن ہوتے، عبادات
وریاضات کو اپنا معمول بنایا، خدام ومعتقدین نے بھی کسبِ فیض اور قربتِ شیخ کے پیشِ نظر
خانقاہ کے قریب ہی مکانات تعمیر کرکے وہیں آباد ہوگئے[3]، اس جگہ کا نام شاہ طیبؒ نے
"شریعت آباد" رکھا[4]، برنا ندی کے اس پار منڈوویہ گاؤں اسی نام سے آباد ہے بنارس کے قدیم ترین

لہ ۲ے ۳ے ۴ے مناقب العارفین ص ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

اور معمر باشندے اس کی نشاندہی کرتے ہیں،

(۸) کمالات و کارنامے | اوائل میں شاہ طیب بنارسیؒ کو سماع کا ذوق تھا صالح قوال ہمراہ رہتے تھے مگر بعد میں باختیار خود اس کو ترک فرما دیا اور اس سے پرہیز کرنے لگے، ارشاد فرماتے کہ:- اب اس دور میں سماع نہیں سننا چاہیے وہ اپنی کسی شرط پر باقی نہیں رہا، موافق یاران طریقت نہیں رہے قوالوں میں طمع پیدا ہو گئی ہے، فاسد حالات پیدا ہو گئے ہیں اس بنیاد پر یہ چیز طریقۂ صوفیاء و فقراء کے خلاف ہے، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ: -الآن اسمع من اللّٰہ ولا محتاج الی السماع[1]"۔ شاہ طیبؒ کو شریعتِ مقدسہ پر کمال استقامت کا درجہ حاصل تھا احکام شرع کے جاری کرنے میں بے تاب رہتے تھے، خلاف ورزی اور نافرمانیٔ اسلام کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، وہ بدعات و خرافات جو اُس وقت بنارس میں شیوع پذیر ہو گئی تھیں اُن سب کا آپ نے قلع قمع فرمایا- ایسی ایسی قبیح رسمیں مسلمانانِ بنارس میں اس دور میں موجود تھیں کہ اللہ کی پناہ -وہ رسومات خود بذاتہ اس طرف مشیر ہیں کہ ان کا وجود و جواز اسلام جیسے پاکیزہ مذہب میں کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا - رسوماتِ نکاح ، رسوماتِ جلوہ و نقارہ و دہل وغیرہ مزامیر کا عمومی استعمال ، لڑکی کی پیدائش میں بدترین خرافات ، مصائب کے ایام میں مصیبت زدہ کے مکان پر عوام و خواص کا اجتماع ، چالیس روز تک مصیبت زدہ کے گھر پر جمع رہنا- اور زمین ہی پر خصوصیت سے سونا، دسویں، بیسویں، چالیسویں، کا پُر تکلف کھانا پکوا کر صاحبِ حادثہ کی پریشانی میں اضافہ در اضافہ کا سبب بننا، مگر شاہ طیب بنارسیؒ کے مجاہدانہ کارناموں میں سے یہ ایک زریں کارنامہ ہے کہ اپنے رشد و ہدایت کے دورِ سعید میں ان تمام قبیح ترین رسومات و بدترین بدعات سے بنارس کی سرزمین کو پاک و صاف فرمایا- شاہ طیبؒ کی منجملہ کرامات کے ایک کرامت یہ بھی تھی کہ اہلِ بدعت اور خواہشاتِ نفسانی

---

[1] مناقب العارفین ص ۱۳- مولانا عبد السلام نعمانی کہتے ہیں کہ سماع سے اسی توبہ کا اثر ہے کہ آج تک آپ کے سلسلہ میں موقوف ہے اور اس سلسلہ میں کوئی قوالی نہیں سنتا فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک مشائخ بنارس ص ۳۶

کے پرستار جان ودل سے آپ کی بات سنتے تھے آپ کے حکم کی فرمانبرداری شوق وذوق سے
کرتے تھے شاہ صاحبؒ کی مخالفت کے درپے نہیں ہوتے تھے ابتداء احوال میں تو اہل بدعات
کے ساتھ بہت ہی شدید تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں رسوخ تام حاصل
تھا اسی لئے ان امور کی انجام دہی میں بے اختیار ہو جاتے تھے، اگر کسی نے ڈھول یا مزامیر استعمال
کیا اور اس کی آواز سن لی تو فوراً جا کر توڑ ڈالتے، اگر کسی کو نماز فجر کے وقت سوتا ہوا پاتے تو اس
کے منہ پر پانی ڈال دیتے یا عصا ہوتا تو اس سے جگا دیتے یا مار دیتے[1]"۔ شاہ طیب بنارسیؒ
کو تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا، آپ نے فقہ وتصوف کے مسائل جمع کر کے ایک
ضخیم کتاب "صلوٰۃ طیبی" تحریر فرمائی، چنانچہ مولانا رضا علی بنارسیؒ (م ۱۳۱۲ھ) نے اپنے
اکثر فتاویٰ میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے "فیوض الرضا" میں ایک جگہ اس طرح لکھا ہوا ہے "قال
العالم العامل العارف الکامل الفقیہ المحقق المدقق الشیخ الطیب البنارسی
فی الصلوٰۃ الطیبی[2] الخ" شاہ طیبؒ جمعہ کی نماز اکبر بادشاہ کی تعمیر کردہ مسجد گیان باپی
میں ادا فرماتے تھے اور منڈواڈیہہ سے گیان باپی اسی مقصد سے تشریف لاتے تھے ایک بار کا
واقعہ ہے کہ خطیب نے خطبہ میں اکبر بادشاہ کا نام لیا، شاہ طیب نے جوش میں آکر فرمایا کہ:-
خطبہ میں کافر کا نام لیتا ہے؟" اور خطیب کو منبر سے اتار دینا چاہا، اتفاق وقت سے مولانا
خواجہ کلاںؒ اور شیخ تاج الدین جھوسویؒ بھی وہاں موجود تھے شہر کے قاضی اور حکام شاہ طیب
بنارسیؒ کے رعب وجلال کی وجہ سے آپ سے تو کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے ہاں ان دونوں
بزرگوں سے ہمت کر کے کہا کہ ہم لوگ بادشاہ کے نوکر ہیں اگر اس کو نام نہ لینے کی خبر لگ جائیگی
تو ہمارے مکانات کو تاراج کر دے گا اس گفتگو کے بعد مولانا خواجہ کلاںؒ نے شاہ طیبؒ کو ہدایت
فرمادی کہ موجودہ دور میں چونکہ بادشاہ کافر ہے اس لئے اب نماز جمعہ منڈواڈیہہ ہی میں ادا کر لی

---

[1] مناقب العارفین ص ۱۳-۴۲-۴۳-

[2] فیوض الرضا ج ۱ ص ۵۳

جایا کرتے، شریعت آباد گاؤں جسے شاہ طیبؒ نے خود ہی آباد فرمایا تھا زیادہ تر قیام آپ اُسی میں فرماتے اپنی خانقاہ میں طالبین کی تربیت فقراء کی خدمت میں مشغول رہتے، متوکل و قناعت پسند تھے، ایمان واحسان کی راہ میں پیش آنے والے سارے ہی مصائب وآلام خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے فاقہ کی بھی نوبت آتی، یاران طریقت سبزی، ترکاری، جنگلی میوہ ہی کھا کر رہ جاتے اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی رزق عطا فرماتا اُسی پر صابر وشاکر رہتے، ایک مدت کے بعد جب اللہ رب العزت نے شاہ صاحبؒ پر فتوحات کے دروازے کھولے ہیں تو انعامات خداوندی کی بارش ہونے لگی، مخلص احباب ومریدین کے ہدایا وتحائف آنے لگے، اُن تحائف وہدایا کے معاملہ میں بھی شاہ طیب کا عجیب وغریب انداز ونظام تھا، کہ اولیں بار متعارف ہونے والے اگر کچھ پیش کرتے تو اس کو قبول نہیں کرتے تھے۔ امراء ومالداروں کے عطایا وہدایا تو کبھی قبول ہی نہیں کئے۔ ہمیشہ رد ہی کیا ہاں محب مخلص مرید وجاں نثار جو ہوتا اس کی پیش کردہ اشیاء کو ضرور شرفِ قبولیت بخشتے۔ اور اس میں نصف خالص اپنے ذاتی اخراجات کے لئے مخصوص فرماتے۔ اور نصف کو خانقاہ کے مہمانوں، فقراء، مسافرین وغیرہ پر صرف فرماتے۔ شاہ طیبؒ بہت ہی خلیق ورحمدل انسان تھے۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقِ زار تھے۔ آپ کی بارگاہ میں تو رحمتِ الٰہی برستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی سائل ومحتاج خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا واردین وصادرین خانقاہ کی دلجوئی اور تسلی کرتے کمال توجہ سے پیش آتے۔ شاہ محمد لیسینؒ کہتے ہیں کہ: شاہ طیب بنارسیؒ فقراء واغنیاء کی جائے پناہ تھے۔ علماء وصلحاء کا مرجع تھے۔ مساکین کی تکیہ گاہ، مسافروں وغریبوں کی پشت پناہ تھے۔ ہر عاجز ودرد مند کی اشک شوئی ہر ضعیف وناتواں کے غم میں شرکت آپ کا شیوہ تھا۔ کبھی بھی کسی دنیادار عہدے دار یا حاکم وبادشاہ کے پاس نہیں گئے مگر جس کسی مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ کی حاجت روائی کے لئے

۱؎ ۔ مشائخ بنارس ص ۳۷ ۔

اضافہ فرمادیا۔ سب نے بخوشی اس کو پورا کیا۔ تقسیم وراثت میں کچھ جائداد بھی شاہ طیب رح کو ملی تھی مگر آپ نے اس اختلافی اور پریشان کن چیز کی طرف توجہ نہیں فرمائی بس خالص اللہ کے لئے ہوگئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی آپ کا ہوگیا تھا[1]۔ طالب علموں کی ایک جماعت ہمہ دم آپ کے پاس رہا کرتی جسے آپ علومِ دینیہ وکتب متداولہ کا درس دیتے۔ اور ان سے بہت محبت وشفقت فرماتے[2]

معمولاتِ شب وروز | شاہ صاحب رح کے معمولاتِ شب وروز اس طرح سے تھے کہ نمازِ فجر کے بعد جائے نماز پر بیٹھکر یا حجرۂ مقدسہ میں جاکر اوراد و وظائف میں معروف ہوجاتے مراقبہ فرماتے۔ نماز اشراق کے بعد تلاوتِ قرآن میں لگ جاتے۔ قرآن ہفتہ یا عشرہ میں ایک ختم فرماتے۔ زوال کے وقت سے نمازِ ظہر تک قیلولہ فرماتے۔ نمازِ ظہر کے بعد تھوڑی دیر تلاوتِ قرآن کرکے حاضرین ومریدین وطلبہ کو درس دیتے۔ درس سے فراغت کے بعد تصنیف وتالیف ودیگر تحریرات میں مشغول ہوجاتے۔ یا اس دوران کوئی آگیا تو اس سے گفتگو کرتے اس کی دلجوئی کرتے۔ نمازِ عصر کے لئے نکلتے تو نمازِ عصر ہی کے بعد مصلّیٰ پر بیٹھ جاتے۔ حتیٰ کہ مغرب کی نماز کے بعد نوافل واذکار کے بعد گھر آتے اور ما حضر تناول فرماتے۔ کھانا کھانے کی عادت مغرب وعشاء کے مابین ہی تھی۔ نمازِ عشاء کے بعد کثرت سے نوافل پڑھنے کا معمول خصوصی تھا۔ اس سے فراغت کے بعد بستر پر تشریف لاتے۔ اور خوابِ استراحت فرماتے۔ جب شب کا کچھ حصہ گذر جاتا تو بیدار ہوتے اور دوسرے مشاغل تہجد وغیرہ میں مصروف ہوجاتے روزہ کے سلسلے میں "صومِ داؤدی" پسند تھا یعنی ایک سال مسلسل روزہ رکھتے ایک سال افطار سے رہتے۔ علاوہ ازیں جمعرات، جمعہ، دوشنبہ، یوم عاشورہ کے روزے پابندی سے رکھتے۔ رمضان کے عشرۂ آخیرہ میں اعتکاف فرماتے۔ زندگی کے تمام

---

[1]۔ [2]: مناقب العارفین ص ۱۰، ۱۱،

شعبوں میں احتیاط و تقویٰ کا رنگ غالب تھا۔ لباس و طعام میں شبہ سے پرہیز کرتے۔ نو ایجاد دین کے خلاف اشیاء کے استعمال سے اجتناب کی کوشش کرتے، لباس میں صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ و اولیاء اللہؒ کی پیروی کرتے، موٹا گزینہ کا لباس استعمال کرتے، جُبّہ عمامہ استعمال کرتے، سبز رنگ زیادہ پسند تھا۔[1] عمر کے آخری

(۱۰) وصال | سال وصال سے قبل جھوسی تشریف لے گئے تھے غالباً شوال کا مہینہ تھا عشاء کی نماز کے لئے مسجد تشریف لے گئے صحن مسجد میں وضو فرمایا کہ "درا ثناء وضو دست مبارک بر روش تحریمہ برداشت و بہ بانگ بلند اللہ اکبر گفت و جاں بدوست سپرد"، یعنی درمیان وضو میں تکبیر تحریمہ کے طرز پر ہاتھ کانوں تک اُٹھایا اور بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور واصل بحق ہو گئے انا للہ الخ یہ حادثہ فاجعہ ماہ شوال روز دوشنبہ کی آخری شب ۱۱۱۱ھ کو پیش آیا شاہ طیبؒ کے خلیفہ شیخ ناصر الدینؒ وہاں موجود تھے جھوسی، مادپور، شیخ پورہ، کے متعلقین و مریدین جنھیں معلوم ہو سکا سب وہاں مسجد میں پہنچ گئے غسل و تجہیز و تکفین کا نظم کیا، حاضرین نے کہا کہ تدفین بھی جھوسی ہی میں ہونی چاہئے کیوں کہ شاہ صاحبؒ نے ایک بار فرمایا تھا کہ اگر جھوسی میں میرا انتقال ہو جائے تو شیخ تاج الدینؒ کے قدموں میں دفن کیا جائے، مگر خلیفہ شیخ ناصر الدینؒ نے غور و فکر کے بعد فرمایا کہ "جھوسی کی ولایت تو شیخ تاج الدینؒ کے برکات و انوار سے معمور ہے شاہ طیبؒ بنارس کے ہیں اور بنارس کی ولایت میں ہی آپ آسودۂ خواب رہیں گے اس لئے جنازہ منڈوا دیہہ جائے گا"، شاہ محمد یسین بنارسیؒ فرماتے ہیں کہ:- میری بھی یہی خواہش تھی، حق تعالیٰ آں مخدوم شیخ ناصر الدینؒ کو "مقام عالی کرامت" عطا فرمائے کہ آپ نے اس فقیر (یعنی شاہ محمد یسینؒ) کی دلی تمنا کا خیال فرمایا اور اس رحمت عام کو سارے بنارس کے لئے فیض بخش و سایہ زن ہونے کا نظم فرمایا" غرضیکہ جب حقیقت منظر عام پر آئی اور ارباب بصیرت پر منکشف ہوئی تو یاران طریقت نے جنازہ تشریف لا ہوا

---

[1] مناقب العارفین ص ۱۵

جونپور سے بنارس روانہ کردیا منگل کو منڈواڈیہہ پہنچ گیا، شیخ ناصرالدینؒ تو ہمراہ تھے ہی، اُسی دن منڈواڈیہہ میں یہ آفتاب عالم تاب روپوش ہوگیا، چہارشنبہ کے دن مزارِ اقدس پر شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ پہنچ گئے اُس کے دوسرے روز قطب الاقطاب دیوان عبدالرشید جونپوریؒ حاضر ہوگئے سب نے ایصالِ ثواب کیا جیسے جیسے لوگوں کو اطلاعات ملتی گئیں آتے گئے دیوان صاحبؒ نے تو شاہ یٰسینؒ کی بہت کافی دلجوئی فرمائی کیوں کہ ان پر زیادہ اثر تھا شاہ طیبؒ کے پروردہ تھے، دو تین روز کے بعد دیوان عبدالرشید جونپوریؒ اور شیخ ناصرالدینؒ اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے مگر شاہ محمد یٰسینؒ مزارِ مبارک کے قریب ہی رہ پڑے، فاضل الوقت شیخ مسعود اسودیؒ نے تاریخِ وصال کہی ہے ؎

شیخ روشن دِل کہ اہلِ عرش و فرش — نام پاکِ او بہ پاکی می برند
کرد چوں بر عالم بالا صعود — رخت خود بر عرشِ سبحانی فگند
یافت تاریخ عروجش اسودی — جلوہ گاہِ او شدہ عرشِ بلند[1]

(۱) خلفائے کرام | حضرت شاہ طیب بنارسی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے جتنے خلفا ہوئے ہیں سب کے سب آسمانِ ہدایت کے آفتاب و ماہتاب ہیں، قطب الارشاد ہیں، کامل و مکمل ہیں صاحبِ احوال و مقامات ہیں، جس میں مشاہیر خلفا کی فہرست اس طرح ہے (ضمناً و تعارفاً کچھ حالات بھی درج کئے جائیں گے)

(۱) شیخ ناصرالدینؒ:- حضرت مولانا خواجہ کلاںؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں عمر کے اعتبار سے اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے تھے مگر کمالات کے لحاظ سے کلاں تھے بچپن ہی سے مکارمِ اخلاق و خوش اطواری میں معروف تھے، شیخ تاج الدینؒ نے مولانا خواجہ کلاںؒ سے لے کر اپنی آغوشِ تربیت میں رکھا شیخ نے محبت و شفقت سے پرورش کیا اور قرآنِ پاک کی تعلیم دی پھر خصوصیت کے ساتھ شرفِ ارادت بخشا، اس کے بعد شاہ طیب بنارسیؒ

[1] مناقب العارفین ص ۲۷، ۲۹۔

کے ہمراہ بنارس چلے آئے اور آپ ہی سے صرف ونحو معانی کی کتابیں پڑھیں، طالب علمی کے ایام میں شاہ طیب رح کی اس قدر خدمت کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی، اس کے بعد تکمیلِ علوم کے لئے جونپور تشریف لے گئے وہاں کے معروف اساتذہ سے اصولِ فقہ کتبِ تفاسیر واحادیث کا درس لے کر تکملہ فرما کر اتنی قابلیت و مہارت پیدا کر لی کہ اپنے وقت کے اربابِ فضل وکمال میں شمار ہونے لگے، جب جونپور سے جھوسی واپس آئے ہیں تو حضرت شیخ تاج الدین جھوسوی رح کو گدڑی کا لعل چمکتا ہوا نظر آیا تو خلافت و اجازت سے نوازا اس کے بعد شاہ طیب رح کی خصوصی نگاہِ کرم سے مزید نکھار پیدا ہوا تو آپ نے بھی خلافت و اجازت سے مالامال کر دیا، شیخ ناصر الدین رح پیرزادے تو تھے ہی شیخِ وقت اور مرشدِ طریقت عالمِ شریعت واقفِ حقیقت بھی تھے، عبادت و ریاضت سے سارے اوقات معمور تھے[1]

(۲) قطب الاقطاب دیوان عبدالرشید جونپوری رح :- شاہ محمد یسین بنارسی آپ کو بایں القاب وآداب یاد فرماتے ہیں "فریدِ عصر ست، وحیدِ دہر ست، در شریعت استاد است، و در طریقت صاحبِ ارشاد، مخزنِ حقائق است، منبع دقائق، طالبِ مجاہدہ و صاحبِ مشاہدہ قطبِ ولایت است، و یگانۂ زماں، غوثِ وقت است، و قبلۂ جہاں زبدۃ الاخیار، عمدۃ الابرار میاں شیخ عبدالرشید جونپوری الخ نور اللہ مرقدہ۔ شیخ وقت محمد مصطفٰی جونپوری رح صاحبزادے ہیں، صغرسنی ہی میں والدِ محترم نے خلافت و اجازت کی نعمت سے نواز دیا تھا، ایک مدت تک تحصیلِ علم میں مشغول رہے کتبِ متداولہ کی تکمیل کے بعد منصبِ درس و تدریس پر فائز ہو گئے علوم کے بحرِ زخار تھے اپنے وقت کے معروف باکمال استاذ تھے، صوفیائے کرام و اولیاء اللہ سے بڑی گرویدگی تھی، کسی ولی اور صوفی کامل کا پتہ مل جاتا اس سے ملاقات کے لئے پہنچ جاتے چونکہ خورد سالگی میں والدِ گرامی نے اجازت

---

[1] مناقب العارفین ص ۱۶، ۴۸، ۴۹۔

عطا فرمادی تھی مگر باضابطہ طور سے منزلِ سلوک طے کرنے کا ذوق و داعیہ تھا، اس لئے شیخ کامل کی جستجو بھی رہی تو ایک مرتبہ شاہ طیب بنارسیؒ جونپور تشریف لے گئے دیوان عبدالرشید ملاقات کے لئے حاضر ہوتے مگر قلب شیخ کی جانب مائل نہیں ہوا، اس کے کچھ دنوں بعد کسی تقریب کے سلسلہ میں دیوان صاحبؒ منڈواڈیہہ تشریف لے گئے تو شاہ طیبؒ کی خدمت میں پھر حاضر ہوتے اور اس بار چند روز قیام بھی فرمایا، اب کی ملاقات وقیام نے قلب وذہن پر عقیدت و محبت کے گہرے نقوش چھوڑے، ذوقِ تصوف پیدا ہوا تدریسی خدمات ترک کر کے خدمتِ شیخ میں آکر قیام کرنے کا قصد کیا مگر شاہ طیب بنارسیؒ نے اس کو بالکل پسند نہیں فرمایا، بلکہ جونپور رخصت کر دیا اور تدریس کی بہت تاکید فرمائی کہ "بجائے وظیفۂ صبح سبق یاراں گفتہ باشید کہ ایں ہم عبادت است"، صبح کو وظیفہ کی جگہ طلبہ کو سبق ہی پڑھائیں یہ بھی عبادت ہی ہے، چنانچہ دیوان صاحبؒ نے اس پر عمل کیا لیکن شاہ صاحب سے قلبی تعلق اور حاضری کا جذبہ مضطرب و بے قرار کرتا تھا تو جونپور سے منڈواڈیہہ یا شریعت آباد تشریف لاتے تھے اور فیوض و برکات سے مالا مال ہو کر چلے جاتے، ایک سال رمضان المبارک کے موقع پر حاضر ہوتے تو شاہ صاحبؒ نے اعتکاف کا حکم دیا جس میں دیوان صاحب کو انوار و برکات سے معمور کر دیا اور عید کے روز خواجگانِ چشت کا پیراہنِ خاص عطا فرمایا اذکار و اوراد کی تلقین فرمائی، اجازت و خلافت سے نواز کر ولایتِ جون پور کی رشد و ہدایت کے لئے رخصت فرمایا[۱]، جونپور میں خانقاہ رشیدیہ آپ ہی کی ہے۔ دیوان صاحب کا مزار رشید آباد جونپور میں ہے، راقم الحروف نے ۱۹۶۵ء جنوری میں پہلی بار خانقاہِ رشیدیہ کی زیارت کی حقیقۃً بزرگوں کے برکات اثرات محسوس ہوتے ہیں، مناقب العارفین کا ایک قلمی نسخہ خانقاہ میں بھی ہے جس پر دیوان صاحبؒ کا حاشیہ ہے۔

---

[۱] مناقب العارفین فارسی قلمی ص ۱۶، ۱۷۔

(۳) شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ :- آپ پندرہ سال کے ہی تھے کہ شاہ طیب بنارسیؒ کی آغوشِ تربیت میں آگئے شروع کی تعلیم اور ارشاد و کنزالدقائق کا درس شاہ صاحبؒ ہی سے لیا، پھر آپ ہی کے حکم سے شاہ محمد یٰسینؒ جونپور تشریف لے گئے وہاں افضل العلماء ملا محمد افضل جونپوریؒ اور قطب الاقطاب حضرت دیوان عبدالرشید جونپوریؒ میاں شیخ جمال اولیاء جونپوریؒ جیسے باکمال اساطینِ علم سے تحصیلِ علم کی نحو، منطق، فقہ، اصول فقہ، رسائل حکمت، ہدایہ اولین، بیضاوی شریف وغیرہ سب کو حرفاً حرفاً پڑھ کر تکملہ فرما کر جونپور ہی سے فارغ ہوئے، تعلیمی راہ میں جد و جہد آٹھ سال فرمائی، سال میں ایک مرتبہ شاہ طیب بنارسیؒ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور دو تین ماہ بنارس رہ کر آپ کی تعلیم و تربیت لطف و محبت شفقت و کرم سے مالامال ہو کر جونپور واپس چلے جاتے، چوں کہ مصارف واخراجات ضروریاتِ زندگی کی اشیاء شاہ طیبؒ ہی پوری فرماتے تھے یہاں تک کہ شاہ یٰسینؒ کے لئے بنارس سے جونپور کپڑے وغیرہ سب بھیجتے تھے، اولاد سے کہیں زیادہ مان جان تھی اس لئے شاہ یٰسین صاحبؒ بھی شاہ طیب بنارسیؒ کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے، شاہ محمد یٰسینؒ خود ہی فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے سامنے بیٹھا کر کھانا ناشتہ کھلاتے تھے اگر میں کم کھاتا تو فرماتے کہ اور کھاؤ میاں! کم کھانے سے کچھ ہو سکتا ہے، اور چربی و روغن دار کھانا کھانے کا امر فرماتے، ہاں نماز پنجگانہ اور تہجد کی تاکید بہت کرتے تھے، نوافل روزے سے منع کرتے اور فرماتے کہ یہ تمہارے مناسبِ حال نہیں ہیں ہاں فرض و واجب روزے ضرور رکھواتے، شاہ محمد یٰسینؒ کی تحصیل علم غالباً اصولِ بزدوی کے درس کا زمانہ رہا ہوگا کہ اس وقت آپ کی شادی بھی ہوئی، ۱۰۷۰ھ میں شاہ طیبؒ نے رمضان کے عشرۂ اخیر میں اعتکاف کا حکم فرمایا اور عید کے روز خواجگانِ چشت کا پیراہن عطا فرمایا اذکار و اعمال کی تلقین فرمائی اور سہروردیہ قادریہ وغیرہ سلاسل کی اجازت و خلافت عنایت فرمائی،[1]

---

[1] مناقب العارفین ص ۱۷۸۴۴ -

۱۰۴۲ھ میں شاہ طیب بنارسی کا وصال ہوگیا تو شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ نے قطب الاقطاب دیوان عبدالرشید جونپوری کو اپنا سرپرست و بزرگ تسلیم کرلیا۔ استاذ تو پہلے ہی سے تھے۔ دیوان صاحبؒ بھی شاہ محمد یٰسینؒ پر کمالِ شفقت و توجہ فرماتے تھے[۱] ۱۰۷۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔ چودھری نبی احمد سندیلوی نے بحرِ ذخار کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کا مزار منڈوا ڈیہہ میں ہے[۲] لیکن مولانا عبدالسلام نعمانی، مولانا سید شاہ علی صاحب گورکھپوری کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "جوسی میں حضرت مخدوم شاہ تاج الدینؒ کے مزار کے متصل آپ کا (یعنی شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ) کا مزار ہے۔ اور یہی صحیح ہے[۳]"۔

مناقب العارفین فارسی میں آپ ہی کی تصنیف ہے جسے ۱۰۵۴ھ میں شاہ یٰسینؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب میں اکثر مشائخِ چشت کے حالات و ملفوظات بڑی تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا نصف ابتدائی حصہ حضرت شاہ طیب بنارسیؒ قدس اللہ سرہ العزیز کے حالات و کمالات اور آپ کے خلفائے کرام و اساتذۂ عظام اور آپ کے مشائخِ طریقت نیز آپ کے مسترشدین کے احوال و کوائف سے پُر ہے۔ اور نصف آخر حصہ میں جن اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے فضل و کمال کا تذکرہ ہے اس کا زیادہ تر ماخذ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتاب اخبار الاخیار ہے۔ مناقب العارفین کی خصوصیت یہ ہے کہ شاہ محمد یٰسین بنارسیؒ نے اکثر و بیشتر واقعات چشم دید لکھے ہیں۔ اور بہت سے مشائخِ طریقت سے خود شرفِ ملاقات حاصل کیا ہے۔ اس کتاب کا بنارس میں صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ جو ۱۱۸۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے۔ ناچیز تذکرہ نگار کے سامنے یہی منقولہ نسخہ ہے جس کی تلخیص و اقتباسات سے آپ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کتاب بخط شکستہ اور کرم خوردہ ہے۔ مطالعہ میں جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ اس کے صفحات مجموعی طور سے ۲۴۸ ہیں۔

۱۔ مناقب العارفین ص ۲۳، ۱۷ ۲۔ مرقع بنارس ص ۲۴۱ ۳۔ مشائخِ بنارس ص ۴۳

(۴) شیخ مصطفےٰ کاکوروی: ۔ قصبہ کاکوری کے باشندہ ہیں اور وہاں کے شرفاء و صاحب اثر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ صالح و متقی صاحبِ فضل و کمال تھے ۔ حضرت شاہ طیب بنارسیؒ سے کتب متداولہ کی تعلیم حاصل کی ۔ اور تکملہ کے بعد شاہ صاحب ہی سے تعلقِ بیعت پیدا کر کے ذوقِ تصوف پیدا کیا ۔ اور منازلِ سلوک طے کیں مجاہدات و ریاضات بہت کیں ۔ زیادہ تر شاہ طیبؒ کے پاس ہی رہتے تھے ۔ مکان یعنی کاکوری شریف بہت کم جاتے تھے ۔ جب باطنی صلاحیت و تزکیہ باطن سے شرفیاب ہو گئے تو شاہ صاحبؒ نے خرقۂ خاص عطا فرما کر خلافت و اجازت دی ۔ اور طالبین کی تربیت و ہدایت و تلقین کلمات کی تاکید فرمائی ایک مدت مدید کے بعد اس لازوال دولت و نعمت سے مالا مال ہو کر جب اپنے وطن کاکوری شریف تشریف لے گئے ہیں تو اس دیار و اطراف کے طالبین و مریدین کی رشد و ہدایت میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص مقبولیت و مرجعیت بخشی تھی ۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کی رحمت خاص نازل ہو رہی ہے ۔ وہیں انتقال فرما کر واصل بحق ہوئے انا للہ الخ قدس اللہ سرہ و نور اللہ مرقدہٗ[1] شاہ طیب بنارسیؒ

(۱۲) مستفیدین و مسترشدین: کے خلفائے کرام کی مذکورہ فہرست اور اُن کے ضمنی حالات و تعارفی کلمات کے بعد اربابِ تعلق و مریدین کا نمبر آتا ہے تو اُن کا کوئی شمار ہی نہیں ہے ہاں مندرجہ ذیل حضرات معروف ہیں، (۱) شیخ فاضل محمد بعلیؒ (۲) سید عبدالکریمؒ (وطن اول بریا وطن ثانی جھوسی) (۳) میاں شیخ عالمؒ: ۔ آپ شاہ طیب بنارسیؒ کے عم محترم ہیں مرید تو حضرت شیخ تاج الدین جھوسویؒ سے ہیں مگر شاہ صاحبؒ سے استفادہ فرمایا ہے (۴) شیخ عبدالمومن کشمیری ثم بنارسی شاہ صاحبؒ سے مرید ہیں اور خادم خاص، (۵) خواجہ محمد طاہرؒ: ۔ آپ شاہ طیبؒ کے خاندانی عزیز ہیں، (۶) شیخ حسن بنارسیؒ (۷) شیخ حسین بنارسیؒ[2]

---

[1] [2] مناقب العارفین ص ۵۳، ۵۱، ۱۹، ۲۰، ۲۱

مقصود تخلیق کائنات

(۹)

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

جنگ احد اور ایک سبق آموز ایمان افزا ابتلاء

جنگ بدر میں کامیابی پر ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ اہل ایمان کی زندگی میں ایک زہرہ گداز آزمائش آئی۔ جو بظاہر نقصان، لیکن درحقیقت ایمان افروزی اور آئندہ متواتر کامرانیوں کا باعث بنی۔ قریش مکہ کو جنگ بدر میں جو گہرا زخم لگا۔ وہ قابل فراموش نہ تھا۔ اس شکست سے عربوں میں ان کی ساکھ کو زبردست دھچکا ہی نہیں لگا تھا بلکہ انھیں مسلمانوں کی موجودگی سے اپنی ہستی خطرے میں نظر آنے لگی۔ اور اس کی تلافی کے لئے انھوں نے نہ صرف یہود و منافقین مدینہ اور قرب و نواح کے قبائل سے رابطہ قائم کیا۔ بلکہ اپنی جنگی قوت کو مجتمع کر کے مدینہ پر چڑھائی کر دی۔ مسلمانوں کے حوصلے اب پہلے سے زیادہ بلند تھے۔ ان جنگجوؤں کی تعداد بھی اب بڑھ کر ایک ہزار ہو چکی تھی۔ انھوں نے باہمی مشورے سے کثرت آراء کی بناء پر مدینہ سے باہر شمال میں چار میل دور کوہ احد کے دامن میں دشمن کا

روکنے کا فیصلہ کیا۔ یہودیوں نے تو معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ساتھ دینے سے پہلو تہی کی۔ اور تین سو منافقین اپنے رئیس "عبداللہ بن ابی سلول" کی سرکردگی میں ساتھ چھوڑ گئے۔ تو مسلمانوں کی تعداد گھٹ کر چھ اور سات سو کے درمیان رہ گئی جس کا بعض قلوب پر اثر ہو سکتا تھا۔ لیکن ایمان کثرت و قلت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ گو دشمن کی تعداد تین ہزار تھی تاہم جنگ ہوئی تو دشمن کو شدتِ مقابلہ کی وجہ سے پسپا ہونا پڑا۔ لیکن مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کے غلط فیصلے اور اقدام سے یہ فتح مسلمانوں کے لئے ابتلاء، نقصان اور درسِ عبرت میں تبدیل ہو گئی مسلمانوں کے ایک دستے کو حضور صلعم نے ایک درّے پر متعین کر دیا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ کچھ بھی ہو تم بلا حکم کسی صورت میں بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا لیکن انھوں نے حضورؐ کی ہدایت کے باوجود دشمن کو بھاگتے دیکھکر درّے کو چھوڑ دیا۔ اس پر کفار نے موقع کو غنیمت جانا اور درّے میں سے گذر کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اور اس حکم عدولی کی وجہ سے ستّر مسلمان شہید ہو گئے۔ خود آنحضرتؐ زخموں کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر گئے۔ مسلمانوں کی صفیں بکھر گئیں۔ تاہم اکا دکا مسلمان دادِ شجاعت دیتے رہے۔ اور تیروں اور نیزوں کو سینوں اور ہاتھوں پر لیتے رہے۔ مگر آنحضرتؐ کو بچاتے رہے۔ حتیٰ کہ نقصان پہنچانے کے باوجود کفار مکہ غلبہ نہ پا سکے۔ اور میدان مسلمانوں کے ہاتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ آنحضرتؐ کو اپنے نقصان اور دشمن کے ابھی قریب ہونے کا احساس تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں دشمن لوٹ کر پھر حملہ نہ کر دے آپ نے زخمی اور تھکے ماندے اہلِ ایمان کو ساتھ لیا۔ اور دشمن کا پیچھا کر کے اسے مکہ کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

یہ جنگ بعض واقعات و نتائج کے لحاظ سے دور رس اثرات چھوڑنے کا موجب ہوئی۔ اور یہ وقتی نقصان مستقبل میں متواتر کامرانیوں پر منتج ہوا۔

اور اس کے بعد آنحضرت کی اس مرکزی اور مظہرامت نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا۔ اب ذرا درج ذیل امور پر غور کیجیے:۔

۱۔ آنحضرتؐ کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے لیکن جب کثرتِ رائے باہر نکل کر لڑنے کے حق میں ہوئی تو آپ نے اپنی رائے "رشاد دھم فی الامر" کے لازمی نتیجے پر ترک کر دی۔

۲۔ تین سو منافقین کی علیحدگی کے باوجود اہل ایمان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ اور انکی نگاہیں قلت و کثرت سے قطع نظر اپنے موقف کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کی تائید پر تھیں، اسی لئے وہ اپنے سے چار گنا زیادہ ہر قسم کے اسلحہ سے لیس دشمن کے خلاف صف آرا ہو گئے، اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

۳۔ جنگ میں نظم و ضبط کی پابندی کامیابی کی جان ہے۔ چند اشخاص کی معمولی سی لغزش سے فتح مبین نقصان عظیم میں بدل گئی جسکی وجہ سے اَلسَّابِقُونَ الاَوَّلُونَ میں سے ستر مجاہدین حق شہید ہو گئے، بیسیوں زخمی ہوئے اور خود سالار اعظم رحمتہ للعالمین خاتم الانبیا سرور دو عالمؐ کو گہرے زخم آئے۔

۴۔ آپ کے قتل ہونے کی افواہ کے بعد جب اصحاب کو آپ کے زندہ ہونے کا علم ہوا تو وہ پروانہ وار آپؐ کے گرد جمع ہو گئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے دشمن کو مار بھگایا۔

۵۔ اہل ایمان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان کی جماعتی پابندی اور تنظیم کا مقصد وحید دین کا قیام یا اِعْلَائے کَلِمَةِ اللّٰه ہے رسولؐ کا وجود مقصود بالذات نہیں اور انکے موجود ہونے یا نہ ہونے سے اہل ایمان کو متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ جنگ احد کے موقع پر آنحضرتؐ کی شہادت کی خبر سن کر بعض اہلِ ایمان کو یہ خیال گذرا کہ اب جنگ کرنے کا کیا فائدہ جس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران : ۱۴۴)

"اور محمدؐ ایک رسول ہی ہیں اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، پھر اگر وہ مر جائیں یا قتل کئے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی کفر کی طرف، اُلٹے پاؤں پھر جاتے تو وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑے گا، اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد بدلہ دے گا۔"

اس آیۂ کریمہ میں اُمت کے سامنے ایک انتہائی بلند اور قیمتی اُصول پیش کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنی سعی اور جدوجہد کا مرکزی مقصد پیغام اور تعلیمات آسمانی کو بناؤ نہ کہ پیغام رسانوں یعنی رسولوں کو، حتیٰ کہ افضل الرسلؐ کی وفات یا قتل کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ آں حضرتؐ کے قتل یا وفات پر بھی حوصلہ نہ ہارو، اور آپ کی تعلیمات کی خاطر تا قیام قیامت جہاد کرتے رہو، اور یہ وہ نکتہ ہے۔ جس کی طرف افضل الامت، امام المسلمین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت توجہ دلائی اور اسی نکتہ کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ہر نبی اور ہر مصلح کے پیروکار شخصیت پرستی کی دلدل میں پھنس کر منزلِ مقصود تک پہنچنے میں ناکام رہے۔

۶۔ ستر مسلمانوں کی شہادت سے مدینہ کے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی، اور دشمنوں نے مسلمانوں کو اس عظیم نقصان کا احساس دلا کر ان کے حوصلے پست کرنا چاہے، لیکن اس ابتلاء سے وہ کندن بن کر نکلے۔ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا (پھر اس وجہ سے وہ سست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں مصیبت پہنچی اور نہ کمزور ہوئے اور نہ عاجزی اختیار کی)، ان کے ارادوں میں کمزوری واقع نہ ہوئی، دوسرے ہی دن دشمنوں کا تعاقب کیا، اور اس حادثہ کے مابعد کئی مہمات میں کامیاب ہو کر کے اپنے یقینِ محکم، ایمان راسخ، پختہ عزم، عشق اور الفتِ الٰہی کا ثبوت بہم پہنچا دیا،

جس سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ نے ان کی جنگِ احد میں کوتاہی سے درگزر کر کے ان کی مغفرت پر مُہر لگا دی،

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (آل عمران)

"وہ لوگ جنھوں نے اس دن تم سے پیٹھ پھیری جس دن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی تو شیطان نے بھی ان کے کسی عمل کی وجہ سے ان کو پھسلانا چاہا، اور یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا اللہ بخشنے والا بُردبار ہے۔"

گو اس جنگ میں کسی غلط کاری کی وجہ سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا، لیکن ان کے دلوں میں کوئی بُرا ارادہ کار فرما نہ تھا اور جونہی انھیں حالات کی نزاکت کا احساس ہوا وہ سنبھلے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا، بس اللہ تعالیٰ کے اس اعلان اور بعد کے سنہری کارناموں کی موجودگی میں، ان کے خلاف زبان کھولنے والے منافقین اور دشمنانِ خدا ہیں،

۷۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جنگ مدینہ کے باہر مشاورت کے مطابق لڑی اور گو اس لڑائی میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا اور خود آں حضرت صلعم کی جان کے لالے پڑ گئے تاہم اس کے بعد آپ نے کبھی اشارہ یا کنایہ سے بھی اہلِ ایمان کو احساس نہیں دلایا کہ تمھاری وجہ سے ہمیں تکلیف ہوئی اور اس طرح مشاورت کے فرمانِ خداوندی کو کما حقہٗ احترام و استحکام بخشا، اس سے بڑھ کر یہ کہ مشاورت کی پھر تاکید فرما دی۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آلِ عمران: ۱۵۹)

یعنی جنگِ اُحد میں شریک اہلِ ایمان کی کوتاہی سے درگزر کیجئے، ان کے لئے خدا سے مغفرت مانگئے اور قومی مہمات میں ان سے بدستور مشورہ کرتے رہئے۔ اور جب آپ کسی کام کا عزم کر لیں تو

پھر اللہ پر بھروسہ رکھتے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ آیندہ مہمات کے لئے لشکرِ اسلام کو ان عناصر سے پاک کر دیا جائے جو مسلمان نہ تھے اور جن پر عہد و پیمان کے ذریعہ اعتماد کیا گیا تھا۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (آل عمران : ۱۷۹)

اللہ ایسا نہیں کہ مومنوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دے جس پر تم ہو، جب تک کہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دے۔

آں حضرت صلعم کی بعثت کا مقصد ہی تزکیہ امت (يُزَكِّيْهِمْ) تھا، اور ضروری تھا کہ جہاد کا مقدس فریضہ بھی ان ہی لوگوں تک محدود ہو، جو پاک نفس و پاک باز ہوں، تاکہ میدانِ جنگ میں بھی اعلیٰ اور پاکیزہ روایات قایم ہوں۔

۹۔ خبیث لوگوں نے شہدائے اُحد کے خلاف طرح طرح کے بدخیالات پھیلا نے شروع کر دئے کہ خواہ مخواہ مارے گئے ہمارے ساتھ بیٹھ رہتے تو قتل نہ ہوتے، ان وسوسہ اندازیوں کا مقصد شہداء کے پسماندگان کے قلوب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھارنا اور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے خبیثوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (آل عمران : ۱۷۰)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انھیں مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دئے جاتے ہیں، اُس سے خوش رہتے ہیں، جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا اور ان کی وجہ سے بھی خوش ہوتے ہیں۔ جو اُن کے پیچھے سے اُن کو نہیں ملے کہ اُن کو کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیہ کریمہ میں نہ صرف راہِ خدا میں قتل ہونے والوں کی حیاتِ ابدی اور نعمتوں کا ذکر ہے بلکہ جو ان کے ساتھ شریکِ جہاد تھے لیکن ابھی دنیا کی زینت ہیں۔ ان کے لئے بھی بشارات ہیں کہ وہ بھی غم اور خوف سے دور رکھے جائیں گے۔ اور اوپر جنگ احد میں بچ جانے والوں کو عفا اللہ عنہم کا مژدہ جانفزا سنایا گیا ہے گویا ان سے کوئی خطا ہوئی ہی نہ تھی۔

۱۰۔ جب خبیث منافقوں اور یہودیوں کو طیب و پاک مسلمانوں سے الگ کر دیا گیا۔ جنگ میں مومنوں کی لغزشوں پر قلم عفو و مغفرت پھیر دیا گیا، آنحضرتؐ کا سینہ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کے الفاظ طیبہ سے ان کے بارے میں صاف کر دیا گیا تو مسلمانوں کو تسلی دے کر آئندہ فوزِ عظیم کی بشارت سنائی اور اس کی تکمیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ	وہ جنھوں نے زخم کھانے کے بعد اللہ اور اسکے
مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ	رسول کی فرمانبرداری کی ان میں سے جنھوں نے
لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا	حسن عمل کیا اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لئے
اَجْرٌ عَظِیْمٌ الخ	اجرِ عظیم ہے۔ وہ جنھیں لوگوں نے کہا کہ لوگوں
(آل عمران: ۱۷۲)	نے تمہارے مقابلے کے لئے لشکر جمع کر رہے ہیں۔

پس ان سے ڈرو تو اس بات نے ان کا ایمان بڑھایا اور انھوں نے کہا اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے۔"

آخری الفاظ میں اجرِ عظیم کے حصول کا ذکر ہے۔ اور اس مقام پر آئندہ کے لئے ایک اصول بیان فرما کر دائمی کامیابی کا راستہ کھولا۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ	"اور نہ سست ہو اور نہ ہی غمگین ہو اور جب
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران: ۱۳۹)	تک مومن رہو گے تم ہی غالب رہو گے۔"

جنگ خندق ـــ کفر کی آخری یلغار اور ذلت آمیز ہزیمت

جنگِ احد نے امتِ مسلمہ کے سینے نئے عزم و جوش سے بھر دئے۔ نزولِ رحمت اور روشن مستقبل کے خدائی وعدوں نے ان کے اجسام و قلوب کے زخموں کو مندمل کر دیا انھوں نے نئے سِرے سے اپنی حالت کو درست کیا۔ اور جب دو سال بعد ۵ھ میں قریش مکہ، یہود اور بدوی قبائل کا بیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل لشکر آتش انتقام وحشت کو ٹھنڈا کرنے کے لئے مدینہ پر چڑھ آیا۔ تو تین ہزار سرفروشانِ اسلام مقابل پر ڈٹ گئے۔ اسلامی لشکر میں اہلِ مدینہ میں سے کچھ منافق بھی تھے جو جنگِ احد میں بہانہ کر کے علیحدہ ہو گئے تھے۔ لیکن اب اصرار کر کے اس وعدہ پر لشکر میں شامل ہو گئے۔ کہ وہ دشمن کے مقابل مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ اور پیٹھ نہیں موڑیں گے۔ جیسا کہ محاصرے کی حالت میں ان کی بےقراری دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے یاد دِلایا۔

لَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا

اور وہ جنگ سے پہلے عہد کر چکے تھے کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ سے عہد کی بازپرس ہوگی۔" (احزاب : ۱۵)

ان تین ہزار مجاہدین میں وہ اولوالعزم مہاجرین و انصار بھی تھے جو رضائے الٰہی کی خاطر اپنے اموال اور جانیں اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ انھیں تین سال قبل جنگِ بدر میں باطل کی کثرت خوف زدہ نہ کر سکی اور وہاں سے وہ غالب و کامران لوٹے۔ دو سال قبل انھیں انصار و مہاجرین نے ایثار و جاں سپاری کا بےمثال نمونہ پیش کیا۔ اور عظیم جانی نقصان اور زخموں نے ان کے حوصلے پست نہ کئے۔ یہی وجہ تھی کہ آج احد کے ابتلا کے دو ہی سال بعد وہ خون آشام دشمن کے ٹڈی دل لشکر کے مقابل چٹان کی طرح ڈٹ گئے۔

مشاورت کے بعد اہل ایمان نے مدینہ کے گرد خندق کھودی اور شہر کی جانب صف بندی کرکے سینہ سپر ہو گئے۔ اہل باطل نے مدینہ کو گھیرے میں لے لیا۔ مسلمانوں کے بال بچے قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے خود شہر کے اندر بسنے والے حلیف یہودی قبائل کی عہد شکنی اور فتنہ انداز کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ کہ کہیں دشمن کے ساتھ ساز باز کرکے فساد کی آگ نہ بھڑکائیں اس محاصرے کی شدت کا ذکر درج ذیل آیات میں پایا جاتا ہے۔

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (الاحزاب: ۱۰ — ۱۱)	جب تمہارے دشمن تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر آ گئے۔ اور جب آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور کلیجے منہ کو آ گئے۔ اور تم اللہ کے متعلق مختلف قسم کے گمان کرنے لگے اس طرح وہاں مومن آزمائے گئے اور سب مصائب میں ڈالے گئے۔

ان آیات میں محاصرے اور خطرے کی شدت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہاں منافقین اور حقیقی مسلمانوں کی کیفیت کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ منافقین تو زیادہ تر نسبی اور قبائلی عصبیت کے زیر اثر اپنے اہل ایمان قبائلیوں کا ساتھ دیتے تھے۔ ورنہ انھیں آنحضرت صلعم اور مہاجرین سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ پھر انھیں یہ بھی لالچ تھا کہ اگر مسلمان کامیاب ہو گئے۔ تو مالِ غنیمت سے محروم نہیں ہونگے علاوہ ازیں مسلمان کہلانے کی وجہ سے وہ بلا عذر پیچھے بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اب انھیں دشمن کی کثرت اور محاصرے کی شدت کا احساس ہوا۔ تو موت کے خوف سے بچنے کے لئے آنحضرت صلعم سے درخواست کرنے لگے۔ کہ ہمارے گھر اور بچے خطرے میں ہیں۔ (إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ) ہمیں ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کی اجازت

دیجیے۔ پھر بزدلی کے الزام سے بچنے کے لئے وہ چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان کا ساتھ دیں۔ چنانچہ لشکر کا حوصلہ پست کرنے کے لئے انھوں نے کہنا شروع کیا کہ "اللہ اور رسول نے کامیابی کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نرا دھوکا تھا۔ اے یثرب (مدینہ) والو! اتنے بڑے لشکر سے تم بچکر کہیں بھی نہ جا سکو گے۔ اور تمہارے بال بچے غلام بنا لئے جائیں گے"۔ یہ لمحات کس قدر ایمان آزما اور حوصلہ شکن تھے۔! مگر بدر و احد کے معرکوں میں صبر، استقامت اور قربانی کا بے نظیر مظاہرہ کرنے والے انصار و مہاجرین کے ایمان پہاڑوں کی طرح مضبوط و مستحکم رہے۔ اور اس ابتلاء اور زلزلے کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کوہ وقار ایمانوں کی الفاظ ذیل میں تصدیق کی ہے۔

ولما را المومنون الاحزاب قالو هذا ما وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ ورسولہ وما زادھم الا ایمانا وتسلیما (الاحزاب: ۲۲)	اور جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا تو کہا یہ وہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے کیا تھا۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا۔ اور اس بات نے ان کے ایمان اور فرمانبرداری میں اضافہ ہی کیا۔"

غور کیجیے۔ یہ کس پائے اور ایمان کے لوگ تھے۔ کہ مشکلات کے درمیان خدا اور رسول کے وعدوں پر بے اندازہ یقین ہے۔ منافقوں کے بے اندازہ پروپاگنڈے کے مقابل خدا اور رسول کے ارشادات کی تصدیق کی۔ اور مخالفت کے طوفانوں کے سامنے اگر ان کے قلوب میں کسی بات کا اضافہ ہوا تو ایمان اور جذبۂ تسلیم و رضا کا ہوا۔ مسلمانوں نے جنگ خندق میں، احد میں اپنی لغزش کی کما حقہٗ تلافی کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا:۔

من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا — مومنوں میں سے وہ مرد بھی ہیں جنھوں نے

اللہ فمنھم من قضیٰ نحبہٗ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلاً (الاحزاب : ۲۳)

اپنے عہد کو سچ کر دکھایا جو انھوں نے اللہ سے باندھا تھا۔ سو ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنی نذر کو پورا کر دیا اور بعض ان میں وہ ہیں جو انتظار کرتے ہیں۔ اور اپنی بات مطلق نہیں بدلی۔"

بیس دن کے کڑے محاصرے کے بعد دشمن کی صفوں میں انتشار پیدا ہوا وہ ایک ایک کر کے منتشر ہونے لگے۔ آخر ایک دن شدید آندھی چلی۔ ان کے خیمے اکھڑ گئے۔ ریت کے طوفان نے انھیں پریشان کر دیا۔ ان کے اونٹ اور گھوڑے بے قابو ہو گئے اور وہ رات کی تاریکی میں بے نیل مرام بھاگ کھڑے ہوئے۔

ورد اللہ الذین کفروا بغیظھم لم ینالوا خیراً وکان اللہ قویاً عزیزا (الاحزاب : ۲۵)

اور اللہ نے کافروں کو ان کے غصے سے بھرے ہوئے لوٹا دیا۔ انھوں نے کوئی بھلائی حاصل نہیں کی۔ اور جنگ میں اللہ کافی ہوا اور اللہ طاقتور غالب ہے۔"

دوسری کامیابی | محاصرے کے ایام میں یہود کا قبیلہ بنی قریظہ مدینہ کے اندر دشمنانِ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف سازباز میں مصروف تھا کہ اگر کفار اور مجاہدینِ اسلام میں ٹکر ہو جاتی تو وہ بلا خبر پشت پر سے مسلمانوں پر حملہ کر دیتے۔ اب کفار بھاگ گئے، تو یہودیوں نے اپنے رویے کی صفائی پیش کرنے کی بجائے اُلٹا لڑائی کا ارادہ کر لیا، اور جب مسلمانوں نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کیا تو انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاھَرُوْھُمْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْھِمْ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا وَاَوْرَثَکُمْ اَرْضَھُمْ وَدِیَارَھُمْ

اور جنھوں نے اہلِ کتاب میں سے ان کفار کی مدد کی تھی، ہم نے ان کو قلعوں سے نکال دیا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، ایک فریق کو تم قتل کرتے تھے، اور ایک فریق کو قید کرتے تھے، اور

وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (الاحزاب: ۲۶-۲۷) اور تمھیں اُن کی زمین اور اُن کے گھروں اور اُن کے مالوں کا وارث بنایا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے ابھی قدم نہیں رکھا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ایک عظیم پیش گوئی | قرآنِ مجید اور آں حضرت صلعم کی صداقت کی اس سے بڑھ کر شہادت کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے غلبۂ اسلام اور امت مسلمہ کے تسلط کی بشارت اس وقت سنائیں جب کہ اسلام اور مومنین انتہائی کس مپرسی کی حالت میں اپنے وجود کو خطرے میں پاتے تھے، عین اُس وقت جب مسلمان زندگی کی کشمکش میں بچاؤ کے لئے خندق کھود رہے تھے اور ایک چٹان کو توڑتے وقت اُس میں سے چنگاریاں نکلیں تو آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ مجھے کسریٰ فارس کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں، دوسری ضرب پر فرمایا مجھے قیصرِ روم کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں اور تیسری ضرب پر فرمایا۔ مجھے یمن کی حکومت دی گئی، اسی کی تائید قرآنِ پاک میں بھی کی گئی۔ جنگِ خندق میں امت مسلمہ کی حالت نہایت کمزور تھی، دشمن نے گھیراؤ کیا ہوا تھا، مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھائی ہوئی تھی، کلیجہ منہ کو آیا ہوا تھا، طرح طرح کے حوصلہ شکن خیالات پھیلائے جا رہے تھے، بربادی کے تمام سامان پیدا ہو چکے تھے، اور صرف ایک نصرتِ الٰہی کی امید دلوں کو تقویت دیئے ہوئے تھی تو اس وقت "فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا" اللہ تعالیٰ نے کفار کے لشکر پر طوفانی ہوا بھیجی اور ایسا لشکر بھیجا جو نگاہوں سے اوجھل تھا جس کی وجہ سے کفار کو بھاگنا پڑا، اس کے بعد ان تھکے ماندے مسلمانوں کو یہودِ بنی قریظہ پر غلبہ حاصل ہوا، اور انھیں ایسے علاقوں کی فتح کا مژدہ سنایا گیا جہاں (اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا کے مصداق) مسلمانوں کے قدم پہلے کبھی نہ پہنچے تھے، گو اس کے بعد خیبر، یمن، مکہ، طائف اور عرب کے دیگر علاقے یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے تصرف میں آتے گئے، مگر یہ علاقے مسلمانوں کے مبارک قدموں سے نا آشنا نہ تھے، یقیناً پیشگوئی میں علاقوں سے مراد قیصر و کسریٰ کے

مقبوضہ علاقہ میں ان ہی عظیم سلطنتوں نے کثیر تعداد میں عربوں کو کچل رکھا تھا اور دوسرے مظلوم انسانوں کو بھی جور وستم کی چکی میں پیس رکھا تھا، اور ان مظلوموں کی آزادی، انسان دوست، خیر الناس، امت مسلمہ کے ہاتھوں مقدر ہو چکی تھی، اور دنیا نے دیکھا کہ خدا کا چہیتا، یہ مختصر گروہ تربیت نبوی کے فیضان اور خدا و رسول کے احکام کی کامل پیروی سے ان تمام نعمتوں اور برکات کا مستحق ٹھہرا، جو خدا کے مقرر کردہ خلیفہ کے لئے ازل سے پیدا کی گئی تھیں، جنگ خندق کے بعد اس کی راہ سے تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں، اور ان مردان حق کے قدم جدھر اٹھتے تھے، فتح و نصرت انھیں چومتی تھی۔

ضروری اطلاع

غیر ملکی ڈاک کے محصول شرح میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ اس اضافہ کے بعد بحری ڈاک سے برہان کا محصول جو پہلے ۳۵ پیسے تھا اب ۸۰ پیسے ہو گیا۔

بنا بریں اب بحری ڈاک سے برہان منگوانے والے حضرات بدل اشتراک (سالانہ چندہ) دو پاؤنڈ ارسال فرمایا کریں۔ ہوائی جہاز سے برہان کا محصول سوا تین روپے سے زائد لگے گا۔ اس لئے اگر کوئی صاحب ہوائی ڈاک سے منگوانا پسند کریں تو چار پونڈ سالانہ ارسال فرمائیں۔

نیاز مند

مینیجر

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس
اور
میرے مشاہدات و تاثرات

(۴)

(سعید احمد اکبر آبادی)

کافی وقفہ کے بعد دوسرا سیشن شروع ہوا تو ملیشیا کے ڈاکٹر حاجی قمرالدین اور افغانستان کے نائب وزیر تعلیم مسٹر محمد ولی اللہ سمیعی نے مشترکہ صدارت کی اور حسب ذیل حضرات نے مقالات پڑھے: ترکی کے وزیر اوقاف و امور مذہبی حسن افضائی صاحب، سید علی مختار نائب وزیر سعودی عرب، مسٹر حمدان وزیر امور مذہبی موریتانیا، کپتان محمد جمعہ، اگنڈا، مسٹر ابوبکر مراکو، شیخ صادق رمضان، لیبیا، عمر عبداللہ، مراکو، ڈاکٹر سیر دین شوکت پاکستان،

۸ مارچ کو کانفرنس کا آغاز حسب معمول نو بجے ہوا تو ایران کے ڈاکٹر اے سی نفیسی صدر اور پاکستان کے ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی شریک صدر مقرر ہوئے،

ڈاکٹر محمد ناصر اس نشست میں ایک اہم اور فکر انگیز مقالہ انڈونیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد ناصر (Mohd Nasir) نے پڑھا جس کا عنوان تھا " اسلام کا پیغام

اور جدید انسان،، فاضل مقرر نے کہا: " ہمارے عہدِ جدید کی تین اہم خصوصیات ہیں ایک انسان کی عظمت، دوسرے جمہوریت اور تیسرے سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی اور پیش قدمی، اب آئیے یہ دیکھیں کہ ان تینوں کے بارہ میں اسلام کیا کہتا ہے اور اس کی تعلیمات کیا ہیں جہاں تک امر اول کا تعلق ہے اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انسان کی عظمت اور کائناتِ عالم میں اس کا مرتبہ و مقام اسلام کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کو خلیفۃ اللہ علی الارض قرار دیا گیا علم کائنات کا امتیاز اسے بخشا گیا۔ اور عالم ارض وسما کی تمام اشیا اس کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ اسلام نے ذات پات، رنگ و نسل اور زبان و ثقافت کی تمام حدبندیاں ختم کردیں اور انسانوں کو وہ حقوق عطا کئے گئے کہ اس معاملہ میں مجلس اقوامِ متحدہ بھی اسلام کی حریف نہیں بن سکتی۔

اب جمہوریت کو لیجئے۔ اصل جمہوریت وہ نہیں ہے جو ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے جمہوریت ہو اور باطناً محض چند ووٹوں کی اکثریت کے بل پر ایک فرد کی نہ سہی ایک پارٹی اور ایک جماعت کی حکومت ہو۔ اس کے برخلاف حقیقی جمہوریت یہ ہے کہ بحیثیت انسان کے ہر ہر فرد کی عظمت کا یقین ہو۔ اس معیار کو سامنے رکھکر آج کل کی جمہوریت، خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اگر اس کا مقابلہ و موازنہ اسلامی جمہوریت سے کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ حقیقی جمہوریت اسلام میں ہی ہے۔

رہا سائنس اور ٹکنالوجی کا مسئلہ تو دنیا جانتی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ عروج و ترقی میں سائنس کے مختلف شعبوں میں کس درجہ عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن کی تحریک اور انسان کی عظمت کے تصوّر کا جو اسلام نے انھیں دیا تھا نتیجہ تھا۔ اس لئے سائنس اور ٹکنالوجی کی موجودہ ترقی اسلام کی ضد نہیں بلکہ عین اس کی تعلیمات کے مطابق اور اس کی روح اور اسپرٹ کے ہم آہنگ ہے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان جدید (MODERN MAN) کی خصوصیات جن کو علمائے مغرب بیان کرتے ہیں۔ وہ سب اسلام کی تعلیمات کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ماڈرن مین بننے کے لئے سیکولر یعنی لامذہب ہونا ضروری نہیں ہے۔ البتہ ایک سیکولر ماڈرن اور ایک مسلم ماڈرن مین نیت، ارادہ اور جذبہ کا فرق ہوگا۔ اسلام اعتدال کا مذہب ہے۔ انتہا پسندی خواہ کیسی اور کسی کے لئے ہو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے اور زندگی کا خواہ کوئی شعبہ ہو اس میں اسلام ہدایت ربانی پر چلنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ناصر نے کہا: یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اگر مادی ترقی روحانی رہنمائی سے الگ ہو تو اس سے ایک ایسا انسان پیدا ہوگا جس کو نہ گھر میں چین نصیب ہوگا اور نہ گھر سے باہر۔ اس کو نہ اپنے ساتھیوں اور ہم جنسوں سے تعلق ہوگا اور نہ اپنے خالق سے اس بنا پر ضروری ہے کہ مادی اور روحانی، یعنی زندگی کی ان دونوں قسموں میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کیا جائے۔ اگر کسی ایک پہلو پر زور زیادہ دیا گیا اور دوسرے پر کم تو اس کا نتیجہ ابتری، خلفشار اور بے راہ روی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

شیخ ازہر ڈاکٹر عبد العلیم محمود نے کہا! سب شرکائے جلسہ نے اس تقریر کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنا اور پسند کیا۔ لیکن شیخ ازہر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی اصول اور تعلیمات کو جدید تصورات کے ساتھ منطبق کرنے کا رجحان بہت خطرناک اور گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اسلامی اصول خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔ اس لئے لازمی طور پر وہ ابدی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ اس بنا پر جدید تصورات کی صحت و سقم کو جانچنے کا معیار اسلامی اصول ہونے چاہئیں نہ کہ اس کے برعکس اگر ایک صدی کے بعد تصوراتِ جدیدہ بدل گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ

اہم اسلامی اصول کو بھی بدل ڈالیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ قرآن مجید میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان اصول کی عملی تشکیل کی شکلیں متغیر ہو سکتی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ مسلمانوں کے معاملات و مسائل مشورہ سے طے ہوں۔ لیکن مشورہ کی شکل کیا ہو؟ اس میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔

اس موقعہ پر یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ موجودہ شیخ ازہر بلند پایہ عالم اور بڑے صالح، متقی اور متدین و متشرع ہیں۔ جامع ازہر سے فراغت کے بعد فرانس گئے۔ اور وہاں سے فلسفہ میں ڈاکٹر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک مختلف تقریبات سے میں ہر سال اور ایک مرتبہ سال میں دو بار قاہرہ آتا جاتا رہا ہوں۔ جناب شیخ ازہر سے اسی زمانے سے نیاز حاصل ہے۔ اُن دِنوں میں یہ جامع ازہر کے کلیۃ الشریعہ کے پرنسپل تھے۔ بعد میں شیخ ازہر مقرر ہوئے۔ اپنے خیالات و افکار کے اعتبار سے عام شیوخ ازہر کے برخلاف مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا صاحب المنار کے مکتبۂ فکر کے سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ مجمع البحوث الاسلامیہ، قاہرہ کے ایک جلسہ میں انھوں نے اپنی کتاب العقل والدین کا ایک نسخہ مجھکو ازراہِ کرم عطا فرمایا تھا۔ میں نے اسے پڑھا تو دیکھا کہ اس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ دین میں عقل کا کوئی مقام ہی نہیں ہے اور اسی اساس پر مفتی محمد عبدہٗ اور ان کے ہم خیال علماء پر اور خیال ہوتا ہے کہ غالباً سرسید احمد خاں پر بھی سخت اور کڑی تنقید کی گئی تھی۔ اس وقت میں نے ڈاکٹر ناصر کے مقالہ پر شیخ ازہر کا تبصرہ سُنا تو ان کی یہ کتاب یاد آگئی۔ ورنہ میرے نزدیک یہ تبصرہ بے محل، بے موقع اور غیر ضروری تھا۔

شیخ ازہر کے بعد امام حرم کعبہ شیخ عبداللہ بن سبیل نے بھی اس مقالہ پر

تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: " فاضل مقرر کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ایک مسلمان اور ماڈرن مین میں فرق صرف ارادہ، نیت اور جذبہ کا ہے۔ بلکہ اسلام کی تعلیمات کے تحت مسلمانوں کے بنیادی اوصاف آج کل کی منافقانہ دنیا کے موڈرن مین کے اوصاف سے مختلف ہیں۔ ان دو حضرات کے علاوہ لبنان کے شیخ حسن خالد نے بھی اسی قسم کی بات کہی۔ آخر میں مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر محمود حسین الصبحی نے پتہ کی بات کہی۔ انھوں نے فرمایا: مقالہ نگار اور ان کے ناقدین میں نتائج کے اعتبار سے ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر محمد ناصر نے اسلام سے متعلق جو کچھ کہا ہے خود اعتمادی اور یقین کے لہجہ میں کہا ہے۔ ماڈرن اور اسلامی تصورات کے مقابلہ وموازنہ میں ان کا اسلوب بیان معذرت خواہانہ (Apo-logetic) ہرگز نہیں ہے۔

پروفیسر روجر آرنلڈ | وقفہ کافی کے بعد جو اجلاس شروع ہوا وہ لاہور میں کانفرنس کا آخری جلسہ تھا۔ اس میں مصر کے وزیر اوقاف اور ملیشیا کے سر حاجی قمر الدین کی مشترکہ صدارت میں ایک بڑا فاضلانہ مقالہ پروفیسر روجر آرنلڈ (جو فرانس کی پیرس، سولورن یونیورسٹی میں اسلامک سٹڈیز سینٹر کے ڈائرکٹر ہیں) نے پڑھا مقالہ کا عنوان تھا۔" قرآن اور سنت میں تقویٰ اور عمل صالح کا مفہوم" اس میں پہلے انھوں نے مستشرقین کے عام قاعدہ کے مطابق، لفظ فضیلت و تفضیل کے مادہ اشتقاق پر تجزیاتی بحث کی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ قرآن کے بیانات کی روشنی میں تقویٰ، طہارت اور نیکی کا تعلق اگرچہ دل اور ارادہ و نیت کی عفت و پاکبازی سے ہے۔ لیکن ان کے جانچنے کا معیار عمل ہے۔ اسی بناء پر قرآن اور حدیث دونوں میں سب سے زیادہ زور عمل پر ہے۔ اگر عمل نہ ہو تو یہ سب الفاظ بے معنی ہیں۔ اسلام جس طرح انفرادی زندگی میں اعلیٰ اخلاق کا

مطالبہ کرتا ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی اعلیٰ اخلاق پر قائم رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

اس مقالہ کے علاوہ چند اور مقالات بھی ہوئے۔ نائجیریا کے پروفیسر ابوبکر اسماعیل بالوگن نے نائجیریا میں اسلام کے داخل ہونے، پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی تاریخ بیان کی۔ اور شمالی نائجیریا اور جنوبی نائجیریا میں جو فرق ہے اسے واضح کیا۔ یہ مقالہ خاصہ معلومات افزا تھا۔ توجہ اور دلچسپی سے سنا گیا۔ شرق اردن کے شیخ تیسیر ظبیان نے ہندو پاک کے مسلمانوں کی اسلامی خدمات اور ان کے دینی کارناموں کی بڑی تعریف کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کے متعدد اشعار بھی مزہ لے لے کر پڑھے۔ اس پر پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ موصوف عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ بڑے فاضل اور لائق و قابل ہیں اردن میں عمان کے قریب اوس کہف (غار) کا انکشاف ہوا ہے جس میں اصحاب کہف روپوش ہوئے تھے۔ موصوف نے اس پر تحقیق کر کے ایک مقالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ واقعی یہ وہ کہف ہے جس کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے۔ گذشتہ نومبر میں جب لکھنؤ کے بعد دلی میں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی تو ان کی خواہش تھی کہ میں اس موضوع پر ان کے لکچر کا انتظام کروں۔ مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا اس وقت تقریر میں انھوں نے جو اردو اشعار پڑھے وہ تصدیق اور تصحیح کی غرض سے مجھکو پہلے بھی سنا چکے تھے۔ اور مجھ کو اس وقت ان کی زبان سے ان اشعار کے سننے میں وہی لطف اور مزہ آیا تھا جو حکیم قاآنی کو اپنے توتلے معشوق کے ساتھ گفتگو کرنے میں آیا تھا۔ اور جس کی محاکات اس نے ایک طویل قصیدہ میں بکمال چابکدستی، مہارتِ فن اور قدرتِ بیان سے کی ہے۔ اس مجلس میں پروفیسر جان نیپرٹ (Jan Knappirt) جو بلجیم کی یونیورسٹی آف لووین

(Louvain) میں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں۔ ان کا مقالہ "اسلام میں نماز کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت" پر نہایت عمدہ اور بصیرت افروز تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا پورا واقعہ نقل کرکے بتایا تھا کہ حضور کی کن کن پیغمبروں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ اور ان سب سے کس درجہ اخلاقی سبق ہم کو ملتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ نماز بُری اور گندی باتوں سے روکتی ہے۔ موصوف نے علمی طور پر ثابت کیا کہ قرآن کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے۔ بشرطیکہ نماز، دل، دماغ اعضاء و جوارح کے ان آداب و شرائط کے ساتھ ادا کی جائے جن کی تلقین قرآن و حدیث میں کی گئی ہے۔ مقالہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے سُنا اور پسند کیا گیا۔ ان مقالات کے علاوہ حسب ذیل مقالات اور پڑھے گئے۔

(۱)۔ "خاتم نبوت کی حیثیت" ڈاکٹر ابو تراب نفیسی (اسکول آف مڈیسن اصفہان یونیورسٹی۔ ایران) (۲)۔ ڈاکٹر ولید عرفات (برطانیہ) اسلام ایک سماجی اور ثقافتی انقلاب (۳)۔ ڈاکٹر طرزی (ٹیونس) اور (۴)۔ ڈاکٹر چارلس واڈی (انگلینڈ) "اہل کتاب"

لاہور میں کانفرنس کا سوشل پروگرام | کانفرنس کا علمی اور سوشل پروگرام ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بادشاہی مسجد میں جمعہ کی نماز اور ایک ڈنر کا ذکر آ ہی چکا تھا۔ اس کے علاوہ ۶ مارچ کو لنچ چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی طرف سے ہوا۔ اس کے بعد چار بجے اہالیانِ لاہور کی طرف سے جو استقبالیہ گلستانِ فاطمہ میں ہوا وہ نہایت عظیم الشان، پرتکلف۔ دلچسپ اور زندہ دلانِ پنجاب کی روایت کے مطابق تھا۔ یہ گلستانِ فاطمہ وہی ہے جس کا نام انگریزوں کے زمانے میں لارنس گارڈن تھا۔ یہ نہایت وسیع۔ خوشنما اور دلکش باغ ہے۔ اس کے اطراف میں کہیں

کہیں پہاڑ کا منظر پیدا کیا ہے اور اس پر تفریح گاہیں بنائی ہیں۔ میدان نرم اور ملائم گھاس سے روپوش ہو کر سبزہ زار بنا ہوا۔ اِدھر اُدھر جگہ جگہ تختہائے لالہ و گل جو "نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی" کی مستقل دعوت نظارہ! اسی میدان میں سرسبز و شاداب اور بلند قامت درخت قطار اندر قطار، روشوں میں صاف و شفاف اور سیم آگیں پانی رواں دواں پوری فضا ہمہ نزہت و موسیقیٗ یکسر منبع طرب و نشاط، یہ لارنس گارڈن مجھ کو اس درجہ عزیز اور محبوب تھا کہ یہ ناممکن تھا کہ کسی دن میں لاہور میں ہوں اور شام کے ڈیڑھ دو گھنٹے یہاں بسر نہ ہوتے ہوں۔ اور مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی کوئی دوست میرے ہمراہ آیا ہو۔ تنہا آتا تھا اور تنہا واپس جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ لارنس گارڈن کا نام اب گلستانِ فاطمہ (مس فاطمہ جناح) کے نام پر ہی ہو گیا ہے۔ اس لئے مندوبین کے ساتھ جب یہاں پہونچا تو بیساختہ میری زبان سے نکلا: ارے یہ تو ہمارا لارنس گارڈن ہے اور نظریں اس کے جز و کل کا جائزہ لینے کے لئے آوارہ ہو گئیں۔

استقبالیہ میں اشیائے خورد و نوش کی ریل پیل اور ان کا تنوع کوئی نئی چیز نہیں یہ تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے۔ اصل دیدنی چیز تھی یہاں کی زیبائش و آرائش اور اہتمام و انتظام۔ شرکا کی تعداد تین چار ہزار سے کم نہ ہوگی۔ مہمانوں کی نشست کا انتظام پہلی صف میں تھا۔ ان کے بالمقابل ذرا اونچائی پر ایک اور صف تھی جو مہمانوں میں بھی V.I.P قسم کے لوگ تھے۔ ان کے لئے مخصوص تھی۔ اس صف کے پیچھے اور اِدھر اُدھر باقاعدہ یونیفارم میں کھڑے ہوئے رضا کار جنھوں نے بینڈ باجا بھی بجایا۔ قرآن مجید کی تلاوت ہوئی۔ علامہ اقبالؔ کا کلام گا کر سنایا گیا۔ پھر اہالیانِ شہر کی طرف سے خیر مقدمی اڈرس اور اس کے جواب میں مندوبین

کے نمائندگان کی حیثیت سے چند عرب مندوبین کی تقریریں اور ان کا ترجمہ! مجھکو استقبالیہ کی اس طرح کی تقریریں اور خیر مقدمی اڈریس سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس لئے تھوڑی دیر میں یہاں بیٹھا اور پھر اٹھ کے یہاں سے ذرا فاصلہ پر سبزہ پر ٹہلنے لگا۔ مغرب کے وقت یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ اور ہم سب ہوٹل واپس آ گئے۔ ڈنر پنجاب کے وزیر اوقاف کی طرف سے ہوا۔ دوسرے دن یعنی ۷ مارچ کو شام کے چار بجے استقبالیہ مجلسِ احبار کی طرف سے ہوا لیکن میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ڈنر انجمن حمایتِ اسلام کی طرف سے ہوٹل ہی میں ہوا۔ ۸ مارچ کو لنچ ایک کمپنی کی طرف سے ہوا۔ شب فارغ تھی اس لئے طعامِ شب خواجہ عبدالرشید کے ساتھ کھایا۔ میرے ساتھ عزیزی میاں اسلم اور ریحانہ بھی مدعو تھے۔ خواجہ صاحب کی بیگم صاحبہ جنھیں میں بھابی کہتا ہوں اعلیٰ اخلاق و کردار کی دیندار اور خدا ترس خاتون ہیں۔ کھانے سے پہلے خواجہ صاحب کی خوبصورت اور پر فضا کوٹھی "الرشید" اور اس میں ان کے کتب خانہ اور میوزیم کا جائزہ لیا۔ یہ دونوں بڑی محنت اور صرف زرِ کثیر سے مہیا کئے گئے ہیں اور قابلِ دید ہیں۔

جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری | کانفرنس کے نہایت مصروف پروگرام کے باعث شہر میں اپنے اختیار سے کہیں آنے جانے اور ملنے جلنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس لئے جن احباب سے کانفرنس کے کسی پروگرام میں ہی ملاقات ہو گئی تو خیر! ورنہ کانفرنس کے باہر ملنا آسان نہ تھا۔ انھیں احباب میں جناب حفیظ جالندھری ہیں۔ کانفرنس ہال میں آمنا سامنا ہوا تو بڑے تپاک سے ملے۔ جنگِ عظیم ثانی کے زمانہ میں حفیظ صاحب اپنی انگریز بیوی کے ساتھ قرول باغ میں دفتر برہان کے قریب نور منزل میں رہا کرتے تھے۔ ان سے دوستانہ تو پہلے ہی سے تھا اس لئے کبھی کبھی دفتر میں آتے اور ہم لوگوں سے لطفِ ملاقات و سخن رہتا۔ حفیظ صاحب کو یہ زمانہ یاد تھا۔ دیر تک اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ آج ترقی پسند اور جدید شاعری

کا وہ غلغلہ اور ہمہمہ ہے کہ قدیم شاعری کے بڑے بڑے ستون گر گئے۔ اور ان کی آواز گلوگیر ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اقبال، جگر، اصغر گونڈوی، سیماب اکبرآبادی اور اختر شیرانی کی طرح حفیظ ان شاعروں میں سے ہیں جن کو نئی نسل بہلانا چاہے بھی تو بھلا نہ سکے گی۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔
مسٹر محمد ایوب رومانی اور سید یمین الدین حنفی | یہ دونوں اصلاً دلی والے تھے اور مؤخرالذکر تو مولانا عبدالحق صاحب حقانی تفسیر حقانی کے خاندان سے ہیں۔ شروع میں ہی پاکستان چلے گئے تھے۔ اور اب وہاں رومانی صاحب تو آل پاکستان ریڈیو کے اسسٹنٹ کنٹرولر ہیں۔ اور حنفی صاحب بھی ایک بڑے عہدہ پر ہیں جس زمانہ میں میں سینٹ اسٹیفنس کالج۔ دہلی میں لکچرر تھا۔ یہ دونوں اس زمانے کے میرے بہت اچھے اور قابل شاگردوں میں سے تھے۔ میں نے اپنے شاگردوں سے لڑکے ہوں یا لڑکیاں ہمیشہ اولاد کی طرح محبت کی ہے۔ اس لئے مجھ کو بھی محبت کا جواب محبت سے ملا ہے یہی وجہ ہے کہ مسٹر ایوب رومانی نے جب ریڈیو پر میرا نام سنا تو ملنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ سید یمین الدین حنفی کو فون کیا اور جب وہ ان کے دفتر پہنچ گئے تو ان کو وہاں چھوڑ کار میں بیٹھ میرے پاس پہنچے۔ میں اس وقت کانفرنس میں تھا۔ ایک رضاکار سے کہلوا کر مجھے ہال سے باہر بلوایا۔ میں باہر آیا تو جوشِ محبت میں لپٹ گئے۔ ۳۵، ۳۶ برس کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر میں نے بھی انھیں ایک نظر میں پہچان لیا۔ ان کے اصرار پر کار میں بیٹھ کر ان کے دفتر پہنچا۔ یہاں سید یمین الدین حنفی موجود تھے۔ ان کو بھی میں نے فوراً پہچان لیا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد اپنے دونوں عزیز شاگردوں سے ملاقات کر کے واقعی بڑی خوشی ہوئی۔ ان دونوں کا بھی حال یہ تھا کہ بچھے جاتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد پُرتکلف چائے آگئی۔ نصف گھنٹہ

ہوگیا۔ تو جب میں کانفرنس کے اختتام پر دوبارہ کراچی سے لاہور آنے پر اُن سے اطمینان کی ملاقات کا وعدہ کرکے رخصت ہونے لگا تو انھوں نے ایک لفافہ میں پانچسو روپے کے نوٹ نذر کئے ۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق ان کے قبول کرنے سے ہر چند معذرت کی مگر وہ نہ مانے اور بولے کہ یہاں لاہور میں آپ کی جو بچی اور اس کے بچے ہیں ان کو دیدیجیے۔ اور میں نے واقعی ایسا ہی کیا۔ فطرتاً میں روپیہ اپنے پاس رکھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے اس سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جب میں اس آیت پر پہنچا جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں قیامت کے دِن اسی سونے اور چاندی سے ان کی پیشانیوں کو داغا جائے گا" تو قلب اور دماغ پر جیسے بجلی گر پڑی اور یقین کیجئے اُس روز سے میرے تحت الشعور میں روپیہ پیسہ کی طرف سے بے رغبتی اور اس کی کم مقداری کا احساس جاگزیں ہوگیا ہے۔ ایک عربی شاعر کس فخر سے کہتا ہے:

لا یالف الدرھم المضروب صُرَّتنا لا یاتیہ الا وھو منطلق

ترجمہ: ٹکسالی سکہ ہماری تھیلی سے مانوس نہیں ہے۔ وہ اس میں داخل ہوا نہیں کہ باہر نکل جاتا ہے

میرپور | اب لاہور سے میرپور جانے کا پروگرام تھا۔ وہاں کانفرنس نہیں تھی۔ آزاد کشمیر کے مناظر اور ترقیاتی منصوبے دیکھنا مقصد تھا۔ اس ذیل میں وہاں کی حکومت کی طرف سے استقبالیہ بھی پروگرام میں شامل ہوگیا تھا۔ مجھکو وہاں جانے میں تامل تھا کہ کشمیر کا معاملہ ہے کہیں کوئی اور فتنہ کھڑا نہ ہوجائے لیکن میں شروع سے دیکھ رہا تھا کہ کانفرنس میں گورنمنٹ یا پبلک کے کسی شخص نے ہندوستان کا ذکر کبھی برائی سے نہیں کیا۔ امرجنسی کے بعد ہندوستان کے حالات اور یہاں کے مسلمانوں کے معاملات و مسائل پر مجھ سے سوالات ہوئے اور میں نے ان کے

جواب دیئے ۔(مفصل تذکرہ آگے آئے گا) لیکن یہ سب ہی مجلسوں میں ہوا اور
بڑے سنجیدہ لب ولہجہ کے ساتھ ۔ علاوہ ازیں میرے وہاں جانے پر اگر اعتراض
ہوسکتا تھا تو پاکستان گورنمنٹ کو ہوسکتا تھا مگر پاکستان گورنمنٹ نے
تو دعوت ہی دی تھی ۔ رہی گورنمنٹ آف انڈیا! تو میں نے اپنا دعوت نامہ اور
پروگرام سب گورنمنٹ کو بھیجدیئے تھے ۔ اوران کو دیکھکر گورنمنٹ نے بڑی
خوشی سے کانفرنس کے پروگراموں میں شریک ہونے کی اجازت دی ۔ اور ٹیلی گرام
کے ذریعہ مجھکو اس سے مطلع کیا تھا ۔ پھر سب سے بڑھکر یہ کہ میں "شوقِ دید" کا
مارا ہوا ہوں ۔ خیال ہوا کہ اگر اس علاقہ کو اب نہیں دیکھا تو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا
ان وجوہ کی بنا پر میں نے فیصلہ کرلیا کہ سب مندوبین کے ساتھ میں بھی آزاد کشمیر
چلوں گا ۔

لاہور سے روانگی

۹ / مارچ کو راولپنڈی ۔ اسلام آباد کے لئے روانگی کا پروگرام یہ
تھا کہ صبح آٹھ بجے ہوائی جہاز سے روانہ ہونگے اور پہلے اسلام آباد میں یہاڑوں
کا نظارہ کرکے میرپور کا سفر سڑک کے ذریعہ کریں گے مگر ہوا یہ کہ اسی وقت شاہ
ایران اوران کی پارٹی راولپنڈی کے ہوائی اڈہ سے اڑکر لاہور پہنچنے والے تھے
ان کی وہاں سے روانگی میں تاخیر ہوئی اس لئے ہم لوگ بھی اپنے ہوٹل سے روانہ
نہ ہوسکے ۔ آخر ساڑھے گیارہ بجے راولپنڈی کے ہوائی اڈہ کے کھل جانے کا سگنل
آیا تو ہم لوگ روانہ ہوئے ۔ بارہ بجے کے قریب ہوائی جہاز نے پرواز کی ۔ چالیس
منٹ میں راولپنڈی پہنچ گئے ۔ اب اسلام آباد جانے کا وقت نہیں رہا تھا ۔ اس
لئے اعلیٰ درجہ کی ٹورسٹ بسیں اور کاریں ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں ان میں
سوار ہوکر میرپور کے لئے روانہ ہوگئے ۔ ٹھیک یاد نہیں لیکن اندازہ ہے کہ یہاں
سے میرپور ڈیڑھ سو کلومیٹر سے کیا کم ہوگا ۔ راستہ میں پنجاب کے متعدد بڑے اور

مشہور شہر پٹھان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے تیز رفتاری سے ہم آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ آزاد کشمیر کا علاقہ آگیا تو یہاں سے پہاڑی راستوں کے پیچ و خم اور بالائی و پستی کے مناظر شروع ہو گئے۔ منگلا ڈیم یہیں ہے۔ اس کو دیکھنے کا پروگرام تھا۔ مگر وقت کی تنگی کے باعث اُسے بھی ترک کیا۔ بس اس کے پاس سے گذرے تو اس پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ مجھکو ذاتی طور پر اس کا افسوس ہوا کیونکہ وہ واقعی اطمینان سے دیکھنے کی چیز تھی۔ یہ علاقہ جموں و کشمیر کی طرح سر سبز و شاداب اور گلشن بکنار نہیں ہے۔ لیکن پہاڑ پھر بھی پہاڑ ہوتا ہے اور نام بھی کشمیر ہے اس لئے کھلی فضا اور عمدہ آب و ہوا سے طبیعت بہت محظوظ ہوئی۔ چار بجے کے قریب قلعہ پہنچے۔ یہاں استقبال کا بڑا شاندار اہتمام اور انتظام تھا۔ دیر کافی ہو گئی تھی۔ بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایک بڑے پنڈال کے نیچے ادھر ادھر صوفہ سیٹ پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک کونہ میں ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔ کوکا کولا سے ہم لوگوں کی تواضع ہوئی۔ ایک حسین و جمیل اور خوش وضع نوجوان نے مجھے کوکا کولا کی نہایت سرد بوتل پیش کی۔ تو میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بوتل لے لی مگر پوچھا: یہ تو بتائیے کہ اس کے پینے سے بھوک تو نہیں بڑھ جائے گی۔ نوجوان فوراً میرا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے کہا: کھانا تو آپ حضرات کے انتظار میں ایک بجے سے میزوں پر لگا ہوا ہے۔

بہرحال قرآنِ مجید کی تلاوت کے بعد جناب صدر اور وزیرِ اعظم کی طرف سے مطبوعہ اڈریس انگریزی میں پڑھے گئے۔ اس کے بعد ٹرکی کے وزیرِ اوقاف نے تقریر کی۔ اس پوری کارروائی میں ہندوستان کا کہیں نام نہیں آیا۔ البتہ ٹرکی کے وزیرِ اوقاف نے تقریر کے آخر میں اتنا کہا کہ ہم دُعا کرتے ہیں کہ مجلس اقوامِ متحدہ کی تجویز کے مطابق آپ کو کامیابی ہو۔ لیکن یہ سب کارروائی میری

غیر موجودگی میں ہوئی۔ اوّل تو جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ مجھ کو استقبالیہ کی رسمی تقریروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ظہر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس لئے میں تھوڑی دیر تو یہاں بیٹھا پھر ایک اونچے مقام پر چڑھکر وہاں گیا جہاں غسلخانے بنے ہوئے تھے۔ وہاں دس بارہ منتظرین مجھ سے بھی پہلے کے پہنچے ہوئے تھے اس لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب موقع ملا تو وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر آیا اور پرفضا مقام پر پہنچ کر نماز ادا کی۔ اب واپس آیا تو دیکھا استقبالیہ کی تقریروں سے فارغ ہو کر لوگ کھانے کی میزوں پر پلے پڑ رہے ہیں۔ میزوں پر مرغ و ماہی اور دوسرے الوانِ نعمت کا ہجوم تھا مگر میری مشکل یہ تھی کہ میں بے وقت کھانا نہیں کھا سکتا۔ اس لئے بھوک تو تھی ہی، سیخ کے کباب گرم گرم آرہے تھے۔ دو تین کباب لے کر چکھے ہی کھالئے۔ البتہ جب اعلیٰ قسم کی آئس کریم کا دور چلا تو اس کی دو پیالیاں اور پھر کچھ پھل کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ بس اس طرح طعام شب تک کا سہارا ہو گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد ہی فوراً واپسی ہو گئی۔ سات بجے کے قریب ہوائی اڈہ پہنچے۔ یہاں چارٹرڈ ہوائی جہاز جو سب کو ایک ساتھ لے جائے، اس کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مسافروں کو آگے پیچھے مختلف پروازوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ ۸/ مارچ کو جناب حکیم عبدالحمید صاحب بھی لاہور پہنچ گئے تھے اور اس وقت ہمارے ساتھ تھے۔ حکیم محمد سعید صاحب نے میرے اور اپنے برادرِ بزرگ کے لئے پہلی پرواز میں ہی پشاور کے لئے روانگی کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس لئے ۸/ بجے شب میں ہم راولپنڈی سے اڑے اور نصف گھنٹے میں پشاور پہنچ گئے۔

مسلسل

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی علمی اور ثقافتی حیثیت تاریخ کی روشنی میں

(۲)

جناب ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب۔ لکچرار۔ شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ۔ یوپی

اپنے عہد کے سیاسی اور مذہبی خلفشار کے دوران انھوں نے اپنے گرامی قدر مرشد کی رہنمائی میں لوگوں کو محبت، انسانیت اور باہمی رواداری کا درس دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ خواص کی دُنیا میں گھلے ملے رہنے اور شاہانِ وقت سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کا معنوی اور روحانی رشتہ عوام سے برابر قایم رہا۔ خسرو کے بارے میں خیال ہے کہ فارسی، سنسکرت، عربی اور ترکی کے علاوہ اِن کو ہندوستان کی عوامی بولیوں مثلاً اَودھی، پنجابی، برج بھاشا، ہندی یا ہندوی) اور کھڑی بولی پر بھی عبور حاصل تھا۔ دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہندی (غالباً ہندوی یعنی ہندوستانی مراد ہے) میں بھی نظمیں کہی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ خود کہتے ہیں۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب　　شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے امیر خسرو آج بھی عوام میں مقبول اور متعارف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندوستان اور خصوصاً برج کے لوک گیتوں میں سے متعدد ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور گنگا اور جمنا کے پانی سے شاداب سرزمین آج بھی ان کے دوہوں (دوہرول) اور نغمہ بار گیتوں کی آہنگ اور لَے سے گونجتی نظر آتی ہے۔

خسرو ہی کے دم سے ہندوستان میں فارسی غزل نے اپنا صحیح مزاج و مقام حاصل کیا۔ ان کی غزل سرائی ہمیں سعدی کی پاکیزہ سادگی (جس کے وہ متبع ہیں) اور عراقی کے جذب وشوق، سوز دروں اور ذوقِ عشق کی یاد دلاتی ہے۔ خسرو کے کلام اور انبی کارناموں کا ایک نمایاں وصف وہ مقامی رنگ ہے جو جابجا جھلکتا ہے ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اُنھوں نے مثنوی سپہر میں یہاں کی آب و ہوا، پھلوں، جانوروں، چڑیوں، زبانوں، علوم اور مذہبی اعتقادات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اور اپنے وطن کی برتری دوسرے ممالک پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخی مثنویوں میں اہم واقعات کی طرف اشارے اور حوالے ملتے ہیں۔ خسرو کے چہیتے دوست اور پیر بھائی امیر نجم الدین حسن علا سجزی بدایونی معروف بہ حسن دہلوی نے بھی اپنے کلام میں رنگِ تغزل خوب نکھارا ہے۔ تاریخ فرشتہ کا مصنف ان کو سعدیٔ ہندوستان کے لقب سے یاد کرتا ہے

ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی نے جو ان دونوں کا قریبی دوست اور ہم مجلس تھا، حسن کی تالیفات نظم و نثر کا ذکر کرتے ہوئے ان کو (یعنی حسن کو) ذاتی اوصاف و کمالات اور اخلاقِ مرضیہ سے متصف بتایا ہے اور ان کی وجدانی غزلوں اور سلاستِ ترکیب اور روانیٔ سخن کی بہت تعریف کی ہے۔ (تاریخ فیروز شاہی، سید احمد خاں، ص ۳۵۹-۳۶۰) حسن کے کلام میں صفائی اور پاکیزگی، سوز و جذب بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس سے داخلی کیفیات و جذبات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں صاحبانِ فن و کمال تقریباً پانچ سال ملتان میں بلبن کے بڑے بیٹے شاہزادہ ملک محمد قاآن (خان شہید) کے دربار کے ادب نواز اور علم پرور ماحول

میں گزار چکے تھے خسرو کو مصحف داری اور حسن کو دوات داری کا عہدہ حاصل تھا۔
اس کے علاوہ ان بزرگوں نے دہلی سلطنت کے کئی عظیم المرتبت فرمانرواؤں کا دورِ حکومت دیکھا تھا اور دنیاوی زندگی اور حیاتِ معنوی دونوں کے حقوق بڑی وفاداری کے ساتھ ادا کئے تھے۔ ملفوظ ادب میں حسن دہلوی کی تصنیف "فوائد الفواد" ارشاداتِ شیخ اور تلقینِ مرشد کے موضوع پر ایک مستند شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک مختصر رسالہ "مخ المعانی" میں تصوف و معرفت کے نقطۂ نگاہ سے عشق کے موضوع پر بحث کی گئی ہے[1] شہزادہ محمد کی شہادت پر لکھا ہوا ان کا نثری مرثیہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔
فارسی زبان میں تصوف و عرفان اور شعر و ادب کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ہندوستانی صوفیوں سے ان کی وسیع المشربی کی بنا پر کم و بیش ہر فرقہ و مذہب کے لوگ نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کے معتقد بھی تھے۔ چشتی اولیائے کرام خصوصی طور پر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء المعروف بہ سلطان جی کی بلند نظری، آزاد خیالی اور وسیع المشربی اور ان کی با اخلاص محفلوں میں سماع اور موسیقی کا رواج بالواسطہ غزل کی مقبولیت اور اس کی ہر دلعزیزی کا سبب بنا۔ اور اس طرح شعر و شاعری اور تغزل کی جانب میلان عام ہوتا گیا۔ بہت سے صوفی بزرگوں کے اشعار و اقوال شاعری اور عرفان و حکمت کا خزانہ ہیں۔ چشتی سلسلے کے گراں قدر پیرِ طریقت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ (مشہور بہ قطب صاحب کے بارے میں عام خیال ہے کہ وہ نکتہ سنج شاعر بھی تھے[2] شیخ جمال الدین ہانسوی (بابا فریدالدین

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ بعنوان "مخ المعانی" از پروفیسر خلیق احمد نظامی، فکر و نظر، جنوری ۱۹۶۳ء حسن دہلوی کا دیوان حیدر آباد سے ۱۳۵۲ھ میں چھپ کر شائع ہو چکا۔

[2] ان کا صاحب دیوان ہونا مشتبہ ہے۔ لہٰذا ان کے نام سے مشہور مطبوعہ دیوان کی نسبت ان کی طرف غالباً صحیح نہیں ہے۔

شکر گنج کے خلیفہ) کے اشعار میں ذہنی و قلبی کیفیات اور عشقِ الٰہی کی جھلکیاں ملتی ہیں خسرو اور حسن کے معاصر حضرت شیخ شرف الدین (یا شاہ شرف الدین) بو علی قلندر رح پانی پتی (متوفی ۷۲۴ھ ۱۳۲۳ء) کے کلام میں تغزل اور تصوف اور شعریت اور تصورِ وحدت کا حسین امتزاج ملاحظہ ہو۔ عشق کو شاعری کی روح اور سببِ اصل بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

گر عشق نبودی و غم عشق نبودی — چندین سخن نغز کہ گفتی کہ شنیدی

گر عشق نبودی بخدا کسے نرسیدے — این ذوقِ محبت بہ جہاں کسے نہ چشیدے

گر ساقی وحدت سر خم خانہ کشودی — در شہر یکی عاقل و ہشیار نبودی

در یک نفسی ہر دو جہانِ پاک بسوزم — آندم کہ برآرم زدلِ سوختہ دودی[۲]

اس تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں جب کہ ہر چہار طرف تعلیم و تعلم، شعر و شاعری اور علم و فن کا بازار گرم تھا اور جا بجا تصنیف و تالیف کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ بزرگانِ دین ملک کے مختلف حصوں میں اپنی اپنی خانقاہوں اور جماعت

---

[۱] ۔ اخبار الاخیار (ص ۱۲۱) میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے تصنیف کردہ مکتوبات کا ذکر کیا ہے ۔ ان خطوط میں بھی بقول صاحب اخبار الاخیار معارف و حقائق توحید کا عنصر اور موضوع غالب ہے ۔ ایک مثنوی کنز الاسرار بھی ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے ۔

[۲] ۔ ایک عارفانہ غزل کے چند اشعار مجموعہ بنام کلام قلندری (مطبوعہ جگت پرکاش پریس میرٹھ) سے نقل کئے گئے ہیں۔ اور تعداد میں کل گیارہ ہیں ۔ ارمغان پاک میں اشعار ۲، ۳ اور ۴ کچھ فرق کے ساتھ اس طرح درج ہیں ۔

گر عشق نبودی بخدا کس نرسیدی — حسن ازلی پردہ ز رخ بر نگشودی

گر ساقی وحدت درِ میخانہ گشادی — در دہر یکی عاقل و ہشیار نبودی

ای بو علی این ہر دو جہاں پاک بسوزی — آندم کہ برآری ز دل سوختہ دودی

میرٹھ والے نسخہ میں ان بزرگ کے نام نامی یعنی شرف الدین کی رعایت سے مقطع میں تخلص شرف یوں باندھا گیا ہے ۔

برگور شرف فاتحہ خواند چو میرد — اخلاص بہم بر سرِ آن تحفہ درودی

خانوں میں دین ومذہب، نیکی، اخلاقِ حسنہ، انسان دوستی، زہد وتقویٰ اور بھائی چارگی کا درس دے رہے تھے۔ اور رشد وہدایت کے آبِ زُلال سے تشنگانِ معرفت وحقیقت کے لئے تسکین دل کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے قلب وروح کے تزکیہ کے سعیِ مشکور میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ان حالات کے تحت روحانی مجلسوں میں پیرِ طریقت کے اقوال و ہدایات، ارشادات اور تلقینات کے موضوع پر اس دور میں ایک مخصوص سرمایہ ادب وجود میں آیا۔ جس کی تاریخی اور ادبی حیثیت مسلّم ہے اور جس کو ہم ملفوظ لٹریچر کا نام دیتے ہیں۔ اس شعبۂ ادب میں اولیت کا درجہ غالبًا حسن دہلوی کی گراں قدر تصنیف فوایدالفواد (آغاز در ۷۰۷ھ و تکمیل در شعبان ۷۲۲، یا ۷۲۵ھ) کو حاصل ہے[1]۔ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جاچکا ہے۔ یہ اہم علمی اور ادبی کارنامہ جس میں تصوف و سلوک کے مختلف دقیق مسائل اور نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ دراصل ان کے چہیتے پیر حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ضیاءالدین برنی (مصنف تاریخ فیروز شاہی) اور میر خرد (صاحب سیر الاولیاء)

---

[1] اگرچہ روایت عام کے مطابق اس موضوع پر حسن سجزی سے پہلے حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے مرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزیؒ اجمیریؒ کے ملفوظات بعنوان 'دلیل العارفین' اور خود اُن کے لئے ان کے مرید اور خلیفہ حضرت فرید الدین شکر گنجؒ نے 'فوایدالسالکین' لکھ کر اس فن کی ابتدا کردی تھی، لیکن نقد و تحقیق کی روشنی میں ان دونوں تصانیف کی نسبت ان دونوں حضرات کی جانب مشکوک ہے۔ یہ دونوں رسالے مطبع مجتبائی دہلی سے چھپ کر شائع ہوچکے ہیں۔

کے بیانات کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے[1] کہ فوایدالفواد کو برنی نے دستور صادقانِ ارادت (و"در این ایام فوایدالفواد اور دستور صادقانِ ارادت شدہ است" - الخ) بتایا ہے - اور میر خرد نے لکھا ہے کہ سلطان الشعرار امیرخسرو علیہ الرحمتہ بکرات گفتے کاشکے تمامی کتب کہ عمر در آن صرف کردہ ام برادر امیرحسن را بودی و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردۂ اوست مرا بودی تا من بدان در دنیا و آخرت مباہات کردمی"

چودھویں صدی عیسوی (آٹھویں صدی ہجری) کے دوران اور اس کے بعد بھی ملفوظ ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا - اور متعدد کتابیں اس متصوفانہ موضوع پر ترتیب دی گئیں[2] - خالص علمی اور تہذیبی اعتبار سے

---

[1] - ملاحظہ ہو مقالۂ مخ المعانی' فکرونظر' جنوری ۱۹۶۳ء

[2] - اس اجمال کی تفصیل کے لیے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ ہو: "امیرحسن کے اس کامیاب تجربے نے دوسرے معاصرین کو اس طرف متوجہ کیا اور اوچہ (سندھ) سے لے کر منیر (بہار) تک ملفوظات کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ شروع ہو گیا - خود حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں خواجہ محمد بن مولانا بدرالدین اسحاق نے انوار المجالس، خواجہ عزیزالدین صوفی نے تحفتہ الابرار و کرامتہ الاخیار اور مولانا علی جاندار نے درر نظامیہ لکھ کر اس فن کو آگے بڑھایا - راجپوتانہ میں شیخ حمیدالدین ناگوری خلیفہ شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے ایک پوتے نے سرور الصدور اور نورالصدور میں اپنے دادا کے حالات اور ملفوظات جمع کیے - دکن میں شیخ برہان الدین غریب کے منسلکین میں تین بھائیوں مولانا عماد الدین، مولانا رکن الدین اور مولانا مجد الدین نے کئی گرانقدر ملفوظات ترتیب دیے - سندھ میں سہروردی سلسلہ کے بزرگ سید جلال الدین بخاری المعروف بہ مخدوم
(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ان تصانیف کی اہمیت اور خصوصیت اس بنا پر ہے کہ ان کے وسیلہ سے ہمیں ہندوستانی صوفیائے کرام کے مسالک، طریق تعلیم، افکار و عقاید، مجاہدات و مکاشفاتِ باطنی، اذکار و اشغال، اوراد اور مراحلِ سلوک سے متعلق مختلف چھوٹے بڑے مسائل کے بارے میں بڑی مفید اطلاعات حاصل ہوتی ہیں اور مختلف سلسلوں اور ان کے پیشواؤں کی مذہبی اور روحانی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے۔

فوایدالفواد کی تصنیف کے بعد اس شعبۂ ادب میں حمید قلندر کی لکھی ہوئی کتاب خیرالمجالس کو خاص اہمیت حاصل ہے[1] اس میں حضرت شیخ نصیرالدین محمود اودھی، چراغ دہلی یا روشن چراغ دہلی[2] کے[3] اقوال و ملفوظ جمع کیے گئے ہیں[3]۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جہانیاں کے تین ملفوظات — جامع العلوم، سراج الہدایہ اور مناقب مخدوم جہاں ترتیب دیے گئے۔ گجرات میں شیخ احمد کھٹو کے ایک مرید محمود بن سعد صدر صوفی ایرجی نے تحفۃ المجالس مرتب کی۔ بہار میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے کئی ملفوظات جمع کیے گئے۔۔۔۔ (ملفوظات کی تاریخی اہمیت، ندر عرشی۔ ص ۴۳۵ — ۳۶)۔

[1] - خیرالمجالس کو پروفیسر خلیق نظامی نے مع تصحیح و تعلیقات شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت شایع کیا ہے۔ خیرالمجالس کا اردو ترجمہ بنام سیرالمجالس شائع ہو چکا ہے۔

[2] - علی اصغر حکمت سابق سفیر ایران نے اپنی کتاب سرزمین ہند میں ان کو اسی لقب سے یاد کیا ہے

[3] - حضرت چراغ دہلی کو حضرت نظام الدین اولیاء سلطان جی، گنج معانی کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے (فرشتہ ج ۲، ص ۳۹۹)۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں اولیائے کرام اور مشائخ کے عرفانی پیغامات اور سلوک و طریقت کے مسائل جن کی بنیاد انھوں نے نیکی، خدمتِ خلق، انسان دوستی اور خلقِ عظیم جیسے اسلامی ارکان پر رکھی تھی۔ ان بزرگوں کی زبانی ہدایات اور ارشادات کے علاوہ فارسی زبان اور ادب ہی کے ذریعہ نشر و اشاعت کی منزل تک پہنچے۔ اس کا ثبوت ملفوظ ادب کے علاوہ (جس کا مختصر ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے) وہ مکتوبات اور رسائل ہیں جو اس عہد میں اور اس دور کے بعد بھی مرتب کئے گئے۔ مشہور صوفی بزرگ مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ (متوفی ۷۸۲ھ — ۱۳۸۰ء) کے مکتوبات مسلک و نظریات تصوف اور توحید و وحدت کے موضوع پر سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ :

"او را تصانیف عالی است، از جملہ تصانیف او مکتوبات مشہور و لطیف ترین تصانیف اوست، بسیاری از آدابِ طریقت و اسرارِ حقیقت در آنجا اندراج یافتہ"[۵۱]

معظمی صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مکتوبات، ملفوظات اور تصانیف کے ذیل میں متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے[۵۲]۔

مکتوبات کے علاوہ ان کی اہم تصانیف میں ارشاد السالکین، فوائد رکنی اور عقاید شرفی وغیرہ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

۵۱۔ اخبار الاخیار، ص ۱۰۹۔ ۵۲۔ ملاحظہ ہو بزم صوفیہ، ص ۳۷۷ بعد۔ صباح الدین صاحب نے (ایضاً ص ۳۸۲) لکھا ہے کہ "حضرت مخدوم الملک کی تمام تصانیف میں مکتوبات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور ان میں تصوف کے تمام رموز و نکات پر مدلل اور محققانہ مباحث ہیں" اسی ضمن میں وہ دوسری جگہ (ص ۳۷۷) لکھتے ہیں کہ "مکتوبات صدی میں تصوف کے تمام اہم مسائل پر مختصر مگر محققانہ مباحث ہیں۔ یہ مکتوبات ۷۴۷ھ میں لکھے گئے ہیں"

عہدِ علائی کے آغاز سے ہی ہندوستان میں فارسی شعر و شاعری کے علاوہ جس کی بنیادیں اب اس ملک میں بڑی مستحکم اور بار آور ثابت ہو رہی تھیں اور جو اپنے عروج و ارتقا کی منزلیں تیزی سے طے کر رہی تھی۔ علوم عقلی و نقلی نے بھی بڑا رواج پایا۔ علم تاریخ طب، علم نجوم، فلسفہ و حکمت اور اخلاق و تصوف ـــــ ان سب علوم کے متبحر اور باکمال علما اس زمانے میں موجود تھے۔ جن کے دم سے فضائل اور علمی اکتسابات کا چشمۂ فیض جاری ہوا اور جنھوں نے ان موضوعات پر تصانیف مرتب کر کے ہمارے ملک میں فارسی نثر نویسی اور فارسی میں قلمبند کئے گئے علوم کے سرمایہ میں معتد بہ اضافہ کیا۔

عصر علائی کے عجائبات اور امتیازی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے معاصر مورخ ضیاءالدین برنی نے دارالخلافہ دہلی کی عظمت اور اس کی تہذیبی علمی اور تمدنی حیثیت اور جلال و کمال کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"و دوم اعجب العجایب کہ بی ارادہ و اہتمام سلطان علاءالدین در تمامی عصر او عالمیان را معاینہ و مشاہدہ شد، اجتماع بندگان ہر قومی و استادان ہر علمی و ماہران ہر ہنری بودہ است و تختگاہِ دہلی از وجود آنچنان بی نظیران سواد اعظم گشتہ و دار الملک دہلی رشک بغداد و غیرت مصر و ہمسر قسطنطنیہ و موازی بیت المقدس شدہ ـ ـ ـ ـ ـ الخ"[1]

مختلف علوم و فنون کی تصنیفات اور تالیفات کے مطالعہ، دین و مذہب اور اخلاق و تصوف سے لگاؤ اس درجہ عام ہو گیا تھا کہ لوگ ان مضامین سے متعلق کتابیں ذوق و شوق سے خریدتے اور پڑھتے تھے۔ برنی لکھتا ہے:[2]

"و رغبت بیشتری متعلمان و اشراف و اکابر کہ بخدمت شیخ (مراد حضرت نظام الدین اولیاؒ) پیوستہ بودند در مطالعہ کتب سلوک و صحایف احکام شریعت مشاہدہ می شد و کتاب قوت القلوب، و احیاءالعلوم و ترجمہ احیاءالعلوم، و عوارف و کشف المحجوب

۱۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۴۱ ۔ (۲)۔ ایضاً ص ۳۴۶ ۔

وشرح تعرف و رسالہ قشیری و مرصاد العباد و مکتوبات عین القضاۃ و لوامع قاضی حمید الدین ناگوری و فوائد الفواد امیر حسن را بواسطہ ملفوظات شیخ خریداران بسیار پیدا آمدند و مردمان بیشتر از کتابہا از کتب سلوک و حقایق باز پرس کردندی ...“

اس ضمن میں برنی نے کافی تفصیل کے ساتھ اسی دور کے مشائخ و صلحاء مثلاً شیخ نظام الدین اولیاءؒ، شیخ علاؤ الدین، شیخ رکن الدین وغیرہ، سادات کرام، علماء عظام جیسے قاضی فخر الدین ناقلہ، مولانا تاج الدین کلاہی، مولانا ظہیر الدین بھکری، محی الدین کاشانی مولانا افتخار الدین برنی وغیرہ[1] اور ماہرین فن تجوید (قرأۃ) مذکرین (اس نے مذکرانی لکھا ہے) ندماء شاہ، شاعروں، مورخین اور اطباء اور دوسرے ہنرمندوں اور صاحبانِ فن کا ذکر کیا ہے۔ شعراء وقت میں شرفِ اولیت بالترتیب امیر خسرو اور امیر حسن کو دینے کے بعد وہ صدر الدین عالی، فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا عارف، عبد الحکیم شہاب انصاری جیسے صاحبِ دیوان سخنوروں کا ذکر کرتا ہے جو دربارِ شاہی سے مشاہرے پاتے ہیں۔ مورخین کے ذکر کے تحت اس نے متعدد نام لئے ہیں مثلاً امیر ارسلان کلاہی، کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی وغیرہ۔ آخر میں اس مبحث کا خلاصہ وہ یوں پیش کرتا ہے :-

”و اگر خواہم کہ جملہ مصنفان و منشیان و فاضلان و شاعران مشہور ذکر کنم از بسکہ بسیار بودہ اند نتوانم و از غرض باز مانم ..... الخ“[2]

---

[1] علماء کے بیان کے سلسلہ میں برنی نے لکھا ہے کہ صرف علاؤ الدین خلجی کے دور میں کم از کم ۴۶ ایسے دانشور علماء و فضلاء جمع ہو گئے تھے جن میں سے چند امام غزالی اور امام فخر الدین رازی جیسے حکماء کے معادل قرار دیئے جا سکتے تھے۔ (و بعضے از آن استادان در فنون علم و کمالات علوم بمادجہ غزالی و رازی رسیدہ بودند") اور جو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ مختلف علوم خلاً معقولات، تفسیر و فقہ، اصول دین، نحو و لغت، معانی و بدیع (علم بدیع) بیان و کلام اور منطق وغیرہ میں اپنے زبردست تبحر کی وجہ سے بخارا، سمرقند، بغداد، مصر و خوارزم، دمشق و تبریز، اصفہان ری و روم میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور جن میں سے کچھ کی شاگردی کا فخر خود برنی کو حاصل تھا۔ "و چہل و شش استاد مذکور کہ من اسامی ایشان نوشتہ ام۔ آنانند کہ من حد پیش بعضے تلمذ کردہ ام" تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۲ - ۳۵۴۔

[2] ایضاً ص ۳۶۰ - ۳۶۱)

اِن مستند شہادتوں کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس زمانے میں تہذیب و ثقافت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اور علم و دانشوری کا معیار بہت بلند تھا۔ شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی کثرت نے دہلی اور سلطنتِ دہلی کے وقار میں چار چاند لگائے تھے۔

علوم و فضائل اور ادب و شعر کے اس عام رواج سے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کو وہ سربلندی حاصل ہوئی کہ بآسانی معیار کے اعتبار سے ہندوستانی تخلیقات سرزمین ایران کی تصنیفات اور تالیفات کے مقابل پیش کی جاسکتی ہیں۔ فکر و فن کی اس وسعت اور جامعیت کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ اسی عہد سے ہندوستان میں فارسی لغت نویسی کا آغاز ہوا۔ اور یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ بعد میں کئی تصانیف اس شعبۂ ادب میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔ اگرچہ باقاعدہ طور پر فرہنگ نویسی کو فروغ پندرھویں صدی میں ہوا لیکن پروفیسر نذیر احمد کے بیان کے مطابق قدیم ترین لغات عہدِ علائی اور عہدِ تغلق ہی کی تصنیف شدہ ہیں۔ ہماری مراد فرہنگ نامہ قواس[۱] تالیف فخر الدین مبارک (یا مبارک شاہ) غزنوی[۲]۔ اور دستور الافاضل (تکمیل ۷۴۳ھ) تالیف رفیع[۳] ملقب بہ حاجب خیرات[۴] سے ہے۔ یہ دونوں اصحاب شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی اور بڑی حد تک انھیں ادیبوں کی علمی کوششوں نے بعد کے لغت نویسوں

---

[۱]۔ ایضاً ص ۳۶۲۔ [۲]۔ چونکہ یہ فرہنگ علائی دور میں لکھی گئی لہٰذا اس کا سنِ تصنیف ۶۹۵ اور ۷۱۹ھ کے درمیان قرار دیا جاسکتا ہے۔ مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو "ہندوستان کا قدیم ترین فارسی لغت یعنی فرہنگ نامہ قواس، مولفہ فخر الدین مبارک غزنوی" از پروفیسر نذیر احمد، فکر و نظر جولائی ۱۹۶۵ء۔ [۳]۔ تاریخ فیروز شاہی تالیف برنی (ص ۳۶۰) میں اس کا نام فخر الدین قواس لکھا ہے۔ اور اس کو خسرو اور حسن دہلوی کے ذکر کے بعد) اس عہد کے ممتاز شاعروں میں شمار کیا گیا ہے۔ دراصل برنی نے اس موقعہ پر ان مخصوص ادیبوں اور سخنوروں کا ذکر کیا ہے جو نظم و نثر کے استاد تھے اور دربارِ علائی سے متعلق تھے اور وظیفہ خوار بھی۔ [۴]۔ ان دونوں لغت نویسوں کے بارے میں اطلاعات پروفیسر نذیر احمد کے مقالوں سے ماخوذ ہیں۔ [۵]۔ ملاحظہ ہو مقدمہ لغت دستور الافاضل، ترتیب و تدوین از پروفیسر نذیر احمد، مطبوعہ بنیاد فرہنگ ایران، تہران۔ (۱) صاحب تاریخ فرشتہ نے بھی ان شعرا کے نام معمولی سی ترمیم و اختلاف کے ساتھ دیئے ہیں۔ مثلاً موخر الذکر کو وہ شہاب الدین صدر نشین لکھتا ہے۔ (تاریخ فرشتہ نول کشور، کانپور، ج ۱، ص ۱۲۲)

کے لیے زمین ہموار کی ۔ یہی وجہ ہے کہ پندرھویں اور سولہویں صدی کے تصنیف شدہ لغات میں اس دور کے کارناموں کا ذکر اور حوالہ بطور مآخذ ہمیں ملتا ہے ۔

علمی اور تہذیبی اعتبار سے سلاطینِ تغلق کے دور کو بھی بڑی نمایاں حیثیت حاصل تھی ۔ اس عہد میں ہم کو اربابِ کمال اور صاحبِ تصانیف حضرات کی ایک بڑی جماعت نظر آتی ہے جنھوں نے مختلف موضوعات اور عنوانات پر قلم اٹھایا ۔

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا تجربہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا ۔ اس دور سے پہلے اس موضوع پر تحریر شدہ کارناموں کا اجمالی تذکرہ پیش کیا جا چکا ہے ۔ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری ــــ چودھویں صدی عیسوی) کا اہم ترین تاریخی شاہکار ضیاء الدین بن موید الملک رجب برنی[۱] (پیدائش ۶۸۴ھ ، ۱۲۸۰ء) کی تاریخ فیروز شاہی (تالیف ۱۳۵۷ء) ہے جس کا ذکر ضمناً پہلے آچکا ہے ۔ یہ کتاب آج بھی قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخی کے لئے اعلیٰ ترین مآخذ میں شمار کی جاتی ہے تاریخ فیروز شاہی کے علاوہ اس کی دوسری مشہور تصنیف فتاوائ جہانداری[۲] ہے جو تاریخ فیروز شاہی کے بعد مرتّب کی گئی ۔ باقی

---

[۱] ۔ مصنف سیر الاولیاء میر خرد (خورد) نے جس کا ذکر آیندہ سطور میں آئے گا ۔ ضیاء برنی کے بارہ میں مفید اطلاعات درج کی ہیں

[۲] ۔ جس کا موضوع بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی تاریخ نہیں بلکہ فلسفۂ علمِ سیاست یا سیاسیات ہے ۔

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہمِ قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سیریہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام (یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا)۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو دوبارہ مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ [illegible] تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد نمبر ۷۷ | بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۶ء | شمارہ نمبر ۳

فہرست مضامین

نظرات

قرآنِ مجید کی رو سے یہود اور عیسائی دونوں اہلِ کتاب ہیں اور اس حیثیت سے قانونی طور پر دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں تک ذاتی اعمال وافعال اور قومی مزاج اور طبیعت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے دونوں میں بہت کچھ فرق و امتیاز کیا گیا ہے۔ یہود کی نسبت صاف ارشاد ہوا: "لتجدنّ اشدّ الناس عداوۃً للذین آمنوا الیھود" ایمان والوں کے شدید تر دشمن آپ یہود کو پائیں گے۔ اس کے بالمقابل فوراً ہی نصاریٰ کے متعلق فرمایا گیا۔ ولتجدنّ اقربھم مودۃً للذین آمنوا الذین قالوا انا نصٰریٰ ذٰلک بانّ منھم قسّیسین ورھباناً وانھم لا یستکبرون ۰ واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تریٰ اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشٰھدین ۰ (مائدہ) اور اے پیغمبر ایمان والوں کا سب سے زیادہ قریبی دوست آپ ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں پادری (Clergy man) اور راہب (Monk) ہوتے ہیں اور یہ گھمنڈ نہیں کرتے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ جب یہ محمد الرسول اللہ پر نازل کی ہوئی وحی سنتے ہیں تو ان کی آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں۔ حق کو پہچان لینے کے باعث اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اور تو ہم کو شہادت دینے والوں کے ساتھ درج کردے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کا گوشۂ خاطر نصاریٰ کے بارہ میں کس
قسم کا ہے اور وہ انھیں کس نظر سے دیکھتا ہے لیکن جنگ کا بُرا ہو، دو حقیقی بھائیوں
میں بھی برپا ہو جائے تو صلہ رحمی کے تمام رشتے اور تقاضے منقطع ہو جاتے ہیں۔ صلیبی جنگوں
نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کا شدید دشمن اور حریف بنا دیا۔ اسی دشمنی
کا نتیجہ تھا کہ عیسائی مشنریز نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور اسلام
کے خلاف غلاظت اچھالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مسلمان علمی طور
پر دفاع میں جو کچھ کر سکتے تھے وہ انھوں نے کیا۔ چنانچہ کم و بیش دنیا کی ہر قابلِ ذکر زبان
میں مسلمانوں نے کثرت سے ایسا لٹریچر شائع کیا جو عیسائی مشنریز کے اعتراضات کا
جواب مہیا کرتا اور ان کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کرتا تھا۔

یورپ میں علوم و فنون اور سائنس کو جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اس کی وجہ سے لوگوں
میں حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کے ساتھ معروضی اور سائنٹیفک طریقِ فکر پیدا ہوا ہے اور اس کا
نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی تعصب کی گرفت بہت ڈھیلی ہو گئی ہے۔ لوگ حقائق پر کشادہ دلی سے
غور کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں اس کے ساتھ اتنا اور اضافہ کیجئے کہ پوری دنیا میں اس
وقت سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کا جو مرتبہ و مقام ہے اس نے ان کے بڑے
سے بڑے مخالف اور دشمن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے متعلق تہذیب اور شائستگی
کے ساتھ اظہارِ خیال پر مجبور کر دیا ہے۔ غرض کہ یہ تین اہم اسباب ہیں جن کی وجہ سے آج
اسلام کے متعلق عیسائیت کے نقطۂ نظر میں بہت کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں بہت
بڑا دخل کمیونزم کے فروغ کا بھی ہے۔ اہلِ مذاہب سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلہ کی کامیاب
صورت یہی ہو سکتی ہے کہ سب مذاہب اپنے اختلافات سے صرفِ نظر کر کے خدا کے عقیدہ
کی بنیاد پر ایک ہو جائیں۔ اور منکرینِ خدا اور مذہب کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ بنائیں۔

اس سال فروری میں لیبیا میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان مکالمہ کے لئے جو ایک عظیم کانفرنس ہوئی تھی اس کی روئداد نوائے وقت (پاکستان) سے نقل کرکے معارف اعظم گڑھ کی اگست کی اشاعت میں طبع ہوئی ہے جو بڑی دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے اس سے معلوم کر کے مسلمانوں کو بے حد مسرت ہوگی کہ اس کانفرنس میں کارڈینل سرگیو پگنوڈلی جو مسیحی دنیا کی ایک عظیم شخصیت ہیں اور موجودہ پاپائے روم کے بعد اس عہدۂ جلیلہ پر انھیں کے فائز ہونے کی توقع ہے۔ چنانچہ جب وہ کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تو لیبیا کے سربراہِ مملکت کرنل قذافی نے خود ان کا استقبال کیا اور بڑے جوش سے انھیں خوش آمدید کہا۔ انھوں نے کانفرنس میں علانیہ فرمایا۔

"ہم سب عیسائی مسیحیت کے نام پر ان الفاظ پر اظہار معذرت کرتے ہیں اور طالبِ عفو ہیں جو محمد الرسول اللہ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ کی ذات کے بارہ میں کہے جاتے رہے ہیں اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کہ اس کانفرنس میں لبنان کے لارڈ بشپ گرگوار حداد نے تو اختتامی اجلاس کے موقع پر عیسائیوں کو خود ہی یہ دعوت پیش کردی کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کرلی جائے۔ اس موقع پر انھوں نے یہ الفاظ بطور تجویز دہرائے۔ ترجمہ: ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد اللہ کے رسول اور تمام انسانیت کیلئے اللہ کے نبی ہیں۔ (معارف ص ۱۳۰)

جرمنی سے ابھی حال میں قرآنیات پر مضامین ومقالات کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس کو پروفیسر رودی پیرٹ نے مرتب کیا ہے، مضامین انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی تینوں زبانوں میں ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک مقالہ جرمنی اسکالر یوخان فک کا "The originality of the Arab Prophet" کے عنوان سے ہے۔ اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عقیدت وارادت کا جو اظہار کیا ہے وہ دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مقصود تخلیقِ کائنات

(۵)

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

رضوان اللہ ——— فتح مبین

جنگِ اُحد نے مسلمانوں کی کلّی تطہیر کردی، اللہ تعالیٰ نے طیّب و خبیث کا امتیاز کردیا منافقین پر اعتماد ختم کردیا گیا۔ اہلِ ایمان نے غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد کے بعد غزوۂ خندق میں روائتی ایمان، خلوص، ایثار، استقامت اور جاں نثاری کا ثبوت دیا، جس سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ نے انھیں کامیابیوں اور کامرانیوں کا وعدہ دیا، اور اگر اس سے قبل پانچ سال تک اہلِ ایمان اپنے دین، جان، مال اور اور حریتِ ضمیر کے لئے مدینہ اور اُس کے قرب و نواح میں مدافعت پر مجبور تھے، تو اب اُن کے مخالفین کے حوصلے پست ہونے لگے، اردگرد کے قبائل کے قلوب میں اِن کا رُعب بیٹھ گیا اور اِن کی اہمیت محسوس ہونے لگی، مسلمانوں کو پیش قدمی کا حوصلہ اور موقع ملا، اور وقت آگیا کہ پانچ سال قبل یکم محرم الحرام کو مدینہ میں جس اسلامی ریاست اور مربوط مسلم معاشرہ کی اساس رکھی گئی تھی، اُس کا دائرہ اثر مستحکم بُنیادوں پر وسیع ہو، اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے) کا خدائی وعدہ پورا ہو، حجاز اور فلسطین کی مقدس زمین اور دیگر ممالک پر مطہر و مزکّٰی ملتِ ابراہیمؑ، خدا کی موعود اُمت، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ جماعت اسلام

کا علم لہرائے اور بحر و بر کے فساد زدہ ربعِ مسکون کو عدل و انصاف اور امن و آشتی کا گہوارہ بنا دے۔

سنہ ۶ھ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤیا دیکھا کہ آپؐ اپنے مہاجر و انصار جاں نثاروں کے ساتھ، بے خطر، سر منڈواتے، بال ترشواتے خانۂ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں، اسے حکمِ الٰہی یقین کر کے آپؐ نے اہلِ ایمان کو حج کی تیاری کا حکم دے دیا، وہاں تو اشارہ کی دیر تھی، شک و انکار کی کہاں گنجائش تھی، مہاجرینِ مکّہ تو فطری طور پر مکّہ کو لوٹنے کے لئے بے قرار ہوں گے۔ انصار اور دیگر مسلمان بھی چھ سال سے زیارتِ بیت اللہ سے محروم تھے اوّل تو رحمت و رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ تمام خطرات پر غالب آگیا ہوگا، اور اب تو ان کا ارادہ ذی قعدہ کے ماہِ حرام میں سفرِ حج کا تھا جس میں عرب جنگ کو حرام سمجھتے تھے، پھر انھوں نے قربانی کے جانور ساتھ لئے تھے، اور ہتھیار بھی محض سفری ضرورت کے لئے ہمراہ تھے، جنگ کے خیال سے نہ لئے تھے۔

لیکن قدرت کا ارادہ فتوحات کے نئے ابواب کھولنے کا تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اسلامی لشکر کو اب منافقین سے پاک کر دیا جائے، یہ منافقین جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تباہی کی توقعات لئے بیٹھے تھے، پھر جنگِ اُحد میں جنگ سے قبل ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے، اور جنگِ خندق میں عین محاصرے اور دباؤ کی شدت میں اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ (ہمارے گھر دشمنی کی زد میں ہیں) کی آڑ میں راہِ فرار اختیار کر گئے تھے، پھر اب تو جنگ نہ تھی، کہ یہ لوگ شرکت پر مجبور ہوتے، انھیں تو موت کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا تھا، جب آنحضرتؐ نے حج کی تیاری کا اعلان کیا، تو منافقین کو یوں محسوس ہوا کہ قریشِ مکّہ نے مسلمانوں پر حملہ کر کے سب کو تہِ تیغ کر دیا ہے، پس وہ شریک نہ ہوئے اور جب آں حضرتؐ اصحاب کے ساتھ صحیح و سلامت مدینہ لوٹ آئے، تو عذر کیا کہ ہم کاروبار اور خانگی معاملات میں اُلجھے رہے، اس لئے شریکِ سفر نہ ہو سکے، ہمارے لئے آپ دعائے مغفرت کیجئے، دراصل یہ محض دروغ اور عذرِ لنگ تھا، چنانچہ خدا نے ان کے کذب کی تردید کرتے ہوئے کہا:۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

(تمہارا معروضیت کا عذر بالکل ہیچ ہے) بلکہ تم نے تو یہ گمان کیا تھا، کہ رسولؐ اور مومنین اپنے اہل

وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا (الفتح) عیال کی طرف کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ بات تمھارے دلوں کو اچھی لگی، اور تم بُرا خیال دل میں لاتے، اور تم تو ہلاک شدہ قوم تھے"

منافقین کے برعکس اُمتِ مسلمہ کے ایثار، خلوص، حُبِّ ایمان اور فنافی الرسول ہونے کی عجیب کیفیت تھی، وہ سب اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں، انصار کھیتی باڑی میں لگے ہیں، تو مہاجرین کاروبارِ تجارت میں منہمک، ایک طبقہ دستکاریوں میں اُلجھا ہوا ہے تو دوسرا نانِ جویں کے لئے محنت و مشقت کر رہا ہے کہ اچانک جہاد کا اعلان ہوتا ہے۔ پھر کیسی کھیتی باڑی اور کہاں کی تجارت، سود و زیاں کا احساس روک نہیں بنتا اور یہ حزب اللہ کاروبار، فصلیں، مال و دولت، اہل و عیال، غرضیکہ دُنیا کی ہر محبوب شے چھوڑ چھاڑ کر میدانِ وغا میں پہنچ جاتے ہیں۔ تاکہ راہِ حق میں شہادت نصیب ہو جائے، دس سال کی قلیل مدت میں اَسّی (۸۰) بار بلاوا آیا، گویا ہر لمحہ پابہ رکاب تھے، یوں معلوم ہوتا ہے، کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی اور رحمتِ الٰہی نے آیندہ زندگی کی نعمتیں ان کے سامنے لا رکھی تھیں، اور وہ دیوانہ وار اُن کی طرف لپک رہے تھے، یہی کچھ کیفیت ہمیں سفرِ حج میں ان کی شرکت سے محسوس ہوتی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سفر امن و سلامتی کا نقیب تھا، ارادہ حج بجائے خود امن کی علامت تھا اور یہ بات سرکارِ دو عالم کی شان سے بعید تھی کہ آپؐ اہلِ ایمان سے غلط بیانی کرتے، اور آپؐ کے دل میں کوئی دوسرا عزم ہوتا، پھر یہ سفر ذی قعدہ کے ماہِ حرام میں کیا گیا تھا جس میں جنگ ممنوع تھی، مسلمانوں کے پاس کافی مقدار میں جنگی ہتھیار بھی نہ تھے، اور اس حالت میں مقدسین امت کا قافلہ خطرات کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کی نیک نیتی اور سلامت روی کا یہ واضح ثبوت تھا کہ کفار کے ایک مختصر سے دستے نے آپؐ کا راستہ روکنا چاہا تو آپؐ نے خونریزی سے بچنے کے لئے راستہ تبدیل کر لیا، اور ایک دشوار گذار راہ سے سفر کر کے مکہ سے چند میل دور حدیبیہ کے مقام پر اُتر پڑے۔ تاکہ اپنے ارادہ حج کے ضمن میں اگر کوئی غلط فہمی کا امکان ہو تو قریش کے ساتھ گفتگو کر کے اسے دور کر دیا جائے۔ پھر

یہاں بھی قریش کے اَسّی (۸۰) جنگجوؤں نے شہرِ الحرام کا احترام ترک کر کے مسلمانوں پر اُس وقت حملہ کر دیا جب وہ نماز ادا کر رہے تھے، مگر مسلمانوں نے انھیں گھیر کر گرفتار کر لیا، اور حضورؐ نے خیر سگالی اور امن شعاری کی بنا پر انھیں رہا کر دیا۔

قریشِ مکہ کی طرف سے اشتعال انگیزی کی ابتداء ہو چکی تھی - اور مسلمانوں کی طرف سے اس کے برعکس تحمّل، نرمی اور صلح پسندی کا مظاہرہ ہو رہا تھا جو طبعاً گوارا نہ تھا۔ لیکن مسلمان تو اب اتباعِ رسالت مآب میں فنا ہو چکے تھے۔ جس کا کامل ترین مظاہرہ اِسی مقام پر صُلح حُدیبیہ کے وقت ہوا اور طبعی جذبات اور اتباعِ نبوی کے مابین شدید کشمکش کے بعد اُمّتِ مسلمہ فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کے جس بلند و اَرفع مقام پر پہنچ چکی تھی وہ نوعِ انسان کے لئے تا ابد مشعلِ ہدایت کا کام دیتا رہے گا۔

حُدیبیہ کے مقام پر نزول کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریشِ مکہ کو کہلوا بھیجا کہ ہمارا ارادہ محض حج کرنے کا ہے۔ جس کے بعد ہم پُر امن طریق سے مدینہ کو لوٹ جائیں گے۔ لیکن قریش نے غرور و نخوت کے زیرِ اثر قاصد کے اونٹ کو مار ڈالا، اور اپنی شان میں گستاخی سمجھ کر قاصد کو قید کر دیا، مگر آں حضرتؐ پھر بھی مایوس نہ ہوئے اور خیر سگالی کے جذبہ سے اب کے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بھیجا جو رئیسِ مکہ ابو سفیان کے قریبی عزیز، بنی اُمیہ کے چشم و چراغ اور مکہ میں خاص قدر و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، نیز آں حضرت صلعم کے مخلص، معتمد اور جاں نثار ہونے کے علاوہ آپؐ کے دوہرے داماد بھی تھے، اور اس وجہ سے بحیثیت سفیر ممتاز مقام رکھتے تھے۔

قریشِ مکہ نے حضرتِ عثمانؓ کو تنہا تو عمرہ کی اجازت دی - مگر آں حضرتؐ اور آپؐ کے باقی اصحاب کو اجازت دینے سے انکار کر دیا، جس پر سیدنا عثمانؓ نے اپنے آقا اور برادرِ دینی کے بغیر عمرہ کرنے سے انکار کر دیا، جب سیدنا عثمانؓ کو واپس جانے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی تو حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرتِ عثمانؓ شہید کر دئے گئے ہیں، مکہ معظمہ میں حرمت والے مہینے میں، حارمِ بیت اللہ مسلمانوں کے سفیر کا قتل ایسا جرم نہ تھا کہ ڈیڑھ ہزار مجاہدینِ اسلام کا سرفروش گروہ اسے نظر انداز کر دیتا، آں حضرت صلعم نے محسوس کیا کہ حضرت عثمانؓ کے خون سے درگزر کرنا بہت

سے خطرات کا پیش خیمہ ہوگا اور عین ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خاموشی کو کمزوری پر محمول کر کے کفار قریش بظاہران نہتے مسلمانوں کے وجود کے لئے خطرہ پیدا کر دیں اس لئے آپ نے سفیر اسلام حضرت عثمانؓ کے خون کا انتقام لینے کے لئے تمام اہل ایمان سے موت کی بیعت لی، یہ بیعت تاریخ میں بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے۔ کیوں کہ اس بیعت سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کا مژدۂ جانفزا سنایا تھا۔ اہل بصیرت غور فرمائیں۔ کہ آں حضرت صلعم کے نام لیوا جاں نثار کس پائے کے انسان تھے۔ گھر سے حج بیت اللہ کے لئے چلے ہیں، جنگ کا ارادہ ہوتا تو شہادت کے خیال سے بال بچوں اور مال ومتاع کا کچھ انتظام کرتے، پوری طرح مسلح ہو کر آتے، اس کے برعکس ایک امن پرور فریضہ کی ادائیگی کے لئے نکلے ہیں۔ بال بچے گھروں میں مطمئن بیٹھے ہیں۔ یہ بندگانِ خدا چند دنوں کے بعد گھروں کو لوٹنے اور کاروبار سنبھالنے کی امید میں ہیں، کہ اچانک آنحضرت صلعم جان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیا کسی قلب میں اضطراب پیدا ہوا؟ کیا کسی کے ایمان میں کمزوری نے سر اٹھایا؟ کیا کسی کے پاؤں میں لغزش آئی؟ کیا کسی کو بال بچوں اور مال کی محبت نے بے چین کیا؟ ان میں کسی ایسی بات کا نام ونشان تک نہ تھا، اور انھوں نے دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو کر اپنا سب کچھ اپنے محبوب کے حوالے کر دیا

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ (الفتح: ۱۰)

"وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، پس جو کوئی یہ بیعت توڑتا ہے وہ اپنی جان کے نقصان کے لئے ہی توڑتا ہے۔ اور جو اسے پورا کرتا ہے جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا ہے۔ تو وہ اسے بڑا اجر دے گا"

جس خلوص اور جذبۂ پاک سے یہ بیعت کی گئی وہ خدا کے ہاں مقبول ہوئی ان میں سے کسی

ایک فرد نے بھی عہد سے انحراف نہ کیا، اور جو عہد انھوں نے رسول کی وساطت سے اللہ جل شانہٗ سے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انھیں حسب وعدہ اجرِ عظیم عطا ہوا۔ جیسا کہ اسی بیعت اور ایفائے عہد کی شہادت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (الفتح: ۱۸)	"یقیناً اللہ مومنوں سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔ سو اس نے جان لیا جو ان کے دلوں میں تھا، پس ان پر تسکین نازل کی اور انھیں بدلہ میں ایک قریبی فتح دی اور بہت سے مالِ غنیمت بھی جو وہ لیں گے اور اللہ غالب حکمت والا ہے"

تاریخ کے اوراق الٹ جائیے، دُنیا کا کونہ کونہ چھان لیجئے، اور کسی دوسرے ایسے گروہ کی تلاش کیجئے، جسے اللہ تعالیٰ نے اس قدر بڑا اعزاز بخشا ہو، "اللہ تعالیٰ درخت کے نیچے اپنے رسول کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں سے راضی ہو گیا" یہ الفاظ تو صرف اسی ایک اُمت کے مقام کی رفعت اور تقدیس پر گواہ ہیں اور اس سند کی اساس اس بے نظیر، پاکیزہ ایمانی کیفیت پر ہے۔ جو بیعت کرتے وقت ان کے قلوب میں موجزن تھی (فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ) اور اسی کیفیت کا علم رکھتے ہوئے، ستائش کنندہ خدائے علیم و خبیر خود ہے، گویا کہ بیعت کرنے والوں میں سے ہر ایک نے خلوص کی انتہائی بلندی پر ایفائے عہد کیا، جس کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں علی الاعلان کر دی اور اس پر خوشنود ہو کر ایک تو دشمن کے درمیان وطن سے دور انھیں تسکین کی دولت سے مالا مال کر دیا، پھر انھیں قریبی فتح دے کر خوشنودی کا عملی ثبوت مہیا کر دیا، اور انھیں آیندہ کثیر مالِ غنیمت اور فتوحات کا وعدہ دے کر قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا وارث ٹھہرایا اور اس طرح بیعت رضوان کے شرکا میں سے ایک ایک فرد کے تا ابد مومن کامل ہونے کا اعلان فرما دیا۔

اس سفر میں اصحابِ رسول، السابقون الاولون، اپنے محبوب آقا کے اشارے پر موت کی بیعت کرنے والی اُمّتِ مسلمہ کے کردار کا ایک اور روشن پہلو عجیب آب وتاب سے دُنیا کے سامنے آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں کے سامنے ' إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ کے الفاظ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا، آج وہ آیۂ استخلاف کی حقیقی مصداق، اُمّتِ محمدیہ کے کردار سے آشکار کر دی چنانچہ جب قریشِ مکہ کو بیعتِ رضوان کی سنگینی کا احساس ہوا تو اُنھوں نے صلح کی طرف ہاتھ بڑھایا، سیدنا عثمانؓ تو صحیح وسلامت اپنے آقا سے آملے، گویا کہ بیعت سے خدا کو محض عثمانؓ کے مقام کا اظہار اور اُمّت کا تزکیہ مقصود تھا، اس بیعت کی تہ میں کوئی مصلحت ربانی ونبوی تھی، کہ خود حضورؐ نے اپنے ایک دستِ مُبارک کو سیدنا عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر عثمانؓ کی طرف سے آپ بیعت کی، اور اس طرح مومنین پر اس بیعت اور خونِ عثمانؓ کی عظمت واضح کی، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس بیعت میں نبی کریمؐ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ بیان کیا، اور یوں سب کو تائیدِ الٰہی کی بشارت دی،

پس کفار نے اپنا ایک نمایندہ صلح کے لئے آں حضرتؐ کی خدمت میں بھیجا اور اُس نے درج ذیل شرائطِ صلح پیش کیں،

۱۔ دس سال تک باہم صلح رہے گی، دونوں طرف آمد و رفت میں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔

۲۔ جو قبائل چاہیں قریش سے مل جائیں۔ جو چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں، ان قبائل کے حقوق بھی فریقینِ معاہدہ جیسے ہوں گے۔

۳۔ مسلمانوں کو آیندہ سال عمرہ کرنے کی اجازت ہوگی مگر وہ ہتھیار بند نہ ہوں۔

۴۔ اگر قریش میں سے کوئی مسلمان ہو کر مدینہ آجائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ لیکن کوئی مسلمان قریش کے پاس چلا جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

پہلی دو شرائط بلاشبہ مسلمانوں کے حق میں تھیں، کیوں کہ وہ تو خود جنگ کے خلاف تھے، صلح کے بعد انھیں ہر جگہ آزادانہ تبلیغ کا موقع ملا جس کے مفید نتائج نکلے، اور عرب میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔

اس کے علاوہ قریش کے خوف سے آزاد ہوکر کئی قبائل مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ نیز مسلمانوں نے قریش کی طرف سے مطمئن ہوکر یہود اور دیگر سرکش قبائل کا زور توڑا اور اس طرح اپنا دائرۂ اثر کافی وسیع کرلیا، لیکن صلح کی تیسری اور چوتھی شرائط بادی النظر میں مسلمانوں کے لئے ہتک آمیز تھیں، مسلمان حکمِ الٰہی کے ماتحت حج کے لئے نکلے تھے، اور حج کئے بغیر لوٹنا ذلت کا باعث سمجھتے تھے، پھر انھیں اپنی قوت اور برتری کا یقین تھا۔ وہ قلّتِ تعداد کے باوجود قریش کو کئی بار نیچا دِکھا چکے تھے، اور اب تازہ عزم اور بیعت نے اُن کے دِلوں میں نیا اعتماد پیدا کردیا تھا، پھر وہ سمجھتے تھے، کہ حج ان کا دینی فریضہ اور حق ہے، اور کسی کو یہ اختیار نہیں کہ انھیں اس کی ادائیگی سے روکے، پھر یہ شرط بھی ناقابلِ قبول تھی کہ نومسلم قریشی کو تو کفار کے حوالے کردیا جاتے۔ اور جو مسلم کفار کے ہاں چلا جائے، اسے واپس نہ کیا جائے۔ پس اہلِ ایمان کے قلوب میں اضطراب کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اور اس بے چینی کا اظہار مختلف پیرایوں میں کیا جانے لگا۔ لیکن آں حضرتؐ ان شرائط کو منظور کرچکے تھے، بشریت اور ایمان کے درمیان یہ کشمکش شدت سے جاری تھی، تاہم اُمتِ مسلمہ کی محبت اور جذبۂ اتباعِ رسولؐ پہلے بھی بارہا غالب رہا تھا، اور اب بھی یہ جذبہ متزلزل نہ ہوا، ابھی معاہدے کے الفاظ ختم ہی ہوئے تھے مگر ضبطِ تحریر میں نہ آیا تھا۔ کہ نومسلم ابوجندلؓ قریش کی قید سے بھاگ کر آں حضرتؐ سے پناہ کے طالب ہوئے مگر آں حضرتؐ تو عہد کے پابند ہوچکے تھے۔ اس لئے ابوجندلؓ کو واپس کردیا، ابوجندلؓ نے ملتجی نگاہوں سے مسلمانوں سے فریاد کی، مسلمان تلملاکر رہ گئے لیکن آں حضرتؐ کے فیصلے کے سامنے کسی شخص کو بھی اُف کرنے کا حوصلہ نہ پڑا، اور کفار مکہ پندرہ سو تلواروں کے درمیان سے ابوجندلؓ کو زنجیروں میں جکڑ کر لے گئے ضبطِ نفس اور اطاعتِ رسولؐ کے مقابل بشری احساسات پر قابو پانے کی اس سے بہتر اور عمدہ مثال کہاں ملے گی۔ دراصل آں حضرتؐ کی بعثت کی غرض ہی ایک مثالی جماعت کا قیام تھا اور صلح حدیبیہ نے آپؐ کی کامیابی کی تصدیق کردی۔

صلح حدیبیہ کے بعد ضروری تھا کہ آسمانِ رُشد و ہدایت کے یہ شمس و کواکب مدینہ لوٹ آئیں چنانچہ مسلمانوں نے آں حضرتؐ کی اتباع میں قربانی کے جانور ذبح کئے، اور عازمِ مدینہ ہو گئے، ابھی زیادہ دور نہ گئے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اہلِ ایمان کو وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت ملی،

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا (الفتح: ۱-۲)

"ہم نے اے اُمّتِ مسلمہ تجھے ایک کھلی فتح عطا کی تا کہ اللہ تیرے ان قصوروں کے بُرے اثرات سے تجھے بچائے جو اس سے پہلے تجھ سے سرزد ہوئے یا بعد میں سرزد ہونے کا امکان ہے اور اپنی نعمت تجھ پر تمام کرے اور تجھے سیدھے راستے پر چلائے اور تجھے زبردست نصرت سے نوازے"

اس فتح مبین کا مخاطب گروہ مسلمین ہے، آں حضرتؐ کی ذاتِ مبارک نہیں کیوں کہ صلح حُدیبیہ تو خود آپؐ نے حکمِ الٰہی سے کی تھی، اور آپؐ اس سے کُلّی طور پر مطمئن تھے، اور اس کے نتائج کے حسن و قبح سے کما حقہٗ آگاہ تھے، بے چینی اور اضطراب تو آپ کے ہمرکاب اصحاب کو تھا، اور انھیں ہی تسکین کی ضرورت تھی، انھوں نے ہی پہلی جنگوں میں غلطیوں (سَیِّئَات) کا ارتکاب کیا تھا، ان ہی سے بعد میں آں حضرتؐ کی حیاتِ طیبہ اور بعد میں غلطیوں کا اندیشہ تھا، ان ہی پر اتمامِ نعمت ہونا باقی تھا۔ جیسا کہ بعد میں اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کے الفاظ سے واضح ہے۔ انھیں ہی صبر آزما حالات میں قدم قدم پہ ہدایت اور استقامت کی ضرورت تھی، اور انھیں ہی مزید نصرت کے وعدے مطلوب تھے، چنانچہ اس کے معًا بعد فرمایا:-

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ (الفتح ۴)

"اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے قلوب میں تسکین نازل کی تا کہ ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو"

ایک اہم بات جو اُمّتِ مسلمہ کی عظمت پر شاہد ہے یہ ہے کہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ

کے کلماتِ تحسین، بشارات اور فتح مبین کا اعلان اور مستقبل قریب و بعید میں دور دراز ملکوں پر غلبہ و تسلط کا وعدہ صلح حُدیبیہ میں ان کی کامل آزمائش اور اس میں کامیابی کے بعد اُس وقت ہوا جب کہ وہ بظاہر بوجھل دلوں کے ساتھ لوٹ رہے تھے، آپ ان کی خوشی کا اندازہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بظاہر ناکام مہم کو فتح مبین ٹھہرایا۔ اور انھیں اس بات کی از حد سیادہ مسرت ہوئی کہ ان سے ایک بھی ایسی اضطراری حرکت سرزد نہ ہوئی۔ جو خدا کی ناراضی کا موجب ہوئی ہو، اور اس کی تصدیق لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ کے پیارے یقین افزا الفاظ سے ہوئی، اور وہ اس خوشی کے ساتھ لوٹے کہ دشمنوں کے مقابل ان کی گذشتہ اور آئندہ لغزشوں اور کوتاہیوں پر قلمِ عفو کھینچ دیا گیا ہے۔ ان پر فتح عالم کے دروازے بھرپور وسعت کے ساتھ کھول دئے گئے ہیں، اور انھیں دین و دنیا کی کثیر نعمتیں میسر ہوں گی، کیا صُلح حدیبیہ نے امت کو اس مقام پر نہیں پہنچا دیا جہاں اسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام دیکھنے کے متمنی تھے؟

نئے دور کا آغاز قرآن حکیم نے إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ کی شرط کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کو أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ کا مژدہ سنایا تھا، إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ کا نقطۂ عروج حُدیبیہ کا میدان ثابت ہوا، جہاں امتِ مسلمہ کو رضائے الٰہی کا تاج پہنایا گیا، اور اس پر نئی فتوحات کے دروازے کھولے گئے، اسی موقع پر یہ بشارت بھی دی گئی،

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ (الفتح)

تمھارے ساتھ اللہ نے کثیر غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے۔ جنھیں تم حاصل کروگے، پھر یہ تم کو جلد ہی دلوا دی۔

اور یہ سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوا، بلکہ أُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا کے پردے میں آیندہ بے شمار فتوحات کو چھپائے رکھا، اسی کی طرف اشارہ، غزوۂ خندق کے ضمن میں، یہودِ بنی قریظہ کی جلاوطنی کے وقت أَرْضًا لَمْ تَطَئُوهَا کے الفاظ میں کیا

گیا تھا، مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقینِ کامل تھا، انھیں یقین تھا کہ اب وہ جہاں جائیں گے، نصرت ان کے قدم چومے گی، قریش کا خطرہ ٹل چکا تھا، گذشتہ جنگوں میں قریش کا کافی جانی و مالی نقصان ہو چکا تھا، ان کی تجارت بھی کافی متاثر ہوئی تھی، پھر سات سالہ قحط نے ان کی حالت مزید پتلی کر دی تھی، نیز انھیں یہ احساس بھی ہوا ہوگا، کہ آں حضرت صلعم کی کامیابی بھی تو ان کے مسلمان بھائی بنو قریش ہی کی کامیابی ہے۔ اس لئے انھوں نے جارحانہ ارادوں کو ترک کر کے مصالحت کی راہ اختیار کی، لیکن عرب میں ابھی یہود کی منظم مخالفت موجود تھی، اور وہ متعدد بار مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کر چکے تھے۔ آں حضرتؐ نے صلح کو غنیمت جانا اور یہی مناسب سمجھا کہ پہلو کے یہودی دشمن کی طاقت توڑ دی جائے۔ چنانچہ آپؐ نے مدینہ پہنچ کر حالات کو درست کیا اور مجاہدین کے ساتھ یہود کے مرکز خیبر کا رخ کیا، جہاں سے چند ماہ قبل، غزوۂ خندق کے وقت یہود نے قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کر کے اپنی دشمنی کا تازہ ترین ثبوت بہم پہنچایا تھا۔

غزوۂ خیبر سے منافقین کا اخراج اس مہم کا ایک خاص اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپؐ نے حکمِ الٰہی کے مطابق اس لشکر میں صرف ان مومنین کو شرکت کی اجازت دی جو بیعتِ رضوان میں آپؐ کے ساتھ تھے، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ (الفتح: ۱۵)	"جب تم غنیمت حاصل کرنے کے لئے جاؤ گے تو (بیعتِ رضوان سے) پیچھے رہنے والے لوگ کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ جانے دو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں، کہہ دیجئے، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں چلو گے، اسی طرح اللہ نے پہلے سے فرما دیا ہے۔"

منافقین نے سفرِ رضوان میں مسلمانوں کا اس لئے ساتھ نہیں دیا تھا کہ انھیں اپنی جان کا

خطرہ تھا، اور انھیں یقین تھا کہ مسلمانوں نے جان بوجھکر موت کو دعوت دی ہے۔ مگر حالات نے پلٹا کھایا۔ سرکش قریش نے خلاف توقع صلح کرلی، اب منافقین چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا ساتھ دیں کیوں کہ انھیں ماضی کے واقعات کی روشنی میں یہود کے خلاف مسلمانوں کی کامیابی کا یقین واثق تھا، اور لالچ کے زیر اثر یہود سے کئے ہوئے وعدے فراموش کرچکے تھے، لیکن قدرت کو ان کی دوہری مایوسی مطلوب تھی، پہلے وہ مسلمانوں کی کامیاب واپسی پر نادم و مضطرب تھے، اور اب انھیں اِن غنائم سے محروم ہونا تھا۔ جو وعدۂ الٰہی کے مطابق مسلمانوں کے لئے مقدر تھے، چنانچہ انھیں حسرت و ناکامی کی آگ میں جلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، اور مسلمان خیبر کے مقام پر پہنچے، چندہی دنوں میں کچھ علاقے بزورِ شمشیر فتح کئے۔ اور بقیہ بلا مقابلہ ان کے حوالے کردئے گئے۔ اس طرح ایک اور طاقت ور حریف کی قوتِ مدافعت ختم کردی گئی، ان کے اموال مسلمانوں کے ہاتھ لگے، ان کی زمینوں کی مستقل آمدنی سے مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہوگئی، دائرۂ اثر وسیع تر ہوا، اور فتح و کامرانی کے مزید راستے کھل گئے۔ جس سے منافقین اور قریش مکہ کی مزید حوصلہ شکنی ہوئی اور جب ایک سال بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی جانب فاتحانہ یلغار کی تو قریش نے مقابلہ کئے بغیر ہتھیار ڈال دیئے اور اسلام کے سامنے گردنیں جھکادیں۔

صُلح حُدیبیہ کے بعد عُمرہ میں حکمت

اللہ تعالیٰ کو امتِ مسلمہ کا بچانا مطلوب تھا، تاکہ غلبۂ دین اپنی کامل صورت میں دُنیا کے سامنے آئے۔ پھر اُسے مکہ کی حُرمت بھی عزیز تھی، اور اس ذُرِّیّتِ ابراہیمؑ کو بھی محفوظ رکھنا تھا، جو مکہ میں آباد تھی، اور آیندہ اسی کے ہاتھوں جزیرۃ العرب، ایران، روم، مصر، ترکش وغیرہ ممالک کو حلقہ بگوشِ اسلام کرکے انھیں اقوامِ عالم کی قیادت بخشنا بھی پیشِ نظر و منظور تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

۱- ترجمہ " اور وہی ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمھارے ہاتھوں کو ان سے

وادیٔ مکہ میں روکے رکھا، بعد اس کے کہ تمھیں ان پر فتح دی اور اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو اسے دیکھنے والا ہے"۔ (الفتح : ۲۴)

۲۔ "وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجدِ حرام سے روک دیا، اور قربانی کو اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے روکا، اگر مومن مرد اور مومن عورتیں (مکّہ میں) نہ ہوتیں جنھیں تم نہیں جانتے کہ تم انھیں پامال کر دو گے، پھر تمھیں ان کی وجہ سے لاعلمی میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔ تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے اگر وہ الگ ہو جاتے تو جو ان میں سے کافر تھے ہم انھیں دردناک عذاب میں مبتلا کرتے"۔ (الفتح : ۲۵)

۳۔ "جب کافروں نے اپنے دلوں میں ضد ٹھان لی اور ضد بھی جاہلیت کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر تسکین نازل کی، اور انھیں تقوے کی بات پر جمائے رکھا، اور وہ اسی کے زیادہ حق دار اور اسی کے اہل تھے، اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔ (الفتح: ۲۶)

۴۔ "اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچ کر دکھایا، اگر اللہ نے چاہا تو تم ضرور مسجدِ حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواتے اور بال ترشواتے، تمھیں خوف نہ ہوگا، سو وہ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے، پس اس سے پہلے اس نے ایک قریبی فتح عطا کی"۔ (الفتح : ۲۷)

سورۃ الفتح کی ان آیات سے چند باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ کہ اُمتِ مسلمہ کی خیر خواہی اللہ تعالیٰ کو کس حد تک منظور تھی، اور مسلمانوں نے رضائے الٰہی کو کس حد تک مدِ نظر رکھا تھا معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرتؐ کو رؤیا میں بتایا گیا کہ اہلِ ایمان خانہ کعبہ میں (آمنین) امن کے ساتھ داخل ہوں گے، اور اس کا علم اللہ ہی کو تھا (فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا) کہ وہ امن کس طرح حاصل ہوگا چنانچہ اُس نے جس طریق سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا، وہ خدائی نصرت کے بغیر ممکن نہ تھا، چنانچہ اول تو مسلمانوں اور کفار کو باہم قتال سے روکا، کیوں کہ قتال کی صورت میں آمنین کی شکل قایم نہ رہتی، پھر مقاتلے سے یقیناً مسلمانوں کا بھی مزید نقصان ہوتا، اور عین ممکن تھا کہ وطن سے تین سو میل، لاکھوں دشمنوں کے درمیان گھرے ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا۔

اور زیارت بیت اللہ کے وعدۂ الٰہی میں تاخیر ہوجاتی۔ اس کے علاوہ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاکر خیبر کے یہود، منافقین اور بدوی قبائل کو ساتھ ملاکر قریش کے ہاتھوں جنگ سے بچے کھچے مسلمانوں پر حملہ کردیتے جس کی طرف بھی فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا میں اشارہ ملتا ہے۔ پھر مکہ میں بہت سے مرد و عورت اسلام قبول کرچکے تھے۔ اور اگر جنگ ہوتی تو انھیں کافروں اور مسلمانوں ہر دو کے ہاتھوں نقصان پہنچتا یا مسلمان انھیں بچاتے ہوئے خود مشکلات میں پھنستے، اس کے علاوہ حرم اور ماہ حرام کی تقدس بھی مجروح ہوتی، اور مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کی صورت میں خیبر کی فتح (فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذَالِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا) سے جو تقویت پہنچی اور مال اور اسلحہ کے حصول کے ساتھ یہود کا جو خطرہ ختم ہوگیا، اُس سے محروم رہتے، نیز قریش نے حمیتِ جاہلیت کے زیرِ اثر مسلمانوں کو زیارتِ بیت اللہ سے روک کر جو حماقت کی اس سے ان کے خلاف مشرکین میں بھی نفرت پیدا ہوئی اور کئی قبیلے مسلمانوں کے حلیف بن گئے۔ اس کے علاوہ خود قریش کے سعید الفطرت افراد کے قلوب میں تبدیلی آئی اور ابو جندلؓ وغیرہم کی تبلیغ سے بہت سے قریش مسلمان ہوگئے، جن میں خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ ایسے جرنیل اور مدبر شامل تھے اور فتح مکہ سے قبل مسلمان ہونے کی وجہ سے اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں شامل ہوگئے تھے۔

ایسے حالات میں مسلمان فتح کے پھریرے اُڑاتے ہوئے اگلے سال عمرہ ادا کرنے گئے، ان کے حوصلے بلند تھے، مدینہ پر کسی حملہ کا خوف و خطرہ نہ تھا، قریش نے حماقت سے عمرہ کی اجازت دینے کو بھی اپنی بے عزتی سمجھا، اور تمام اکابرِ قریش شرم و ندامت کے مارے پہاڑوں میں چلے گئے مسلمانوں نے آزادانہ مراسمِ عمرہ ادا کئے۔ تین دن مکہ میں ٹھہرے مکہ کی ہر شے ان کے رحم و کرم پر تھی۔ لیکن امت مسلمہ نے خلقِ عظیم کا مظاہرہ کیا، جو صاحبِ خُلقِ عظیم حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیہ کا نتیجہ تھا، اور جس کی بدولت وہ "میانِ امتان والامقام" بنی، اور جس طرح آں حضرتؐ آخری نبی ہیں۔ اسی طرح یہ امت بھی آخری اور اعلیٰ ترین امت ہے، چنانچہ انھوں نے کسی شے کی طرف آنکھ تک اُٹھاکر نہ دیکھا، مکہ میں عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں اور دریچوں سے انھیں

جا نکلتے تھے، لیکن ان کی نگاہیں کسی کی طرف نہیں اُٹھتی تھیں، یہی وہ اُمتِ مسلمہ تھی جس کے ہاتھوں عرب، ایران اور روم کی تسخیر ہوئی، فاتحانہ تہذیبی مراکز میں داخل ہوتے رہے، لیکن نہ کسی کے مال کو چھیڑا، نہ کسی گھر میں گھسے، نہ ان کی نگاہیں کسی نامحرم کی طرف اُٹھیں، اور اگر کسی محکوم کی ذمہ داری لینے کے بعد اس کی حفاظت سے معذوری محسوس کی تو اسے جزیہ واپس کر دیا۔

اِن ہی آیات کے بعد دو بے مثال حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے، (۱) هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۔ ذاتِ الٰہی نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پورے دین پر غالب کرے اور پھر غلبہ کے وسائل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۔ الخ "محمد اللہ کا رسول، اور جو اہلِ ایمان آپ کے ساتھ ہیں۔ وہ کفار کے مقابل سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تو انھیں رکوع و سجود کرتے دیکھتا ہے، وہ اللہ کے فضل و رضا کے متلاشی ہیں۔ ان کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے نشان ہیں یہ اُن کی بیان توریت میں ہے۔ اور اِن کی مثال انجیل میں اس انکھوے جیسی ہے جو کونپل نکالتی ہے، پھر وہ بڑھتی ہے پھر اس کا تنا مضبوط ہو کر سیدھا ہو جاتا ہے، کسان اسے حیرت اور تعجب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور مخالف کا فر اِس کی نشو و نما اور اُٹھان دیکھ کر پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اللہ نے ان میں سے ایمان دار اور عملِ صالح کرنے والوں سے مغفرت اور اَجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے" (الفتح)

قریشِ مکہ کے سامنے یہ دونوں حقیقتیں کمزور ترین حالت سے اُبھر کر کمال کو پہنچیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم کے دین اور آپ کے ساتھیوں، ہر دو کو ختم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور کسی فریب، حیلے اور قوت کے استعمال سے گریز نہ کیا، حتّٰی کہ آج عمرہ کے روز دینِ اسلام اور آں حضرت صلعم کے لگائے ہوئے چمن اُمتِ مسلمہ کو انھوں نے غالب اور سرسبز و شاداب دیکھا اور حقیقت کا اعتراف کر کے سر جھکا دیا۔ (باقی)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ

از نثار احمد فاروقی شعبۂ عربی ڈاکٹر ذاکر حسین کالج - دہلی ۶

شمالی ہندوستان پر مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قایم ہونے سے بھی بہت پہلے یہاں مسلمان تاجروں کی آمد و رفت تھی اور بعض شہروں میں اُن کی نو آبادیاں بھی بن گئی تھیں۔ ایسی ہی ایک نو آبادی بدایوں بھی تھا۔ مقامی ہندو حاکموں کی رواداری کی بدولت مسلمان تاجروں نے پورے پورے محلے آباد کر لئے تھے جن میں مسجدیں بھی تھیں اور اُن سے پانچوں وقت اَذان کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں۔

اِسی بدایوں میں دو تاجر خواجہ علی اور خواجہ عرب، بخارا سے آکر آباد ہوتے تھے۔ خواجہ علی کے بیٹے خواجہ احمد کی شادی خواجہ عرب کی دختر نیک اختر بی بی زلیخا سے ہوئی اور اُن کے بطن سے ۶۳۶ھ (۱۲۳۸ء) یا اس کے آس پاس ایک فرزند پیدا ہوا جسے آج دُنیا سلطان المشائخ حضرت نظامُ الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی کے نام سے جانتی ہے۔

حضرت نظامُ الدین نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اُن کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ حضرت کی تعلیم و تربیت کی تمام نگرانی آپ کی والدۂ ماجدہ نے کی۔ بَدایوں اُس زمانے میں بڑے بڑے علماء، مشائخ اور صوفیاء کا مرکز بن چکا تھا۔ ہر طرف مدرسے اور خانقاہیں قایم ہو گئی تھیں۔ حضرت نظام الدین نے تقریبًا ۱۶ برس کی عمر تک بدایوں میں رہ کر علوم رسمیہ کی تحصیل کی۔ قرآن شریف حِفظ کرنے کے علاوہ انھوں نے حدیث، فقہ، تفسیر اور کلام وغیرہ کا درس لیا۔ اِسی

زمانے کا واقعہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی نے خیرالمجالس میں بیان کیا ہے کہ جب حضرت نے کتاب "قدوری" کا درس ختم کیا تو آپ کے استاد مولانا علاء الدین اصولی نے فرمایا کہ اب تمھیں دستار باندھنی چاہیئے۔ اُس وقت دستار خریدنے کی ہمت نہیں تھی۔ حضرت نے اپنی والدہ سے عرض کیا۔ اُنھوں نے بازار سے روئی منگا کر پہلے خود اُسے کاتا پھر ایک ہمسایہ کے کرگھے پر اُسے بُنوایا۔ حضرت وہ دستار اور کچھ نقدی لے کر اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُستاد نے اپنے ہی گھر میں کچھ کھانا تیار کرایا اور بدایوں میں ایک درویش علی مولا نام کے تھے اُنھیں کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد دستار بندی ہوئی، تو دستار کے ہر پیچ کے ساتھ حضرت خود گھوم جاتے تھے اور ہر بار اپنے اُستاد کے قدموں پر سر رکھ دیتے تھے۔ یہ دیکھ کر علی مولا نے ہندی میں کہا:

"ارے مولانا یہ بڑا ہوسی" یعنی یہ طالب علم بہت بڑا آدمی بنے گا۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ تم نے کیسے جانا، تو علی مولا نے کہا میں نے دو باتیں دیکھیں ایک تو یہ کہ جو دستار باندھ لیتے ہیں اُن میں کچھ نخوت آجاتی ہے اور وہ کسی کے قدموں میں سر نہیں رکھتے۔ دوسرے اس طالبِ علم کی پگڑی ریشم کی نہیں کھدر کی ہے"۔

اس زمانے میں ایک قوّال ابوبکر خرّاط نامی بدایوں آیا۔ وہ بہت سیر و سیاحت کر چکا تھا اور بہت سے درویشوں کی خانقاہوں میں حاضر ہوا تھا۔ اُس نے اپنے مشاہدات اور مختلف بزرگوں کے حالات سُنائے تو حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاء کے دل پر خاص کیفیت طاری ہوئی اور شیخ فریدؒ کا نام اُٹھتے بیٹھتے وردِ زبان رہنے لگا۔ آپ نے اسی زمانے میں ارادہ کر لیا کہ کبھی نہ کبھی شیخ کی قدمبوسی حاصل کریں گے۔

بدایوں میں علم کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو مزید تکمیل اور تلاشِ معاش کے لئے دہلی کا قصد کیا۔ اُس وقت دہلی میں بھی بڑے بڑے مدارس قایم تھے جن میں مشہور علماء کا حلقۂ درس تھا جس میں شریک ہونے کے لئے وسطِ ایشیا تک سے طالبانِ علم کھنچے آتے تھے۔ حضرت نظام الدین شروع ہی سے ذہین طباع، نکتہ رس اور ذکی القلب تھے۔ انھوں نے جو کچھ بھی

پڑھا تھا لگاؤ تحقیق سے پڑھا تھا اور علمی مسائل میں تہ رسی کا ملکہ خداداد تھا، چنانچہ اپنے ہمعصروں میں "بحاث" اور "محفل شکن" کہلانے لگے تھے۔ اُس وقت سرکاری ملازمت میں سب سے زیادہ معزز عہدہ قاضی کا تھا جو شریعت کے مطابق مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ حضرت کے ذہن میں بھی کسی وقت یہ خیال آیا کہ اگر قاضی کا عہدہ مل جائے تو اقتصادی تنگی دور ہو جائے گی۔

دہلی آئے تو حسن اتفاق سے انھیں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے چھوٹے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کے پڑوس میں مکان ملا۔ شیخ نجیب کسی مسجد میں امامت کرتے اور وہاں بچوں کو پڑھاتے بھی تھے اُن کا گھر چھوٹا سا اور غالباً دو منزلہ تھا جس کی دوسری منزل پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ اسی حال میں وہ ستّر سال تک دہلی میں رہے یہیں انتقال فرمایا، اور اُن کا مبارک مزار آج بھی دہلی میں موجود ہے۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی بزرگ سے دعا کرانی ہوتی تھی تو فاتحہ کے لئے التماس کرتے تھے۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر الحمد پڑھتا اور مقصد دلی کے لئے دُعا کرتا تھا۔ حضرت نظام الدین نے ایک دن شیخ نجیب الدین متوکل سے فاتحہ کا التماس کیا اور عرض کیا کہ میرے لئے عہدۂ قضا ملنے کی دعا فرمایئے۔ شیخ نے فاتحہ کے لئے ہاتھ نہیں اُٹھائے اور فرمایا۔ "تو قاضی مشو، چیزے دیگر شو۔" (تم قاضی مت بنو، کچھ اور بنو)

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ دبی ہوئی تمنا پھر جاگ اُٹھی کہ شیخ فرید کی خانقاہ میں حاضری دیں۔ چنانچہ بے سروسامانی کے باوجود دہلی سے اجودھن تک پاپیادہ سفر کیا جو ملتان کے قریب واقع ہے اور اب پاک پٹن کہلاتا ہے۔ حضرت بابا فریدؒ نے آپ کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ — سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

آپ سے کچھ استفسار کیا تو فرطِ محبت اور جوشِ عقیدت میں زبان ساتھ نہ دیتی تھی اور آپ پوری بات بھی نہ کہہ پاتے تھے۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا "لِکُلِّ دَاخِلٍ دَھْشَۃٌ"

یعنی نئی جگہ کچھ رُعب ہوتا ہی ہے۔ پھر اپنے حضرت بدرالدین اسحاق سے فرمایا کہ ان کے لئے جماعت خانے میں پلنگ بچھواؤ۔ حالانکہ دوسرے سب درویش زمین پر سوتے تھے۔

شیخ فرید نے اجودھن کو ایک گمنام اور دور افتادہ جگہ سمجھ کر انتخاب کیا تھا تاکہ فراغ خاطر سے ذکر و عبادت کر سکیں اور عوام کا ہجوم نہ ہو، مگر رفتہ رفتہ اجودھن کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی اور خلق خدا کا اتنا اژدہام رہنے لگا کہ رات کے بارہ ایک بجے تک خانقاہ میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شیخ فرید کے مریدوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی تھی اور خلفا بھی بہت سے تھے جن میں بعض بہت نام برآوردہ بھی تھے اور برسوں سے خانقاہ میں رہ کر روحانی فیض حاصل کر رہے تھے اور خود شیخ کے پانچ فرزند بھی تھے مگر حضرت بابا فرید نے اپنی جانشینی اور خلافتِ اولیٰ کے لئے حضرت نظام الدین کو پہلی ہی ملاقات میں منتخب کر لیا۔ صوفیا کی اصطلاح میں اسے 'خلافتِ رحمانی' کہتے ہیں جو اشارۂ غیبی سے کسی کو دی جاتی ہے۔ خلافت دیتے وقت بابا صاحب نے حاضرینِ مجلس سے فرمایا کہ آج میں نے ایک ایسا درخت لگایا ہے جس کے سائے میں بہت سی خلق خدا آرام پائے گی۔ حضرت نظام الدین نے دبی زبان سے عرض کیا کہ حضرت میں اس عظیم ذمہ داری کو کیسے پورا کر سکوں گا۔ تو بابا صاحب نے فرمایا کہ خدا نے تمھیں علم اور عقل اور عشق یہ تینوں جوہر دئے ہیں اور جس میں یہ تینوں جمع ہوں اُس سے مشائخ کی خلافت خوب ہوتی ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ میں نے خدا سے دُعا کی ہے جو تم مانگو تمھیں ملے اور تمھارے لئے دین کے ساتھ ہی تھوڑی سی دنیا بھی مانگ لی ہے۔ حضرت نظام الدین کے دل میں خطرہ گذرا کہ دُنیا کہیں اُلجھا نہ لے تو آپ نے دل کے حال پر مطلع ہو کر پھر فرمایا: "فکر نہ کرو۔ دنیا تمھیں آلودہ نہیں کر سکے گی"

یہ حضرت بابا فرید کی مبارک زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ حضرت نظام الدین کو ہر سال صرف ۳-۴ ماہ کے لئے اجودھن میں رہنے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح انھوں نے کم سے کم ۹-۱۰ ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال مجموعی طور پر اپنے شیخ کی خانقاہ میں گذارا۔ جہاں اگرچہ دین و دنیا کی

ہر دولت لٹ رہی تھی مگر ظاہری زندگی کا یہ حال تھا کہ کریل کے پھول اُبال کر کھائے جاتے اور اگر کسی دن اس میں ڈالنے کے لئے چند ڈلیاں نمک کی بھی میسّر آجاتیں تو وہ گویا عید کا دن ہوتا تھا۔ جب کئی وقت گذر جاتے تو باباصاحب کی خانقاہ سے زنبیل بھی گھمائی جاتی جس میں حسب توفیق کوئی کھانا وغیرہ ڈال دیتا اور وہ خانقاہ کے رہنے والوں کے کام آتا تھا۔ بعد کو وہ زمانہ یاد کر کے حضرت نظام الدین آبدیدہ ہوجاتے اور فرمایا کرتے کہ "مشائخ ما چنیں خونہا خوردہ اند تا بجائے رسیدہ اند"

جب بابا فرید کا انتقال ہوا تو انھوں نے وصیت کی کہ نظام الدین دہلی میں ہیں وہ آئیں تو میرا خرقہ، عصا، مصلّی، اور تسبیح وغیرہ اُنھیں دے دی جائے۔ یہ سب جانشین بنانے کی علامتیں تھیں۔ مرشد کے انتقال کے بعد حضرت نظام الدین نے دہلی کو اپنا مستقر بنایا اُس وقت کی دہلی مہرؤلی کے آس پاس آباد تھی۔ یہاں ترک امیروں کی شان وشوکت اور طمطراق نے عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ طاقت اور دولت بے حساب ملے تو اخلاقی بدعنوانیاں بھی اُس کے ساتھ آتی ہیں۔ جمنا کے کنارے بہت سے امیروں نے اپنے عیاشی کے اڈّے بنوا رکھے تھے۔ نمود و نمایش اور اسرا[illegible]ت ایک عام بات تھی۔ ہر طرف رقص و نغمہ، نای و نوش اور ہای و ہو کا ہنگامہ گرم تھا۔ ہر امیر اپنی فضول خرچیوں میں دوسرے ہم چشموں کو نیچا دکھانا ضروری سمجھتا تھا۔ دہلی کا یہ رنگ دیکھا تو حضرت نظام الدین نے طے کر لیا کہ وہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں گے۔ مگر ایک درویش انھیں حوضِ خاص پر ملا اور اُس نے از روئے کشف ان کے ارادے کو سمجھ کر یہ اشعار پڑھے:

آں روز کہ مہ شدی نمیدانستی — کانگشت نمائے عالمے خواہی شد
امروز کہ خلقت دلِ عالم بربود — در گوشہ نشستنت نمی دارد سود

اور کہا کہ پہاڑوں کی کھوہ میں جا بیٹھنا اور عبادت کرنا کون سی مردانگی ہے۔ مردانہ ہمت تو یہ ہے کہ خلق خدا کے درمیان رہو۔ باہمہ اور بے ہمہ ہو کر رہو۔ چنانچہ حضرت نے

اُسی وقت ارادہ کرلیا کہ وہ کسی حال میں دہلی کو نہیں چھوڑیں گے۔ اُنھیں ایک غیبی آواز نے غیاث پور نامی گاؤں کی طرف متوجہ کیا اور آپ نے یہاں قیام فرمالیا۔

دہلی میں جہاں آج کل ہمایوں کا مقبرہ ہے اُس کے محاذ میں جانب شمال غیاث پور کی بستی تھی اور جنوب میں کیلوکھیری گاؤں آباد تھا۔ عام طور سے غریب کسانوں اور مزدوروں کے گھر چھپروں کے تھے مگر جمنا کے کنارے دور تک بادشاہ اور اُس کے اُمراء کے محل بھی تعمیر ہوگئے تھے۔ حضرت نظام الدین کے لئے ایک عقیدتمند ضیاالدین وکیل نے وسیع قطعۂ زمین میں ایک مضبوط عمارت بنوادی تھی۔ اُس کا صحن بہت کشادہ تھا جس میں پاکھر وغیرہ کے درخت بھی تھے۔ سامنے جماعت خانہ تھا جس کی عمارت بہت سے ستونوں پر کھڑی تھی اور ہر ستون کے ساتھ طالبانِ خدا کے بستر لگے ہوتے تھے۔ کسی مسافرخانے کی طرح یہ ہر وقت کھچاکھچ بھرا رہتا تھا۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے حضرت نظام الدین نے حضرت نصیرالدین چراغ دہلی تک کو یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ جماعت خانے میں دس دن سے زیادہ قیام نہ کریں حالانکہ وہ اجودھیا (فیض آباد) سے چل کر اپنے مرشد کی زیارت کرنے کو آیا کرتے تھے۔ جماعت خانے سے متصل جانب شمال ایک سہ دری اور ایک کمرہ تھا جس میں حضرت کی نشست رہتی تھی۔ یہ کمرہ لائبریری کا کام بھی دیتا تھا۔ صحن میں غالباً وضو کرنے کے لئے حوض بھی تھا اور یقین ہے کہ نمازِ باجماعت کے لئے کوئی مسجد بھی خانقاہ سے متصل ضرور رہی ہوگی جماعت خانے سے ملی ہوئی اور جنوب کی سمت میں ایک سہ منزلہ عمارت تھی یہیں حضرت آرام فرماتے تھے اور باوجود ضعیفی کے پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے زینے سے اُتر کر نیچے تشریف لاتے تھے حالانکہ وہ زینہ خاصا تنگ اور ضعیف آدمی کے لئے تکلیف دہ تھا۔ ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر کے وقت غیاث پور اور کیلوکھیری کا بہت سارقبہ حاصل کرلیا گیا تھا لیکن حضرت کی خانقاہ کو اُسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تھا حالانکہ اس کی وجہ سے مقبرے کی چہاردیواری شمال کی جانب سے ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ حضرت کی اِس خانقاہ کے کچھ آثار آج بھی موجود ہیں۔

غیاث پور کی اس خانقاہ میں ہر وقت مصیبت زدوں، حاجتمندوں، مفلسوں، مسکینوں اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی - ہزارہا انسان، بچے، جوان، بوڑھے، مرد، عورتیں، دعا کرانے اور تعویذ لینے یا حضرت سے کسی امیر کے نام سفارشی خط لکھوانے آتے رہتے تھے - خانقاہ سے متصل ہی مطبخ تھا جس کے انچارج حضرت خواجہ بُرہان الدین غریب تھے۔ یہاں ہر وقت کھانا پکتا رہتا تھا اور ہر آنے جانے والے کے لئے عام لنگر تھا۔ حضرت نظام الدین ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، اس لئے آپ دن میں کچھ نہیں کھاتے تھے - آپ کے لئے خواجہ عبدالرحیم سحری کے وقت کچھ کھانا لے کر آتے تھے - آپ اُس وقت تہجد پڑھ کر ذکر و مُراقبے میں مشغول ہوتے۔ کھانا سامنے رکھا جاتا تو آپ دو چار لقمے کھا کر ہاتھ روک لیتے۔ کبھی خواجہ عبدالرحیم کہتے "حضرت آپ افطار کے وقت بھی کچھ نہیں کھاتے اور اس وقت بھی - اس سے تو کمزوری بہت بڑھ جائے گی "۔ حضرت کی آواز رُندھ جاتی، آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے اور فرماتے: "اللہ کے ہزاروں مسکین بندے سڑکوں پر اور مسجدوں میں بھوکے پڑے رات گذار رہے ہیں - یہ کھانا نظام الدین کے حلق سے کیسے اُتر سکتا ہے؟"

ایک بار غیاث پور میں آگ لگ گئی - مئی یا جون کا مہینا تھا - دوپہر کا وقت اور چلچلاتی دھوپ - آپ کو خبر ملی تو اپنی خانقاہ کی تیسری منزل پر چڑھ گئے اور غریبوں کے چھپروں کو شعلوں کی لپیٹ میں آکر بھڑکتے ہوئے دیر تک دیکھتے رہے - آگ کی تپش اور دھوپ کی تمازت سے آپ کا چہرۂ مبارک بھی انگارے کی طرح دہکتا معلوم ہو رہا تھا - کئی گھنٹے تک اسی عالم میں یہ منظر دیکھا کئے اور نہایت افسردہ و رنجیدہ ہو کر نیچے اُس وقت اُترے جب آگ بجھنے لگی - اپنے خادم خواجہ اقبال کو بلا کر فرمایا " جاؤ اور جلنے والے گھروں کی گنتی کرو - اور ہر گھر والے کو چاندی کا ایک تنکہ ایک صراحی ٹھنڈا پانی اور دو دو روٹیاں پہنچاؤ" جب خواجہ اقبال اور خانقاہ کے دوسرے لوگ - خوان سروں پر رکھ کر ایک ایک کے گھر پہنچے ہیں تو حضرت کا بھیجا ہوا عطیہ سر پر رکھ کر لوگ فرطِ مسرت سے رونے لگتے تھے - اُس زمانے میں چاندی کا ایک

تنکا اتنی قیمت رکھتا تھا کہ اُس سے کئی چھپر ڈلوائے جا سکتے تھے۔

حضرت نظام الدین کسی کا دُکھ درد سنتے تو بے تاب ہو جاتے۔ ایک بار فرمایا

"آں قدر غم و اندوہ کہ مراست ہیچ کس را دریں جہان نیست۔ زیراکہ چندیں خلق می آیند و غم و اندوہِ خویش می گویند۔ ہمہ بر دل و جانِ من می نشینند۔"

کہیں سے پیادہ پا تشریف لا رہے ہیں، راستے میں ایک عورت کو دیکھا کہ جمنا کے کنارے ایک کنوئیں سے پانی کھینچ رہی ہے فرمانے لگے: "اری جمنا کا پانی کیوں نہیں پیتی؟ جو کنوئیں سے بھر رہی ہے۔" اُس نے کہا: "میرا گھر والا بہت غریب آدمی ہے۔ خرچ مشکل سے پورا ہوتا ہے اور جمنا کا پانی بھوک زیادہ لگاتا ہے اس لئے ہم نہیں پیتے۔" یہ سُن کر آپ بے چین ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے اپنی خانقاہ میں آئے اور خادم کو بلا کر فرمایا: "دیکھو غیاث پور میں فلاں عورت ہے اُس کے گھر جا کر معلوم کرو ماہانہ خرچ میں کتنی کمی رہتی ہے اور اتنا خرچ اُسے خانقاہ سے دیا کرو۔ اُس سے کہہ دو کہ آج سے وہ جمنا کا پانی پیے۔"

حضرت نظام الدین اولیاء ساری عمر مجرد رہے اس لئے آپ کی صُلبی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر آپ نے ساری خلق اللہ کو اپنی عیال سمجھا اور اس طرح اپنی پدرانہ شفقت اور بےکراں محبت سے سب کو نہال کیا جیسے ایک شفیق باپ اپنی اولاد کو کرتا ہے۔ آپ نے کوئی خزانہ جمع نہیں کیا۔ کوئی جائداد نہیں خریدی، کوئی سرکاری خطاب یا عہدہ قبول نہیں فرمایا، کسی بادشاہ یا امیر کے دربار میں نہیں گئے۔ اپنے انتقال سے چند ساعت پہلے جماعت خانے کے گودام کا سب غلّہ وغیرہ فقراء میں تقسیم کرا دیا تھا۔ مگر آپ کی خانقاہ میں لنگر آج تک جاری ہے۔

آپ نے ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ یعنی ۲ اپریل ۱۳۲۵ء کو بُدھ کے دن صبح کے وقت اس عالمِ فانی سے پردہ فرمایا۔ کئی عقیدت مندوں نے آپ کی حیات ہی میں مقبرے کے لئے عمارتیں بنوا رکھی تھیں کہ شاید ہماری تعمیر کردہ درگاہ کو حضرت کا مدفن بننے کی سعادت مل جائے۔ مگر حضرت نے وصیت فرمائی کہ اُنھیں کھلے آسمان کے نیچے دفن کیا جائے اور اُس پر

کوئی عمارت نہ بنائی جائے چنانچہ ایک حوض کو مٹی سے پاٹ کر اس کے وسط میں آپ کا جسدِ مبارک دفن کیا گیا بعد کو فیروز شاہ تغلق نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔ موجودہ روضہ عہدِ شاہجہاں کے ایک امیر خلیل اللہ حسینی کا بنوایا ہوا ہے۔

یہ اُس درویشِ خدامست کی مقدس اور پاکیزہ زندگی ہے جس نے بوریائے فقر پر بیٹھ کر ایسی مضبوط، مستحکم اور وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد رکھی جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ جس کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور دنیا کے ہزاروں سلطانوں کی سلطنت کا نام و نشان مٹ چکنے کے بعد بھی اس سلطان المشائخ کی روحانی حکومت اور جاہ و جلال کا پھریرا ہندوستان ہی میں نہیں چاردانگِ عالم میں اُسی شان سے لہرا رہا ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

سرسید پر کفر کا ایک اور فتویٰ

جناب محمد مجتبیٰ صدیقی صاحب سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں جب مسلمانوں کو انگریزی علوم کی تعلیم دینے کے لئے علی گڑھ میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا، تو علاوہ اُن کے چند گنے چنے ساتھیوں کے مسلمانوں نے اُن سے اس بناء پر سخت اختلاف کیا کہ ایسی تعلیم پاکر مسلمان مذہب سے برگشتہ ہوجائیں گے۔ یہ اختلاف اس حد تک بڑھا کہ سرسید کو بدنام کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔ اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ تک صادر کیا گیا جو مسلمانوں کے اسلحہ خانے میں سب سے موثر ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ حرم سے بھی کفر کے فتوے منگولئے گئے اور اُن کی دِل کھول کر اشاعت کی گئی۔ لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود سرسید کے پائے استقلال میں لغزش نہیں ہوئی اور جس کام کو اُنھوں نے شروع کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ چنانچہ آج جب کہ تعصب کے بادل چھنٹ گئے ہیں اِنھیں سرسید کو مسلمان سر آنکھوں پہ بٹھلاتے اور اپنا بہترین خیرخواہ گردانتے ہیں۔

کفر سازی کا یہ دور مدت ہوئی ختم ہوچکا لیکن اب دوبارہ اس کا آغاز ایک نئی شکل میں ہوا ہے۔ پہلے سرسید اس لئے کافر قرار دئے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کو انگریزی کی تعلیم دینا چاہتے تھے۔ اور اب اس لئے کہ لڑکوں کے لئے وہ جس تعلیم کے حامی تھے لڑکیوں کے لئے اسی کے مخالف تھے!

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اِس خیال کا اظہار چند مہینے ہوئے ویمنس کالج میں لڑکیوں کے اسکول کے بانی شیخ عبداللہ کی صد سالہ یومِ پیدائش کی تقریب کے موقع پر کیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی ان انتھک کوششوں کو جو انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کیں جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ وہ کافر کے لقب سے تو نہیں نوازے گئے لیکن مخالفت اُن کی بھی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی۔ مگر یہ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اُنھیں کی طرح انھوں نے بھی مخالفت کی ذرہ برابر پروا نہ کرتے ہوئے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ اُن کا قایم کیا ہوا پرائمری اسکول پہلے ہائی اسکول ہوا، پھر انٹرمیڈیٹ کالج اور آخر میں ترقی کرکے ڈگری کالج بن گیا۔ چنانچہ اس صد سالہ تقریب میں بانیٔ مدرسہ کی ہر ممکن ستائش کی گئی۔ کہیں کہیں تو یہ تعریف مبالغہ کے حدود میں داخل ہو گئی۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی گرلز اسکول کے صدی نمبر میں جو اس تقریب کے موقع پر شایع ہوا ہے شیخ عبداللہ کے ہم عصر طلبا، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈپٹی حبیب اللہ اور مولانا طفیل احمد کے متعلق پروفیسر بشیر الدین لکھتے ہیں:

"ان میں کسی میں پاپا میاں کی سی دور رسی، صبر اور استقلال اور جرأت رندانہ نہیں تھی جو کسی اہم مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ضروری عناصر مانے گئے ہیں۔"

پروفیسر بشیر الدین کی یہ رائے حقیقت سے بہت دور ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال صحیح بھی ہے تو کیا جن لوگوں نے اپنی زندگیاں اس درس گاہ کے لئے وقف کر دی تھیں، جو اسی کے لئے جیتے تھے اور اپنی آخری سانس تک اس کی خدمت میں لگے رہے، اُن کی اس طرح تنقیص شیخ عبداللہ کی برتری ثابت کرنے کے لئے ضروری تھی؟

اس صد سالہ تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی صاحب نے کی۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جہاں شیخ عبداللہ کی جی بھر کے تعریف کی جس کے وہ بلا شبہ مستحق تھے وہاں ایک چھینٹا سرسید پر بھی ڈال دیا، بلکہ شایلات پر برس پڑے۔ میں سرسید کا جتنا معتقد ہوں طیب جی صاحب کا بھی اتنا ہی معترف ہوں، مگر مجھے

سرسید پر اُن کے اس اعتراض سے تعجب ہوا۔ میں کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں، پھر ایسی جگہ
(ایک لفظی تحریف کے لئے حضرت میر تقی میر سے معذرت کے ساتھ)

رہتے ہوں منتخب ہی جہاں روزگار کے

زبان کھولنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوتی۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس تقریب کو مہینوں گذر گئے مگر کفر کے اس نئے فتوے کے خلاف کہیں سے آواز بلند نہیں ہوئی تو مجھے خیال ہوا کہ شاید

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اور سرسید کی حمایت میں قلم اٹھانے کی سعادت میرے ہی نصیب میں لکھی گئی ہے۔ اسی خیال سے یہ چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس بحث میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تعلیم نسواں کے متعلق سرسید نے کیا کہا اور کن حالات میں کہا۔ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں سرسید نے تعلیم نسواں کی بابت اپنے خیالات کا علانیہ اظہار صرف ایک دفعہ اس ایڈریس کے جواب میں کیا تھا جو ۱۸۸۴ء میں خواتین پنجاب نے گورداسپور میں اُن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اسی جواب کو طیب جی صاحب نے بھی اپنے اعتراض کی تائید میں پیش کیا ہے لیکن اس جواب میں انھوں نے ایک ایسا عیب بھی نکال دیا ہے جس کا سرے سے کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ طیب جی صاحب کہتے ہیں:

"سرسید نے مسلمان عورتوں کو یہ تلقین کی کہ اُن کی دادیاں اور نانیاں جن رسوم و رواج کی پابند تھیں اُن سے نہ صرف یہ کہ سرمُو انحراف نہ کیا جائے بلکہ اس طریقۂ تعلیم اور نصاب کو بھی بدستور قایم رکھا جائے جس کی یہ معزز خواتین پابند تھیں۔"

مروجہ طریقۂ تعلیم اور نصاب قایم رکھنے کی صلاح تو سرسید نے ضرور دی مگر رسم و رواج کا تو انھوں نے بھولے سے کہیں نام بھی نہیں لیا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

جو بھی اس الزام کو سُنے گا خواہ مخواہ سرسید سے بدظن ہوگا کہ یہ بھی اچھے مُصلح قوم تھے کہ بھلے بڑے

سب ہی رسوم و رواج کی پابندی پر زور دیتے تھے! ہاں اگر کنایۃً اپنی پُرانی ریت پہ چلنے کی تلقین کہیں ہے تو ان الفاظ میں ہے:

"تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو۔ اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو۔ اخلاق میں نیکی۔ نیک دلی۔ رحمت و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو اپنے برتاؤ میں لاؤ . . . . خدا پرستی، خدا ترسی، اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی، اپنا طریقہ رکھو . . . . . . "

اس تلقین پر چاہے اسے رسم و رواج کی پابندی ہی سمجھ لیجئے، کوئی کس طرح حرف لا سکتا ہے!

اب میں سرسید کے جواب سے چند اقتباسات جو اس بحث سے متعلق ہیں پیش کروں گا۔ جواب تو بہت طویل ہے۔

"میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے اُن کی ترقیِ تعلیم کا خواہاں ہوں . . . . . . تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہو گئی ہو۔ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو . . . . میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے . . . . جو خدمت میں اس وقت کر رہا ہوں وہ نہ صرف تمہارے لڑکوں ہی کی ہے بلکہ تمہاری لڑکیوں کی بھی ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سے دونوں برابر فائدہ اُٹھائیں گے اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں علم کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں گے۔"

اس اقتباس کو آپ پڑھ کر کسی طرح سے بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ سرسید لڑکیوں کی تعلیم کو لڑکوں کی تعلیم سے کم اہم سمجھتے تھے؟ اس کا خط کشیدہ حصہ خاص طور سے توجہ کے قابل ہے۔ اگر سرسید کے ذہن میں تعلیم کا جو نقشہ تھا اس میں عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی تو اُن کا یہ کہنا کہ ان کی اس خدمت سے "لڑکے اور لڑکیاں دونوں برابر فائدہ اُٹھائیں گے اور دونوں علم کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں گے۔"

کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے بعد بھی اگر، جیساکہ طیب جی صاحب کا خیال ہے، یہ سمجھا جائے کہ "سرسید عورتوں کو اسلامی تعلیم و تہذیب اور نئے علوم کا امتزاج جو برگ و بار لانے والا تھا اس سے محروم رکھنا چاہتے تھے" تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کا یہ خیال کتنا حکیمانہ تھا کہ کسی قوم میں مردوں کی حالت درست ہوئے بغیر عورتوں کی حالت درست نہیں ہوتی۔ اور اگر مردوں کی حالت درست ہو جائے تو عورتوں کی حالت درست ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لڑکیوں کی "تعلیم کی جڑ" تو وہ بٹھا ہی رہے تھے۔ اس سے جو پودا نکلتا اس کا پروان چڑھنا وہ کس طرح روک سکتے تھے۔ سوال اُن کے سامنے صرف تقدیم و تاخیر کا تھا نہ کہ اس کا کہ عورتیں تعلیم کی برکتوں سے بالکل محروم کر دی جائیں۔

طیب جی صاحب کہتے ہیں کہ سرسید مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو ایک واحد مسئلہ کی صورت میں دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ البتہ وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ ایک نئے طریقۂ تعلیم کو بروئے کار لانے میں جس سے قوم بالکل آشنا نہیں تھی مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی چوٹی پکڑ کر گھسیٹا جائے، چاہے اس کے نتیجہ میں کسی کا بھلا نہ ہو۔ وہ کوئی ناتجربہ کار نوجوان نہیں تھے کہ ابھی ایک محاذ پر تو کامیابی ہوئی نہیں تھی، لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کا مسئلہ چھیڑ کر ایک محاذ اور قایم کر دیتے۔ برسوں پُرانے خیالات وہ دِنوں میں تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی دُور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی تحریک کی کامیابی کا راز مسلمانوں کے ایک تدریجی ذہنی ارتقا میں مُضمر تھا۔ اگر فوری طور سے وہ لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے لئے تیار نہیں ہوتے تو اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اگر انھوں نے اس کا نام بھی لیا تو لڑکیوں کا بھلا تو کیا ہوگا لڑکوں کی ناؤ بھی ڈوب جائے گی۔ اُن کا یہ خیال صحیح تھا کہ مردوں کی تعلیم کے بعد عورتوں کی تعلیم کا راستہ خود ہموار ہو جائے گا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ البتہ اس کا سہرا شیخ عبداللہ کے سر بندھنا تھا سو بندھا۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی داغ بیل سرسید ہی کی دور اندیشی کی مرہونِ منت ہے۔

عورتوں کے طریقۂ تعلیم میں فوری تبدیلی سرسید ایک اور وجہ سے غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کو انھیں کے الفاظ میں سُنیئے :

"مردوں کو جو تمھارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم، یا کوئی سی زبان سیکھنے (یہاں اشارہ انگریزی علوم اور انگریزی زبان کی طرف ہے) اور کسی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آئی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورتِ تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی۔"

آج سے سَو برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ مستقبل میں نظریات اتنے بدل جائیں گے کہ عورتوں کا مردوں کے لئے روٹی کما کر لانا ممکنات میں ہو جائے گا!

ایک وجہ اور بھی تھی جس نے سرسید کو اس مسئلہ میں احتیاط سے قدم اُٹھانے پر مجبور کیا۔ وہ اگر ایک طرف انگریزی علوم کی تعلیم کے قائل تھے تو دوسری طرف مسلمان بچوں اور بچیوں کو اسلام کا پابند بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ آج کل کے ترقی پسند دانشوروں کی پیشانیوں پر شاید یہ سُن کر شکنیں پڑ جائیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ جس طرح اسلام نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو حصولِ علم کی تاکید کی ہے اسی طرح اُن کے اسلام پر ثابت قدم رہنے پر بھی زور دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ جاہ و ثروت ختم ہو چکی تھی۔ بھلا یا بُرا ایک مذہب ہی تھا جس کو وہ سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔ لیکن آخر کب تک ایسا کر سکتے تھے؟ حکومت کی نظروں میں اُن کے ساتھ برتا انصافی انصاف تھی۔ اس کی حمایت کے بَل بُوتے پر عیسائی مشنری مسلمانوں کو مذہب سے منحرف کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ گورداسپور کے پہلے سرسید نے لودھیانہ میں طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قایم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے، اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جاوے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا۔ وہ تو ہماری قوم ہی میں نہ رہا۔ پس اسلام کو قایم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ اُمید

ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قایم رکھوگے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی۔"

اس تقریر میں زور کس بات پر دیا گیا ہے ؟ تاکید کس بات کی ہے؟ یہی کہ پہلے مسلمان بنو اور پھر اُس کے ساتھ ترقی کرو۔

سید اقبال علی جو سرسید کے دورۂ پنجاب میں اُن کے ہمراہ تھے اُن کی تمام تقریروں کو ضبطِ تحریر میں لاتے جاتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

"جس وقت سید صاحب یہ تقریر کرتے تھے مجھے تعجب ہوا تھا کہ انھوں نے اس طرز سے کیوں تقریر کی۔ بعد کو مجھے خیال آیا کہ سید صاحب کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ (طلبا) لُدھیانہ کے مشن اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس خیال پر سید صاحب نے اس طرز پر گفتگو کی۔"

گویا سرسید نے تاڑ لیا تھا کہ دشمن کمین گاہوں میں چھپا ہوا ہے اور وقت کا منتظر ہے کہ حکومت کی حمایت سے مسلمانوں کو اُن کے مذہب سے برگشتہ کرنے کا جو نادر موقع اُس کو ہاتھ آیا ہے کب اُس سے فائدہ اُٹھائے۔ تو جب سرسید کو لڑکوں کے متعلق یہ خطرہ تھا تو وہ اُس کو ایک دوسرے راستے سے لڑکیوں تک پہنچ جانے کا موقع کس طرح دے دیتے؟ پردے کا اُس وقت جس سختی سے رواج تھا اُس کو دیکھتے ہوئے لڑکیوں کو اسکول بھیجنا تو کسی کے خیال میں آ نہیں سکتا تھا۔ پھر اس وقت اسکول تھے بھی کہاں۔ اس لئے لڑکیوں کو انگریزی تعلیم دِلانے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ مشن کی عورتوں کو شریف گھرانوں میں باریابی دی جاتی اور اس طرح مشنریوں کو اپنی ریشہ دوانیوں کے لئے کھلی چھوٹ مل جاتی۔

خواتینِ پنجاب کے ایڈریس کا سرسید نے جو جواب دیا اس کی کچھ تشریح سید اقبال علی نے ان الفاظ میں کی ہے :

"ہم لوگ لاہور پہنچنے بھی نہیں پائے تھے ہم نے دیکھا کہ سید صاحب کا جواب نہایت خوشخط اور عمدہ کاغذ اور خوش تقطیع پر چھپ گیا ہے اور گھر گھر اس کی کاپیاں تقسیم ہو رہی ہیں۔ لُودھیانہ کے اخبار "نور افشاں" نے جو پادریوں کا اخبار ہے (اس کے نام ہی سے ظاہر ہے

کہ اس کی پالیسی دین عیسوی کی تبلیغ تھی، اس پر بہت نکتہ چینی کی ہے اور اس جواب سے ناراض معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا ناراض ہونا اور نکتہ چینی کرنا بجا بھی ہے کیونکہ سید صاحب کے جواب سے مشنریوں کی وہ تمام امیدیں جو وہ مستورات کی نسبت اپنی کارروائیوں سے رکھتے تھے برباد ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔"

ان حالات میں سرسید کی دینی حمیت کس طرح گوارا کر سکتی تھی کہ معصوم بچیوں پر، جن کو اُن کی بے علمی کی وجہ سے رام کر لینا نسبتاً زیادہ آسان تھا، مشنریوں کا جادو چل جانے دیتے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر طیب جی صاحب نے لودھیانہ اور گورداسپور کے جلسوں کی مکمل روداد پر نظر ڈالی ہوتی تو وہ سرسید کے جواب کو اس معنی میں "ایک متحیر کن دستاویز" نہ کہتے جس میں انھوں نے کہا ہے بلکہ تحیر اُن کو سرسید کی نظرِ بالغ اور زبانِ ہوشمند پر ہوتا کہ کس طرح مسئلے کے موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے ایک اُٹھنے والے فتنہ کا مکمل سدِّ باب کر دیا۔

شیخ عبداللہ نے "مشاہدات و تاثرات" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے ایم۔اے۔او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اس میں انھوں نے متعدد جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سرسید عورتوں کی جدید تعلیم کے خلاف تھے۔ مثلاً "سرسید احمد خاں جیسے قوم کے رہنما نے بھی جدید تعلیم نسواں کی مخالفت کی" (صفحہ ۱۹۸) "سرسید جدید تعلیم لڑکیوں کے لئے قطعی طور پر مناسب نہیں سمجھتے تھے" (صفحہ ۲۰۵) وغیرہ۔ یہ خیال اُن کے دل میں ایسا جاگزیں ہو گیا تھا کہ انھوں نے اس کی بنا پر سرسید کو قدامت پرست اور رواج پرست ہی نہیں ٹھہرایا بلکہ مذہبی احکام سے انحراف کرنے کا الزام بھی ان پر لگا دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"سرسید نے رواج پرستی اور قدامت پرستی کے غلبہ کی وجہ سے جو اُن کے خیالات پر تھا لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں مذہبی احکام کو بھی پس پشت ڈال دیا" (صفحہ ۲۰۴)

مگر اس کے فوراً بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسید:

"مجھ سے بدرجہا زیادہ مذہبی احکام سے واقف تھے .... انھوں نے بھی پڑھا ہوگا جیسا کہ میں نے بھی پڑھا ہے کہ ہمارے پاک مذہب کا یہ حکم تھا کہ ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کے لئے علم کا سیکھنا فرض کیا گیا ہے "

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کا مذہبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ اس بات سے لاعلم نہیں ہو سکتے تھے کہ ہماری عورتیں طلوعِ اسلام کے تین سو برس کے اندر ہی دینی علوم میں اتنی مہارت حاصل کر چکی تھیں کہ تفسیر و حدیث کے درس بھی دیتی تھیں۔ طیب جی صاحب نے یہ صحیح لکھا ہے کہ سرسید اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شیخ عبداللہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ " سرسید مصلح تھے اور عام انسانوں کے اخلاق کی درستی انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا" پھر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ایسے روشن ضمیر شخص پر صرف ایک لڑکیوں کی تعلیم کے مسئلہ میں قدامت پسندی کا اس قدر غلبہ ہو جائے گا کہ وہ مذہبی احکام کو بھی پسِ پشت ڈال دے گا۔

میری دانست میں شیخ عبداللہ یہاں ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ نہ تو اُن کے پاس سرسید کا ایسا تجربہ تھا اور نہ وہ اُن کی طرح دور اندیش تھے۔ شیخ عبداللہ نوجوان تھے اور سمجھتے تھے کہ بس عورتوں کی جدید تعلیم کا جھنڈا بلند کر دو۔ کامیابی خود بڑھ کر قدم چومے گی۔ سرسید جانتے تھے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اس لئے خاموش تھے۔ اس خاموشی کو شیخ عبداللہ نے سرسید کی قدامت پسندی پر محمول کر لیا۔ " مشاہدات و تاثرات" میں شیخ عبداللہ خود لکھتے ہیں (صفحہ ۲۰۰) کہ عورتیں " اس زمانے میں اگر جدید تعلیم کا نام بھی لیتیں تو مرد اُن کی زبان کاٹ لیتے " نواب محسن الملک کو جو سرسید کے سب سے بڑے معتمد کار تھے وہ شروع ہی سے عورتوں کی جدید تعلیم کا حامی سمجھتے رہے۔ نواب صاحب ہی کی تحریک سے ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شعبۂ تعلیمِ نسواں قائم ہوا۔ لیکن انھیں کے دو واقعے شیخ عبداللہ نے ایسے لکھے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کی جدید تعلیم کی علانیہ حمایت کس طرح لڑکوں کی تعلیم کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوتی۔ ۱۹۰۵ء کی کانفرنس میں عورتوں نے بھی حصّہ لینا چاہا اور اُن کے علیحدہ اجلاس کے لئے شیخ عبداللہ کی درخواست پر نواب محسن الملک

نے کالج کی ایک پرانی عمارت دے دی۔ مگر مقامی مسلمانوں کے دباؤ ڈالنے سے یہ اجازت اُن کو منسوخ کرنی پڑی۔ دوسرا واقعہ اس سے چند مہینے پہلے کا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں کوئی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس سے چند دن پہلے بھوپال سے لڑکیوں کے مدرسے کے لئے ؁۵۰ روپیہ ماہوار کی امداد مقرر ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے کسی جلسہ میں شیخ عبداللہ نے نواب محسن الملک سے اس امداد کا ذکر کیا۔ نواب صاحب نے اس کو سنتے ہی اپنی ٹوپی صحن میں پھینک دی۔ بعد میں جب شیخ عبداللہ نے اُن سے اس خفگی کا سبب دریافت کیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا " تم اپنا کام کئے جاؤ میں نے اپنا کام کیا ہے۔ اس کی بہت ضرورت تھی کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ میں کسی مدرسے کے قایم کرنے کا حامی نہیں ہوں۔"

اور یہ سب ہو رہا تھا ۱۸۸۲ء کے بیس برس بعد۔ اب اگر اس کے باوجود شیخ عبداللہ کو نواب محسن الملک سے حسن ظن قایم رہتا ہے تو وہ سر سید کو اس سے کیوں محروم کرتے ہیں جنھوں نے ۱۸۸۲ء میں علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ وہ دل سے عورتوں کی ترقی تعلیم کے خواہاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی وجہ یہی تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جلدبازی میں سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے اور مسلمان اس پرانی مثل کے مصداق بن جائیں :

آدھی کو چھوڑ ساری کو دھاوے	آدھی رہے نہ ساری پاوے

یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی جب خود اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنے خیالات اور اپنی رائے کو دانستہ یا نادانستہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر سمجھ کر ظاہر کرتا ہے۔ " مشاہدات و تاثرات " اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اکثر واقعات جن کے متعلق تاریخ کی شہادت کچھ اور کہتی ہے شیخ عبداللہ نے بالکل دوسرے رنگ میں پیش کئے ہیں۔ وہ تحریکِ خلافت کے بہت زیادہ خلاف معلوم ہوتے ہیں، مگر اس مخالفت میں وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ترک سلاطین میں صرف سلطان عبدالحمید نے جن کی حکومت پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں تھی اپنی سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہو کر خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس دعوے کی پذیرائی ہندوستان میں تو خوب ہوئی مگر اور کسی اسلامی ملک نے ترکوں کو خلیفہ نہیں مانا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ المتوکل عباسی

نے آج سے قریب پانچ سو برس پہلے منصب خلافت سلطان سلیم کے حق میں منتقل کر دیا تھا۔
اس وقت ترکی کا شمار دنیا کی عظیم طاقتوں میں تھا۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ جنگِ بلقان کے موقع پر ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں جو طبی وفد ترکی گیا تھا اُس نے ترکوں کو کوئی طبی امداد نہیں پہنچائی بلکہ یونہی واپس چلا آیا۔ یہ ڈاکٹر انصاری کے اوپر ایک صریح بہتان ہے۔ کامریڈ کی فائلیں جس نے پڑھی ہیں وہ جانتا ہے کہ وفد نے کس جانسوزی سے ترکی جنگی زخمیوں کی خدمت کی تھی۔

ایک اور امر قابلِ لحاظ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے جب اپنے "مشاہدات و تاثرات" قلمبند کرائے اس وقت اُن کی عمر قریب ۷۵ سال کے پہونچ چکی تھی جب حافظہ جواب دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا اعتراف خود انھوں نے اِن الفاظ میں کیا ہے :

"میں جو کچھ لکھوں گا وہ اپنے حافظہ کے اعتبار پر لکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دے گا اور جس قدر واقعات قلمبند ہوں گے اُن میں غلطی کا امکان بہت ہی کم ہوگا۔"

تو جب واقعات میں اتنی بڑی بڑی غلطیاں ہوگئی ہیں تو تاثرات تو پھر تاثرات ہی ہیں۔ ان میں اس سے بھی بڑی غلطیوں کے ہو جانے کا امکان ہے۔ اس لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ہم شیخ عبداللہ کے اس خیال سے اتفاق کرلیں کہ سرسید عورتوں کے لئے جدید تعلیم مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ یہ سوال بالکل جداگانہ ہے کہ جس انگریزی تعلیم سے بے قیدی پیدا ہوتی ہے اسے سرسید مناسب سمجھتے تھے یا نہیں۔ اس کی بابتہ کچھ اشارہ اُن کی ۱۸۸۴ء کی تقریر میں ہے۔ گو بہت واضح نہیں ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے جس نے علّامہ اقبالؔ کے ایسے عظیم مفکر کی زبان سے یہ دو شعر کہلوادئیے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   قوم نے دیکھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین   پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

علامہ اقبال کے متعلق تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قدامت پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے! مشرق نے ان کے ایسے روشن ضمیر کم پیدا کئے ہیں۔

شیخ عبداللہ کے تاثرات کے متعلق میں نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے اگر کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ہو تو میں ایک دفعہ پھر اُن کے عورتوں میں جدید تعلیم کو رواج دینے کے عظیم کارنامے کا اعتراف کروں گا۔ کسی نے اُن کو سرسید ثانی کہا ہے۔ پروفیسر ہادی حسن کے الفاظ میں اُن کو "عبداللہ اول" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

سرسید کے متعلق میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ فرشتہ تھے۔ یقیناً وہ انسان تھے اور غلطی بھی کر سکتے تھے لیکن جس شخص نے اپنی زندگی کی ایک ربع صدی کا ایک ایک لمحہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی فکر میں صرف کیا ہو اس کو اتنا تو حق ہے کہ ہم سے اپنے متعلق کچھ حسنِ ظن کی اُمید رکھے۔ ہر دانش گاہ کے لئے کوئی بلند ہستی آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے۔ جس طرح دیوبند کے لئے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ندوہ کے لئے علامہ شبلی آئیڈیل ہیں اسی طرح علی گڑھ کے لئے سرسید آئیڈیل ہیں اُن پر اعتراض کرنا ہمارے لئے سوء ادب ہے۔ ہمارے معتقد اسلاف جو آج سے ۱۰۰ - ۱۵۰ برس پہلے ایک بالکل مختلف ماحول میں ہو گذرے ہیں اُن کو اپنے معیار سے جانچنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ بقول عارف رومی :

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر

لیکن پھر بھی اگر کوئی اعتراض کرنا ہی چاہے تو اس سے ہم یہ گذارش کریں گے کہ ٹھیک ہے کہ سرسید نے غلطی کی۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ سَو برس بعد اب اس کا ڈھنڈورا پیٹا جائے اور دنیا پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ مسلمان احسان فراموشی میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے بندوں کے اَن گنت قصور معاف کر دیتا ہے آپ سرسید کا ایک ہی گناہ بخش دیجئے۔

لیکن معترض کے تنقیدی جذبے کو اگر اب بھی تسکین نہ ہو تو ہم سعدیؒ کا یہ شعر عرض کریں گے :

اے کہ آگاہ نۂ ای عالمِ درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سوداو سراست ایشاں را

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات و تاثرات

(۵)

سعید احمد اکبر آبادی

پشاور میں خیبر انٹر کانٹی نینٹل (Inter Continental) ہوٹل جو ابھی دسمبر ۱۹۷۵ء میں بن کر تیار ہوا ہے اُس کے کمرہ نمبر ۲۰۶ میں میرا قیام ہوا۔ اس کے سامنے والا کمرہ حکیم عبدالحمید صاحب کا تھا۔ کسی ہوٹل کے متعلق یہ کہہ دینا کہ وہ (Intercontinental) ہوٹل ہے کافی ہے، پھر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیسا تھا؟ دنیا کے تمام ہوٹل ایک نظام سے مربوط ہیں اس قسم کا ہوٹل پنج کوکبی (Five Star) ہوتا ہے جو ہوٹل کی اعلیٰ قسم ہے، کمرہ میں سامان رکھنے اور نماز مغرب[1] و عشاء ایک ساتھ ادا کرنے کے بعد ڈائننگ ہال گیا، بھوک تو لگی ہوئی تھی ہی، اور پھر پشاور کی آب و ہوا اور میز پر اعلیٰ سے اعلیٰ ہر قسم کے کھانے چنے

---

[1] میں سفر میں عموماً جمع بین الصلوٰتین کرتا ہوں، یعنی جب میں حرکت میں ہوتا ہوں، مگر یہاں اور دوسری کانفرنسوں میں دیکھا گیا کہ عرب حضرات عموماً جمع بین الصلوٰۃ کرتے ہیں خواہ حرکت میں ہوں یا مسافر کی تعریف کے ماتحت مقیم ہوں، بلکہ دونوں نمازیں ایک ساتھ جماعت سے پڑھتے ہیں۔

ہوگئے، اس لئے بدہضمی یا گرانی کے خوف وخطر سے بے نیاز ہوکر خوب شکم سیر ہوکر کھانا کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا، کھانے کے بعد جاپان، ایران، ملیشیا اور افغانستان کے چند دوستوں کے ساتھ ہوٹل کے لان پر ایک آدھ گھنٹہ کے قریب چہل قدمی کی اور پھر جاکر سو رہا،

کانفرنس دوسرے دن پشاور یونیورسٹی کے کنووکیشن ہال میں نو بجے کانفرنس کا آغاز حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت اور حکیم محمد سعید کی مختصر تعارفی تقریر سے ہوا، یہ ہال بہت بڑا اور خوبصورت ہے، مندوبین کے علاوہ مقامی مندوبین اور مدعوین کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے ہال ایک بڑی حد تک بھرا ہوا تھا۔ ابتدائی اجلاس کی صدارت صوبہ سرحد کی گورنمنٹ کے سینیر وزیر جناب عبدالرزاق صاحب نے کی، ترکی کے مسٹر حسن افصائی شریک صدر تھے اس اجلاس میں پروفیسر جارج مقدسی (امریکہ) نے " اسلام بحیثیت علم کے ترقی دہندہ " کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جو فکر انگیز اور بصیرت افروز تھا۔

میرا مقالہ لانی کے وقفہ کے بعد جب ساڑھے دس بجے اجلاس شروع ہوا تو اُس کے صدر اور شریک صدر علی الترتیب یمن کے وزیر شیخ محمد الصباحی اور امریکہ کے ڈاکٹر محمد عبدالرؤف تھے اس اجلاس میں پہلا مقالہ میرا تھا، اس کا عنوان تھا " اسلام اور سماجی انصاف " زبان انگریزی تھی، اس مقالہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام کی اُن تعلیمات کو اُجاگر کیا گیا تھا جو مساواتِ انسانی، عدل و انصاف، معاشی توازن، اور سماجی فلاح و بہبود کے کاموں سے متعلق ہیں، یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد عرض کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں اسلام کے احکام دو قسم کے ہیں (۱) ایک قانونی مثلاً زکوٰۃ، عشر، صدقاتِ واجبہ، حدود وغیرہ۔ اور (۲) دوسرے اخلاقی جو صرف نصیحت اور فہمائش کی شکل میں ہیں، اس موخر الذکر قسم کے بارہ میں مزید کہا گیا تھا کہ اسلام جس اعلیٰ قسم کا معاشرہ یا سماج پیدا کرنا چاہتا ہے اُس کے پیش نظر اُس کو توقع ہے کہ ان اخلاقی احکام کو بیان کر دینا کافی ہے اور اُن کو قانونی شکل دے دینے کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں ایسا ہی تھا۔ لیکن ان احکام کے اخلاقی ہونے کا مطلب ہرگز نہیں

تھا کہ یہ احکام ہمیشہ اسی حیثیت میں رہیں گے اور اُن کو کبھی قانونی شکل نہیں دی جا سکے گی۔ چنانچہ اگر کبھی ایسا وقت آئے جب لوگ اخلاقی احکام پر عمل کرنا ترک کر دیں اور اُس کی وجہ سے معاشرہ میں فساد پیدا ہو جائے تو اُس وقت اسلام ایک ریاست کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اسلام کے اخلاقی احکام کو قانون کی شکل دے کر انھیں ملک میں رائج کر دے، چنانچہ حضرتِ عمر کے زمانہ میں یہی ہوا۔ اس کو ایک مثال سے اس طرح سمجھئے کہ بیاہ شادی اور دوسری تقریبات مسرت کے موقع پر سادگی اور میانہ روی سے کام لینا اور دھوم دھڑکا اور فضول خرچی نہ کرنا اسلام کی تعلیم ہے، مگر یہ تعلیم صرف اخلاقی ہے، قانونی نہیں، لیکن اگر امیروں، دولت مندوں اور مالدار لوگوں نے معاشرہ میں فساد اس طرح پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے ہاں کی تقریبات میں محض دکھاوے اور خود نمائی کی خاطر سخت اسراف بے جا سے کام لینے لگے ہیں اور اُن کے اس عمل کے باعث سماج کے غریب غربا اور دوسرے کم خوشحال طبقہ کے لوگ سخت اذیت اور کوفت محسوس کرتے ہیں تو اس وقت اسلام حکومت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ قانون بنا کر ان تقریبات میں فضول خرچی، دھوم دھڑکا، دکھاوا اور خود نمائی وغیرہ چیزوں کو ممنوع قرار دیدے۔

بڑے افسوس اور رنج کی بات ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سماجی عدل و انصاف کا جو اعلیٰ نظام عطا فرمایا تھا، قرنِ اول کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اپنی پوری تاریخ میں کبھی اس نظام پر کلی طور پر عمل نہیں کیا، جزوی طور پر اُس پر عمل ہوتا رہا، مسجدیں آباد رہیں، خانقاہوں میں چہل پہل رہی، مدارس کے درو دیوار درس و تدریس کے شور و غل سے گونجتے رہے، وعظ و تلقین کے ہنگاموں سے منبر و محراب کا بھرم قایم رہا لیکن شہنشاہیت اور نظامِ جاگیرداری کے مسلط ہو جانے کے باعث دولت مندوں نے قرآن مجید کے حکم " وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ " کو پیش نظر کبھی اس پر توجہ نہ کی کہ معاشرہ کے غریب اور پسماندہ طبقات کی فلاح و بہبود کے لئے انھیں کیا کرنا چاہیے، کارخانہ داروں نے اپنے مزدوروں کے ساتھ وہ معاملہ روا رکھا جس کا نام قبائل

نے کس درد سے اس شعر میں کیا ہے، اگرچہ یہ خاص کشمیری مزدور کے بارہ میں ہے، لیکن اس کا اطلاق عالمِ اسلام کے تمام مزدوروں پر ہو سکتا ہے :-

کشمیری کہ با بندگی خوگرفتہ ... بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او ... نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

جاگیرداروں نے کسانوں کے ساتھ جنھیں وہ اپنی رعایا کہتے تھے توہین و تذلیل کا وہ برتاؤ کیا ہے کہ اُن کے مردوں اور عورتوں کی حالت غلاموں اور باندیوں جیسی تھی، امیر و دولت مند جن میں سے اکثر کی دولت ناجائز اور حرام ذرائع آمدنی کی مرہونِ منت تھی اپنی بیٹی یا بیٹے کی شادی پر بے دریغ لاکھوں روپئے خرچ کرتے رہے درآنحالیکہ انھیں کے شہر میں ہزاروں غریب ماں باپ تھے اپنی جوان لختہائے جگر کے پیلے ہاتھ دیکھنے کی تمنا میں شب و روز غلطاں اور پریشان رہے، لیکن تنگدستی کے باعث کچھ نہیں کر سکتے۔

علاوہ ازیں اسلام نے عورتوں کو جو حقوق بخشے ہیں مردوں نے کبھی اُن کا لحاظ اور پاس نہیں رکھا، تعلیم کے دروازے اُن پر بند رہے، اُن کے لئے دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ گھر کی چہار دیواری میں سمٹ کر آگئی، ازدواجی معاملات میں اُن کے جو اختیارات تھے وہ سب برائے نام رہ گئے۔

قانونِ فطرت ہے کہ ظلم اور جبر کا پھل کبھی میٹھا نہیں ہوتا، اور اُس کا ردِ عمل ایک نہ ایک دن ضرور ہوتا ہے، صدیوں کے انھیں ظلم و جبر اور ناانصافیوں کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا بھر کے غریب، مزدور اور کسان امیروں، کارخانہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف اور عورتیں مردوں کے خلاف، نوجوان اور نوعمر بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کے خلاف علم بغاوت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انسانی معاشرہ میں ایک سخت خلفشار اور ہیجان برپا ہے۔ یہ صورتِ حال عالم گیر ہے، لیکن میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قصور وار مسلمان ہیں، اگر انھوں نے اُس نظام پر عمل کیا ہوتا جو سماجی عدل و انصاف کے لئے ان

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیا تھا تو دوسری قومیں اُس کو اپناتیں، ٹھیک جس طرح آج ایشیا اور افریقہ کی قومیں یورپ، امریکہ اور روس کے ترقی یافتہ دساتیر اور نظامہائے زندگی کو اپنا رہی ہیں اور پھر نہ کمیونزم کو اس درجہ فروغ ہوتا اور نہ سوشلزم کا یہ چرچا سننے میں آتا۔ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس کے برخلاف جاگیرداری نظام کے آلۂ کار بنے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضور کی رحمۃ للعالمینی کے ظہور کے لئے مانع رہے فآہاً ثم آہاً۔

غرض کہ اسی قسم کے جذبات و احساسات تھے جن کے باعث جی چاہتا تھا کہ مقالہ دل کھول کر لکھوں، لیکن بانیانِ کانفرنس کی طرف سے اور ہدایات کے ساتھ ایک ہدایت یہ بھی دی گئی تھی کہ مقالہ پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہ ہو، اس لئے قلم کو بہت روک کر لکھا، پھر بھی تیس بائیس منٹ کا مقالہ ہو گیا اور اُس پر بھی ستم یہ ہوا کہ مقالہ کے دن چونکہ وقت بہت کم اور مقالات زیادہ تھے اس لئے جناب صدر نے مجھ کو صرف دس منٹ دیئے، اس لئے میں نے کچھ ادھر سے پڑھا اور کچھ اُدھر سے اور وہ بھی تیز رفتاری سے، جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا اُس کا خلاصہ آ ہی گیا۔

مقالہ کا ردِ عمل | مقالہ کا ردِ عمل مختلف ہوا۔ جو حضرات سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتے تھے اُن کے چہرے اُتر گئے، لیکن جو بیدار مغز اور روشن خیال اصحاب تھے انھوں نے چیرز دیں اور زبانی طور پر بھی تحسین کی، سنگاپور سے "اسلام" نام کا ایک سہ ماہی مجلہ انگریزی میں نکلتا ہے، اُس کے ایڈیٹر مولوی ایم۔ ایچ بابو صاحب نے سنگاپور واپس ہو کر مجھے خط لکھا جس میں مقالہ کی بہت تعریف کی اور اُس کو اپنے ہاں شایع کرنے کی اجازت مانگی، ڈربن کے ڈاکٹر صالح داؤجال اور اُن کی بیگم کو اس بات کا بڑا ملال تھا کہ مقالہ پورا نہیں پڑھنے دیا گیا۔ درآنحالیکہ بعض لوگوں نے بعد وقت کی پروا نہیں کی اور مقالہ پورا کر کے رہے۔

[illegible] | مولانا پاکستان کے جید علماء میں سے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، [illegible] میرا پہلا سال تھا وہاں اُن کا آخری برس تھا، مدرسے میں جو طلباء حسن استعداد و لیاقت

وقابلیت اور قوتِ تقریر کے باعث مشہور اور نمایاں تھے اُن میں ایک یہ بھی تھے، موصوف اور اُن کے رفیق مولانا مفتی محمود (یہ بھی دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ ہیں) سوشلسٹ پارٹی کے حامی ہیں اس لئے پاکستان کے کٹر مذہبی حلقے، خصوصاً کراچی اور لاہور میں ان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن صوبۂ سرحد میں ان دونوں حضرات کا بڑا وقار اور مرتبہ ہے، اس اجلاس میں مولانا غلام غوث ہزاروی کا بھی مقالہ ہوا جو عربی زبان میں اور عدالتِ صحابہ پر تھا، مولانا نے اس میں ثابت کیا تھا کہ عدالتِ صحابہ کو تسلیم کرنا شرطِ ایمان ہے، جو لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے وہ ایمان سے خارج ہیں، مولانا کا لب ولہجہ اور اُن کے گھن گرج کا انداز وہی تھا جو ہمارے علماء کا شعار ہو گیا ہے۔

مجھے تعجب تھا کہ عدالتِ صحابہ ایسے مسئلہ پر موصوف نے خطابت وتحریر کا پورا زور صرف کر دیا، ایک پاکستانی مسلمان جو میرے قریب بیٹھے تھے میں نے اُن سے کہا کہ آج کل پاکستان میں جو سخت شیعہ سُنّی کشیدگی پائی جاتی ہے مولانا کا یہ مقالہ غالباً اُسی کا نتیجہ ہے! انھوں نے فوراً کہا "جی نہیں! بلکہ اُن کا گوشۂ التفات جماعتِ اسلامی کی طرف ہے" اُن کے اس فقرہ سے مجھ کو یہ محسوس کر کے دکھ ہوا کہ اب جماعتِ اسلامی کی بدنامی کہاں تک پہنچ گئی ہے اور دوسرے مقالات حسبِ ذیل ہیں:

"پیغمبرِ اسلام اول اور آخری نبی" ڈاکٹر جیرہارڈ بودنگ (امریکہ) "پیغمبرِ اسلام اُمّت کے ایک قائد کی حیثیت سے" ڈاکٹر عبدالرحمٰن دوتی (نائجیریا) "اسلام میں علم کا مرتبہ و مقام" الاستاذ محمد بلی الفوطی (ٹوگو) "اسلام اور سائنسی تحقیقات" پروفیسر ڈاکٹر محمد عطاء اللہ (پاکستان) "پیغمبرِ اسلام ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے" محمد اسماعیل صاحب سیٹھی (پاکستان) "شہنشاہ اکبر اور عیسائی مشنریز" ڈاکٹر مونرینک گریو (بلجیم) "ایک بین الاقوامی تبلیغی ادارہ کی ضرورت" پروفیسر سید عظیم شاہ بخاری (پاکستان) "اسلام میں حُسن اساس کا تصور" ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی "پیغمبرانہ رہنمائی کی خصوصیات قرآن مجید کی روشنی میں" استاذ محمد

عبدالقدوس (پاکستان)

اس نشست پر پشاور میں مقالات کا اجلاس ختم ہوگیا۔

سوشل پروگرام | مقالات کی نشست کے علاوہ پشاور کا سوشل پروگرام بھی بہت دلچسپ اور پرلطف رہا، ۱۰ر مارچ کو پشاور کے وزیرِ اوقاف کی طرف سے لنچ، شام کو چار بجے اہالیانِ پشاور کی طرف سے پردہ باغ میں استقبالیہ، شب میں آٹھ بجے شمال مغربی سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کی طرف سے ڈنر، اس کے بعد نو بجے ایک جلسۂ عام جو ادارۂ تبلیغ کی طرف سے چوک یادگار میں منعقد ہوا، اس میں مولانا کوثر نیازی نے نہایت پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی اور مختلف مندوبین نے اپنی اپنی قومی زبان میں نعتیہ کلام سنایا، بارہ بجے کے قریب یہ مبارک اجتماع ختم ہوا۔

سیر و سیاحت | لیکن دوسرے دن یعنی ۱۰ر مارچ کا پروگرام جس میں ہم لوگ افغانستان کی سرحد تک گئے بے حد دلچسپ، پُرلطف اور نشاط انگیز رہا۔ دس بجے کے لگ بھگ ہم لوگ ہوٹل سے روانہ ہوئے، جو مندوبین از قسم وزرا رہتے وہ کاروں میں اور باقی سب لوگ اعلیٰ درجہ کی سیٹ والی بسوں میں تھے، خیبر پاس میں داخلہ پرمٹ سے ہوتا ہے، جب ہم اس قبائل کے علاقہ میں پہنچے تو منظر بڑا عجیب و غریب تھا۔ سڑک کے دونوں جانب اونچے نیچے پہاڑ، اُن پر پگڈنڈیاں اور پُرپیچ و خم راستے، سرسبز و شاداب نہیں، بلکہ خشک، پہاڑوں کے اندر غار اور اُن میں سوراخ، انگریزوں کے زمانہ میں یہ قبائل ہمیشہ انگریزوں سے برسرِ جنگ رہے، انگریزوں نے اپنے تمام حربے استعمال کرلئے مگر یہ قبائل کبھی رام نہیں ہوئے، پہاڑ کے غاروں میں رہتے اور وہیں سے سوراخوں کے ذریعہ انگریزی کارواں یا اُن کی رجمینٹ پر گولیاں برساتے رہتے تھے، یہ رائفلیں یا بندوقیں خود ان لوگوں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہوتی تھیں! اور کیا مجال کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ولایتی بندوق یا رائفل سے کم ہو، قبائل کی زندگی بالکل بدویانہ ہے شہری زندگی کی کوئی علامت کا یہاں کہیں گذر نہیں، سنہ میں جب میں یہاں آیا تھا تو اُس وقت غربت و افلاس عام تھے لیکن اب اُن کی اقتصادی حالت بہتر ہوگئی ہے، وجہ یہ ہے کہ پاکستان گورنمنٹ ان

کی اصلاح اور ترقی پر روپیہ بے دریغ خرچ کر رہی ہے، علاوہ ازیں ان کو افغانستان سے ہر قسم کی اشیاء کو اسمگل کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے روزانہ سیکڑوں خچر اور گدھے سامانوں سے لدے پھندے اُدھر سے ادھر آتے ہیں اور لنڈی کوتل کے بازار ان چیزوں سے بھرے رہتے ہیں جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں بہت سستی اور با افراط مل جاتی ہیں، ان لوگوں میں پردہ کا رواج نہیں ہے لیکن غیرت و عزتِ نفس کا یہ عالم ہے کہ کسی غیر عورت پر بدنظری کی نگاہ ڈالنا زندگی سے ہاتھ دھو لینا ہے، آب و ہوا کے کیا کہنے ہیں۔ عالم میں انتخاب ہے، سخت غربت و افلاس کے باوجود جسے دیکھئے سرخ و سفید، تندرست و توانا اور مست الست نظر آتا ہے۔

<u>لنڈی کوتل</u> | ان تمام پہاڑوں کے بیچ میں سے گذرتے ہم پہلے خیبر پاس آئے، پھر لنڈی کوتل پہنچے۔ جو ایک معروف اور کاروباری مقام ہے، اس سے گذر کر سرحدِ افغانستان پر پہنچے، یہ بڑی پر لطف، پُر فضا اور نشاط انگیز جگہ ہے، ایک سرسبز و شاداب پہاڑی پر چڑھ کر دیر تک ادھر اُدھر گھومتے اور قدرت کی بے پناہ عطا بخشیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، یہاں کے جانور بھی کس درجہ فربہ ہوتے ہیں؟ اللہ کی شان ہے، جو لوگ صحت کی خاطر پیرس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ جاتے ہیں اگر وہ کسی اچھے اور معتدل موسم میں ایک مہینہ یہاں آکر رہ جائیں تو زندگی میں انقلاب آجائے۔

یہاں سے واپس ہو کر پھر لنڈی کوتل آئے۔ لنچ یہیں کھانا تھا۔ سردارِ قبیلہ کی طرف سے دعوت تھی، اور سب کھانے وہی تھے جو اب تک کھاتے چلے آرہے تھے، البتہ بھُنے ہوئے مُسلّم دُنبے یہاں کی خصوصیت تھے، خالص گھی، خالص دودھ اور بہترین پانی کے باعث ان کھانوں کی لذت ہی دوسری تھی، کھانوں کے ساتھ خشک اور تر میووں کی ریل پیل، جذبۂ اشتیاق کی تسکین کو اور کیا چاہیئے! یہاں کی آب و ہوا پر اعتماد کر کے میں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ اُس کے بعد ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ پھر وہاں سے روانہ ہوئے تو راستہ بھر پہنچتے پہنچتے درمیان میں دو اور جگہوں پر سردارانِ قبائل کی طرف سے دعوتیں تھیں اور ان دعوتوں میں بھی طرح طرح

کھانا وقت اور پھلوں کا بھی اہتمام تھا جو لنڈی کوتل میں تھا عجیب تر بات یہ ہے کہ کھانے والوں نے جن میں خاکسار راقم الحروف بھی ہے کسی دعوت میں اکل و شرب میں کوتاہی نہیں کی، پھر لطف یہ کہ نہ بدہضمی نہ ثقل نہ گرانی اور طبیعت ہلکی پھلکی اور نہایت چاق و چوبند!

احباب | پانچ ساڑھے پانچ بجے کے قریب ہوٹل واپسی ہوئی تو دیکھا چند علمائے سرحد و پنجاب مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے ہوئے ہیں، ان سب کو ساتھ لے کر کمرہ میں آیا۔ علما کا یہ وفد جناب مولانا سمیع الحق صاحب اڈیٹر "الحق" اکوڑہ خٹک کی سرکردگی میں تھا، مولانا کے والد ماجد جناب مولانا عبد الحق صاحب محدث پنجاب و سرحد کے اکابر علماء و مشائخ میں سے ہیں صاحب ارشاد و ہدایت اور مرجع خواص و عوام ہیں۔ مولانا سے جو دیرینہ تعلق ہے اُس کے باعث میرا فرض تھا اکوڑہ خٹک حاضر ہوتا، لیکن کانفرنس کی وجہ سے مجبور تھا، مولانا سمیع الحق صاحب الولد سر لابیہ کے مصداق بلند پایہ عالم دین، صاحب درس و تدریس اور صاحب قلم ہیں۔

علماء کی اتنی بڑی جماعت سے بیک وقت ملاقات ہوگئی اس سے بڑی خوشی ہوئی مختلف امور و مسائل پر گفتگو رہی، میری کتاب صدیق اکبر، فہم قرآن اور وحی الٰہی اور برہان کے بعض مضامین کا تذکرہ ہوتا رہا، اسی سلسلہ میں مجھے سخت تعجب ہوا جب کہ ایک صاحب نے میری اُس تقریر کی بڑی تعریف کی جو میں نے نومبر ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جشن کے موقع پر کی تھی، میں نے کہا: اچھا اس تقریر کی صدائے بازگشت یہاں بھی پہنچ گئی! "انھوں نے کہا" کیوں نہیں، پاکستان کے تمام اخبارات نے آپ کی یہ تقریر چھاپی تھی اور ہم سب دیوبند سے نسبت رکھنے والوں کو اسے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی، میں اس وقت جلدی میں تھا، ابھی ایک ضرورت سے شہر جانا تھا اور پھر کراچی کے لئے روانگی کی تیاری کرنی تھی اس لئے افسوس ہے ملاقات مختصر رہی۔

یہاں کانفرنس کی تقریبات میں بھی متعدد احباب سے ملاقات ہوئی ان میں دو نام یہ ہیں

پروفیسر محمد طاہر فاروقی | یہ میرے بچپن کے ساتھی اور دوست ہیں، میرا اور اُن کا اصل وطن بھی ایک ہی ضلع ہے، گو بجنور ہے، مگر میری طرح آگرہ میں رہ بس گئے تھے اور اپنے بھائی مولانا حامد حسن قادری اور

عابد حسن فریدی کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے عربی۔ فارسی، اُردو اور انگریزی کی پوری تعلیم از اول تا آخر یہیں آگرہ میں حاصل کی اور ان زبانوں کے بیسیوں امتحانات الہ آباد سے پاس کئے، کم عمری میں ہی ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئے پھر ترقی کر کے آگرہ کالج میں اُردو کے صدر شعبہ ہو گئے، جامعہ اُردو علی گڑھ کے بانی بھی ہیں، تقسیم کے کچھ دنوں بعد پشاور گئے اور وہاں یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے، چند برس ترکی میں بھی اُردو کے پروفیسر رہ چکے ہیں، کانفرنس ہال میں ان سے اچانک ملاقات ہوئی کہنے لگے " میں صرف آپ کا نام سن کر آپ سے ملاقات کی غرض سے یہاں آیا ہوں" اور واقعی انھوں نے ایسا ہی کیا، مجھ سے گفتگو کے بعد اجلاس کی پہلی نشست میں تو شریک ہوئے، پھر واپس چلے گئے، اور دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی،

مولانا نور الحق ندوی ازہری | میری سب سے پہلی ملاقات ان سے ۲۸ء میں اُس وقت ہوئی تھی جب کہ یہ تازہ تازہ جامع ازہر سے فارغ ہو کر لاہور آئے تھے، اُس وقت یہ انگریزی لباس میں ملبوس تھے، ڈاڑھی صفا چٹ تھی۔ اور گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ قاہرہ کی آزاد آب و ہوا سے کافی متاثر ہو کر آئے ہیں، مصر سے ایک بیوی بھی ساتھ لائے تھے۔ اس زمانہ میں کراچی کے سندھ مدرسہ کالج میں عربی کے استاد تھے، دوسری مرتبہ ان سے ملاقات اُس وقت ہوئی جب کہ ۷۴ء میں میں پشاور گیا تھا اور وہاں کے اسلامیہ کالج کے وائس پرنسپل حافظ محمد عثمان صاحب مرحوم کے ہاں کالج کے کیمپس ہی میں بربنائے قدیم تعلق خاطر مقیم تھا، اس زمانہ میں مولانا نور الحق ندوی اسلامیہ کالج، پشاور میں دینیات کے ڈین تھے اور اس لحاظ سے اُن کا حلیہ پہلے سے بالکل بدلا ہوا تھا، گنجان شرعی ڈاڑھی چہرہ پر، عمامہ بر سر اور جبہ و قبا در بر، جمعہ کی نماز میں امامت اور خطابت بھی ان کے فرائض منصبی میں سے تھے، یہ شروع سے برہان کے قاری رہے ہیں اس لئے مجھ سے اُن کو ہمیشہ تعلق خاطر رہا اور برہان کی اور میری قدر افزائی کرتے رہے، اسلامیہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عباسیہ بہاولپور کے وائس چانسلر ہو گئے تھے، مگر معلوم نہیں کیا اسباب پیش آئے کہ جلد ہی وہاں سے الگ ہو گئے

اب تیسری مرتبہ پھر کانفرنس میں اُن سے ملاقات ہوئی تو دیکھتے ہی لپٹ گئے، مولویانہ سکہ حد

کے مطابق پیشانی کا بوسہ لیا، آج کل پشاور میں وقف کمشنر ہیں، اس حیثیت سے سیرت کانفرنس سے اُن کا براہ راست تعلق تھا اور حکومت کی طرف سے کانفرنس کے منتظمین میں سے تھے، اس لئے اُن سے بار بار ملاقات ہوئی، سرحد میں شاید کوئی شخص کمزور اور ضعیف الجثہ ہوتا ہی نہیں، مولانا کی عمر کافی ہے، ڈاڑھی تو ڈاڑھی ابرو تک سفید ہیں، مگر ماشاء اللہ دم خم، چستی و توانائی اور چہرہ پر سرخی اور سینہ کا چوڑا چکلا پن وہی ہے،

قاضی ابوالفضل محمد عبدالحق مرحوم | یہاں یہ سُن کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ قاضی ابوالفضل محمد عبدالحق کا انتقال ہوگیا، مرحوم سرحد کی ایک نمایاں شخصیت اور پاکستان نیشنل اسمبلی کے ممبر تھے، میرے اور اُن کے تعلق کی داستان یہ ہے کہ سینٹ اسٹیفینس کالج میں تقرر سے پہلے جب میں مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں مولوی فاضل اور منشی فاضل کلاسوں کا اُستاد تھا مرحوم اپنے برادر خورد لطف الحق کے ساتھ دہلی آئے اور انھوں نے مولوی فاضل میں اور لطف الحق نے منشی فاضل میں داخلہ لیا۔ اس سال دوسری کتابوں کے ساتھ مولوی فاضل کورس میں ابن سینا کی مشہور کتاب اشارات بھی میرے درس میں تھی، عبدالحق دیوبند کے فارغ التحصیل اور سرحد و پنجاب کے عام لوگوں کی طرح فلسفہ و منطق پر بڑے نازاں تھے، چنانچہ انھوں نے ایک ہفتہ تک اشارات کے درس میں مجھ کو "شکست" دینے کی کوشش کی، لیکن میں نے فلسفہ میں صدرا اور شمس بازغہ ملا رسول خان صاحب اور منطق میں قاضی اور حمد اللہ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہما سے دیوبند میں دل لگا کر پڑھی تھیں، علاوہ ازیں اشارات کی دو شرحیں ہیں، ایک محقق طوسی کی اور دوسری امام رازی کی، میں دونوں شرحوں کا پابندی سے مطالعہ کرتا تھا اس لئے عبدالحق کا جادو مجھ پر کس طرح چل سکتا تھا، دس بارہ دن کے بعد یہ میرے مکان پر آئے، معافی چاہی اور اُس وقت سے دونوں بھائی میرے نہایت گرویدہ اور مقرب شاگرد ہو گئے ۔

ثروت و عظمت | یہاں کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دونوں اپنے وطن شیدو ضلع نوشہرہ واپس چلے آئے یہاں خدا کی شان! دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو عبدالحق نے ملٹری کو گوشت سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لیا بس پھر کیا تھا، دیکھتے دیکھتے لکھ پتی ہو گئے اور بڑے ٹھاٹ سے رہنے لگے،

میرا سفر پشاور | اب انھیں اُستاد بھی یاد آیا، دونوں بھائیوں نے مجھ کو سخت اصرار سے پشاور کی دعوت

وہ اگرچہ ان کا وطن شیدو تھا، لیکن صدر پشاور میں بھی ان کا ایک وسیع اور کشادہ مکان تھا۔ میں پشاور پہنچا تو اسی مکان میں ٹھہرایا گیا، یہاں اللہ کی کون سی نعمت تھی جو نہیں تھی، نوکر چاکر کار سب ہی کچھ تھا۔

پشاور کی آب وہوا کی معجز نمائیاں میں اس زمانہ میں کالج میں تھا اور میرا اصل کھانا صرف ایک وقت یعنی شام کا رہ گیا تھا، صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا لنچ ان کا اندازہ صرف دو توس اور ایک فرائڈ انڈے پر تھا مگر اب سنئے کہ پشاور پہنچتے ہی کیا انقلاب آگیا، جس روز میں پشاور پہنچا اسی روز شام کو عبدالحق کار میں سیر تفریح کے لئے لے گئے، میں نے بازاروں میں نہایت اعلیٰ درجہ کے شیریں اور ٹھنڈے سیاہ انگور اور سردے دیکھے تو اپنے میزبان سے کہا: "اب میرا معمول یہ رہے گا کہ شام کو صرف انگور اور سردہ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا اور اس کے علاوہ کچھ اور نہیں" عبدالحق یہ سن کر ہنسے اور بولے کہ دیکھئے! اپنے قول وقرار پر قایم رہے گا، میں نے کہا: ضرور! اس قرارداد کے مطابق ٹوکرہ میں بھرے ہوئے انگور اور سردے آگئے، میں نے شکم سیر ہو کر کھائے، مگر ایک گھنٹہ کے بعد ہی سخت بھوک لگنے لگی، ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار کیا تو کھانا میز پر لگ گیا۔ بھوک سخت تھی اس لئے کھانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، کھانے سے فراغت کے بعد عبدالحق کار میں قصہ خوانی بازار لے گئے اور وہاں ایک دکان میں ہم نے ایک ایک پلیٹ تکے کے کبابوں کی کھائی اور ایک ایک برادستر چائے کا پیا، ان سب بے عنوانیوں کے باوجود جب صبح کو اٹھا تو طبیعت نہایت ہلکی پھلکی اور شاداں وفرحاں تھی۔ اس کے بعد سے میرا معمول یہ ہو گیا کہ جب تک صوبہ سرحد میں رہا چار وقت شکم سیر ہو کر کھانا کھاتا تھا۔ جس میں مرغ وماہی لازمی طور پر شامل ہوتے تھے۔

میرا یہاں قیام کم وبیش ایک ماہ رہا ہوگا۔ اسی درمیان میں خیبر پاس بھی گیا اور ایک پورا دن قبائل آزاد کے ساتھ گذارا، چند روز کے لئے اسلامیہ کالج میں آکر ٹھہرا، شیدو میں کئی دن قیام کیا، نوشہرہ گیا، اس کی سیر کی، مردان گیا اس کی سیر سے متمتع ہوا، ایک مہینہ میں حالت کچھ سے کچھ ہو گئی، مجھ کو یقین ہے کہ ہزار دوائیں ایک طرف اور پشاور کے کسی صاف ستھرے اور کشادہ علاقہ میں کم وبیش ایک ماہ قیام ایک طرف!!!

ابنِ ایاس

حالاتِ زندگی اور تصانیف

جناب طارق مختار صاحب ایم۔ اے، علی گڑھ

ابنِ ایاس تیسرے مورخ ہیں جن کے سر نیدرہویں صدی عیسوی میں مصری تاریخ نویسی کا سہرا ہے۔ ان کا نام محمد بن احمد بن ایاس مصری حنفی ہے[1]۔ ان کی پیدائش ۸۴۴ھ میں قاہرہ میں ہوئی۔ ابو المحاسن کی وفات سے ۲۱ سال قبل۔ ابنِ ایاس ابو المحاسن سے اس معنوں میں مشابہ ہیں کہ ان میں سے دونوں کا تعلق مملوک خاندان سے تھا لیکن ابنِ ایاس کا مملوک سوسائٹی میں گہرا اثر تھا۔ ہم ابو المحاسن کے اصل کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتے ہیں کہ ان کے والدین سلطان برقوق کے زمانہ میں مصر آئے۔ جب کہ ہمیں ابنِ ایاس کے جدِ امجد کے متعلق بھی علم ہے کہ ان کا نام ازدمر دمری ناصری ابو ذقن المعروف بخازندار تھے۔ اور ازدمر دولتِ مملوکی کے پہلے دور میں سلطان حسن اور شعبان کے امیروں میں سے تھے اور ان دونوں کے دورِ حکومت میں امیر صلح کے عہدے پر فائز تھے اور موخر الذکر کے دور میں تو انھیں کافی ترقی

---

[1] بروکلمان نے اپنی فہرست ۲۷۰ میں Brockelmann: Gesch. der Arab. Litt. II P. 375 ابن ایاس کا پورا نام اس طرح لکھا ہے ابو البرکات محمد بن احمد بن ایاس زین الدین (یا شہاب الدین) ناصری چرکسی حنبلی۔ اور اپنے مذکورہ کتاب کے ضمیمہ میں ان کی نسبت حنابلہ کی طرف کر دیتی گیا ہے یہ درست نہیں ہے چونکہ ابن ایاس کے شیوخ میں بھی کوئی حنبلی معروف نہ تھا۔ II, P. 405

ملی اور معتمد بنے۔ طرابلس صعفد اور حلب کے نایب بھی مقرر ہوئے اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں دمشق کے نایب بھی مقرر ہوئے لیکن وہ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ ۲۶۶ ھ ۱۴ میں موت نے ان کی طرف جلدی کی اور ہمیں ابن ایاس کے دادا کے متعلق بھی تھوڑی بہت معلومات ہیں ان کا نام ایاس فخری تھا وہ سلطان ظاہر برقوق کے ممالیک میں سے تھے اور جلد ہی انھیں امارت بھی ملی، سلطان فرج بن برقوق کے دور میں انھیں دوا دِ ثانی کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

ابن ایاس کے والد کا نام شہاب الدین احمد تھا، اپنے لڑکے کے قول کے مطابق مشہور لوگوں کی اولاد میں سے تھے، یعنی وہ مملوک کے اس گروپ سے تھے جو اپنے سلف کے وفات کے بعد ابنائے امراء کہلاتی تھی اور دستور یہ تھا کہ ان کے بزرگوں کی رعایت کرتے ہوئے نظام جنگ میں ان میں سے کسی ایک کو "امیر خمسہ" کا عہدہ دیا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ سلطان کے حواشی میں ہو اور امن کی حالت میں کوئی چھوٹی موٹی مدنی ملازمت کے قابل ہو۔ ابن ایاس نے اپنے والد احمد سے نقل کیا ہے کہ وہ حکومت کے بہت سے امراء کی نظر میں محبوب تھے اور اُن کی عمر ۸۴ سال ہوئی اور اس طویل مدت میں ان کی ۲۵ اولادیں ہوئیں جن میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی لیکن ان کی وفات ۱۵۰۲ء کے بعد صرف ایک لڑکی اور دو لڑکے زندہ بچے جن میں سے ایک خود ابن ایاس ہیں اور دوسرے جمالی یوسف۔ شاید لڑکی وہ تھی کہ جس کا شوہر امیر قرقماس پہلوان تھا اور سلطان قایتبای کے زمانہ میں وہ "دہ ہزاری" امیروں میں سے تھا اور سلطانی ملازمت میں جو تھے امیر آخور کے عہدہ پر فائز تھا اس کی وفات ۱۴۷۲ء میں بیرہ کی جنگ میں نہر فرات میں ہوئی جہاں مملوکی لشکر کو یشبک بن مہدی کی قیادت میں حسن الطویل (اوزون حسن) کے لشکر پر فتح حاصل ہوئی جو ترکمانیوں کا بادشاہ تھا اور یہ لوگ "سفید بکری" کے نام سے مشہور تھے دوسرا لڑکا جمالی یوسف سلطان قانصوہ الغوری کے زمانہ میں توپ خانہ سازی کی نگرانی پر مامور تھا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس فن سے آگاہ تھا اور اس کے ہاتھوں میں

لے قلقشندی صبح الاعشی ج ۴ ص ۱۸ ۔ دائرہ المعارف الاسلامیات (عربی ترجمہ) ابن ایاس پر مضمون۔

اس سلسلہ کا کوئی بڑا منصب تھا۔

ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن ایاس مملوکی دور میں امراء اور سرداروں میں پلے بڑھے
قایتبائی اور غوری کے زمانہ میں دولت مملوکی کے سربرآوردہ لوگوں سے شادی بیاہ اور دوسری طرح
سے ان کا تعلق بڑھا لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کسی نے بھی تھوڑی یا
زیادہ ان کی سوانح نہیں لکھی اور جو کچھ اس عظیم مورخ کی نئی سوانح کے لئے مواد ملتا ہے وہ ان کی
تالیف کردہ کتابوں میں منتشر ہے اور محقق اسے معاصرین اور متاخرین کی کتابوں میں نہ ہونے کی
وجہ رد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ شیخین جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی اور عبدالباسط بن خلیل حنفی کی تصانیف
ہیں اور یہ دونوں حضرات اِن کے بیان کے مطابق ان کے استاد تھے، یا جیسے سخاوی، عزی، اعظمی،
بورینی، یمنی، محبی، اور مرادی کی تصانیف ہیں یہ لوگ نویں دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی
کے لوگوں کی سوانح لکھنے والے ہیں۔

اس کی سوانح کا یہ فقدان نہ تو اس پر لکھنے والے کو عاجز کرتا ہے اور نہ اس پر لکھنے کی کوشش
کو مشکل بناتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا گھاٹا ہے جس میں کچھ فائدہ بھی ہے اگرچہ وہ منفی فائدہ ہے کیوں
کہ ان چیزوں پر اعتماد کرنا منحصر ہو جاتا ہے جو مؤلف نے اپنے بارے میں اور اپنے دور کے لوگوں
کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے۔ واقعات کے متعلق اس کا موقف صاف طور پر سمجھنے
اور اس میں اس کے شخصی اخلاق کی جھلک ملتی ہے۔ ان اشارات میں خاص طور پر ابن ایاس
کی شخصیت ہے کہ وہ اپنے والد شہاب الدین احمد اور ابو المحاسن کی طرح لوگوں کی اولاد کی ٹولی
میں پلا بڑھا۔ ۱۴۷۷ء میں ابن ایاس نے حج کیا جب کہ وہ مصری سواروں کی کسی ملازمت
میں تھا جیسا کہ ابو المحاسن کی جانب بھی اس کے حج کے سلسلہ میں منسوب ہے۔ لیکن اس نے
مکہ میں حجاج کی دشواریوں اور پریشانیوں کا مشاہدہ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت مملوک
بادشاہوں اور بعض اہل مکہ کے درمیان اختلافات تھے۔ پورے عہد ممالیک میں جا بجا تک شخصیت
امراء اور بادشاہوں کے نمائندگان کے درمیان جو اختلافات تھے ان کے حسد کینہ دشمنی کی وجہ ہے۔

ابن ایاس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ عیش و آرام سے گذارا اور یہ سلطان غوری کے دور کی بات ہے۔ اس نے خوش حال زندگی گذاری، اس کا زیادہ وقت تاریخ میں تصنیف و تالیف پر گذرا اور اس نے مناسب موقعوں کے لحاظ سے زجل موشحات اور مزدوجات لکھے۔ ابن ایاس کی نظمیں قابل توجہ ہیں ان کا کچھ حصہ سلطان یا ملک کی تعریف یا مرثیہ کے طور پر لکھا، کچھ اُمراء کے مرض سے شفایاب ہونے یا کسی مصیبت سے چھٹکارا پانے پر لکھا اور کچھ حکومت کے بعض کاموں کی برائی اور تنقید بیان کرنے کے لئے لکھا۔ کیا ہم ان قرائن سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر کوہیم نے لکھا ہے کہ ابن ایاس مملوکی دور میں حکومت کے مورخ کے فرائض انجام دیتا تھا باوجودیکہ اس نے اپنی کتابوں میں ان چیزوں کا تعین نہیں کیا ہے اور باوجودیکہ ممالیک کے دور میں "مورخ الدولہ" کا عہدہ نہ تھا؟ یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سلطانی حاشیہ نشینوں میں شامل ہو کر عیش و عشرت میں رہا اور اپنے باپ کی طرح بعض لوگوں سے وابستہ رہا اور اس نے فرصت کے اوقات میں شہرت کے لئے اشعار لکھے؟ یا ہم اس کو ترجیح دیں کہ اُس نے سلطان محمد بن قایتبائی کے ساتھ رہ کر خود کو عینی کی طرح کرنا چاہا جس کا تعلق برسبائی سے تھا یا ابو المحاسن کی طرح اس کا تعلق سلطان الظاہر محمد بن جقمق سے تھا۔

اس کے ان اشعار سے جو خاص اور عام موقعوں کے لئے تھے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص بن کر رہا کہ جس نے اس سوسائٹی کا تذکرہ کیا جس میں اُس کی زندگی گذری اور یہ بات اُسے صرف ایک ایسے مورخ کی طرح پیش نہیں کرتی ہے جو واقعات اور اخبار کے ذکر کے لئے مخصوص رہا ہو بلکہ وہ ایک زندہ اور حساس شخص تھا جس نے اس دورِ حکومت کی خامیوں اور زوال کے اسباب کو بیان کیا۔ اور اس کے حساس ہونے کی واضح دلیل وہ قصیدہ ہے جو سلطان غوری کے آخری دور میں ٹیکس لگانے پر اُس نے لکھا ہے اور وہ مرثیہ ہے جو اس نے مصر میں عثمانیوں کی فتح کے موقع پر لکھا ہے ۹۰۰ھ کے نصف میں ابن ایاس پر وہ آفت آئی جس نے اُس کی پُرسکون زندگی کو درہم برہم کر دیا جب کہ سلطان غوری کے ممالیک پر مقررہ دولت کو خرچ کرنے میں تنگی

کر دی گئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ فوجیوں کی بعض جاگیروں کو ان سے واپس لے لے اور احباسیہ اوقاف کو ختم کر دے۔ اور ان کی اراضی کو زبردستی ٹیکس کے طور پر لے لے جب معاملہ مار پیٹ، آتش زنی اور تشدد پر پہنچا تو ابن ایاس کو بھی ان چیزوں کا سامنا کرنا پڑا جس طرح اس طبقہ کے لوگوں کو کرنا پڑا تھا اس کی اراضی کا ایک بڑا حصہ سلطان کے چار مالک کو ملا لیکن وہ بغیر جاگیر کے زیادہ دنوں تک نہیں رہا کیوں کہ ۱۵۰۱ء میں اس کے اس قصہ کو جس میں شکایات حال بیان کی تھیں ایک قطعہ وقف کر دیا اور یہ قصہ اس وقت پیش آیا جب سلطان قلعہ کے میدان میں گیند کھیلنے جا رہا تھا سلطان نے اس کی شکایت کو سنا اور اس کی جاگیر واپس کر دی۔ اور ابن ایاس نے اپنی عادت کے مطابق ایک طویل قصیدے سے اس کی تعریف کی۔

حقیقی معنوں میں ابن ایاس سلطان غوری کے کاموں کو ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا اس سلسلہ میں سلطان کی وفات کے بعد اس نے اپنی عظیم کتاب بدائع الزہور فی وقائع الدہور میں جو کچھ لکھا ہے اسے شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کتاب مصر کی تاریخ پر قدیم دور سے عثمانی دور کے اوائل تک مشتمل ہے۔ اور یہی وہ کتاب ہے کہ جس نے ابن ایاس کو اپنے عہد کے مصری مورخین کے درمیان پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر اور سولھویں صدی کے اوائل میں سر فہرست بنا دیا ہے ابن ایاس نے اپنی اس کتاب کی تالیف ۱۴۹۳ء کے قریب شروع کی اور اپنے آخری دنوں تک اس میں مشغول رہا یہ کتاب ۱۱ جلدوں میں ہے اور اس کا ارادہ تھا کہ اس پر اضافہ بھی کرے تاکہ یہ بارہ جلدوں میں ہو جائے[1]۔ لیکن ۱۵۲۴ء میں موت نے اس کو مہلت نہ دی پھر نقل کرنے والوں نے اس کی نقلیں تیار کیں اور اس کے نسخے تیار کئے بعض تو پورے مکمل ہیں اور بعض

---

[1] اس کتاب کے چار اجزاء استنبول کے مکتبہ فاتح میں ہیں اور اس کے آخیر میں یہ ہے کہ اس کتاب کی چوتھی جلد کی تالیف ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) میں ہوئی پانچویں جلد بھی اسی سال لکھی گئی اور آٹھویں جلد ۹۱۳ھ (۱۵۰۷ء) کے اواسط میں اور گیارہویں ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) میں اواخر میں لکھی گئی اور اسی صفحہ پر ابن ایاس نے لکھا ہے کہ بارھویں جلد کی تیاری کر رہے ہیں۔ جس کو اپنی وفات کی وجہ سے یا تو شروع نہ کر سکے یا تھا ہو تو اس کی اطلاع نہیں ہے۔

مختصر اور ناقص۔ غالب گمان یہ ہے کہ ہمارے سامنے ناقص اور مختصر نسخے موجود ہیں انھیں ناقص نسخوں میں سے کتاب قاہرہ میں شائع ہوئی جو اصل سے دور ہے اور اس کے اہم اجزاء سے خالی ہے[1]

ابنِ ایاس کی کتابوں میں ایک کتاب عقود الجمان فی وقایع الازمان بھی ہے۔ یہ مستقل تاریخ مصر پر مختصر کتاب ہے اس کا اس عظیم کتاب سے یا اس کے منتخب کردہ نسخوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس کی کتاب نزہت الامم فی العجائب والحکم ہے جو تاریخ عالم میں ایک چھوٹی سی تالیف ہے، ایک کتاب مرج الزہور فی وقایع الدہور ہے جو انبیاء اور رسولوں کے قصوں پر مشتمل سیر حاصل کتاب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابنِ ایاس کے علاوہ یہ کتاب کسی دوسرے کی ہو باوجودیکہ بدایع الزہور میں اس کے بعض موضوعات کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ ابنِ ایاس کی ایک اور کتاب نشق الازہار فی عجائب الاقطار ہے اور یہ کتاب فلک، ہیئت کون کی ترکیب، فرعونی دور کے آثار اور اس زمانہ کے بادشاہوں کے حالات پر ہے۔ ابنِ ایاس نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس میں ان عجیب غریب باتوں کا تذکرہ کریں جو انھوں نے سُنا یا دیکھا ہے اور خاص طور پر مصر کے عجائب اس کے اعمال اور حکمان نے اس میں جو طلسمات بیان کئے ہیں اسے بیان کریں۔ اس کتاب کی تالیف سے ۱۵۱۰ء میں فارغ ہوئے اور اس کتاب سے یورپ کے علماء نے اُنیسویں صدی عیسوی میں بہت فائدہ اُٹھایا۔

ابنِ ایاس کی شہرت کلی طور پر اس کی تاریخ کی پہلی کتاب کی وجہ سے ہے اس کے آخری دور میں اسی کتاب میں دولتِ ممالیک کے احوال اور اخبار بیان کرنے کی وجہ سے وہ بہترین مورخ کہلایا اور یہ کتاب عثمانیوں کے مصر فتح کرنے کے متعلق بنیادی مراجع کا کام دیتی ہے اس کا اسلوب بھی انوکھا ہے اسی لئے ماگولیتھ نے اسے مصر اور مصر کے باہر کا ممتاز مورخ لکھا ہے وہ لکھتا ہے "بے شک کتاب کی تالیف میں اس کا اسلوب، اور اس کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ اس کی مستقل

---

[1] یہ نقص استنبول کے مستشرقین کی جماعت نے محسوس کیا ہے۔ پروفیسر کالا اور ڈاکٹر مصطفےٰ اور مرحوم سوبرنہم نے تین اجزاء میں اس کی اشاعت کی۔

مزاج اور شخصی رائے کی عکاسی کرتا ہے جو بڑے بڑے مورخین کے پاس بھی کم ہے[1]۔

حقیقت یہ ہے کہ ابنِ ایاس کو تنقیدی قدرت بھی تھی اس نے صرف حوادث وقایع اور اخبار بیان نہیں کئے ہیں بلکہ تاریخ میں سلف کے طریقہ سے ہٹ کر اُس نے واقعات کی تشریح بھی کی ہے اور فلسفہ بھی بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکم صادر کرنے میں قدرے سختی سے کام لیا ہے اور ہر چیز کو بیان کرنے میں جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ تصویر کشی میں کبھی کبھی غلو سے کام لیتا ہے۔ اور اس پر اس کو سلطانی دور میں مختلف اُمراء کے ساتھ تعلق میں بھی سہارا ملا چنانچہ اس کا تعلق امیر تمراز اتابک اور امیر اقبردی دوادار کبیر سے تھا اور یہ دونوں قایتبائی کے امراء تھے اس طرح اس کا تعلق ابوبکر بن مزہر، اس کے لڑکے بدری محمد اور قاضی محمود بن رجا سے تھا اور یہ لوگ حکومت میں کاتب السر کے عہدے پر تھے۔ مزید برآں اس کا تعلق اپنی بہن کی وجہ سے جمالی یوسف سے تھا جو اس کو قلعہ کے واقعات بتاتا تھا خاص طور پر سلطان غوری کے دور میں ابنِ ایاس نے جنگ کے جو واقعات لکھے ہیں اور اس کی تدوین کی ہے وہ اسی کی روشنی میں ہے۔

جہاں تک ابنِ ایاس کے اخلاق کا تعلق ہے اور معاصرین کے درمیان اس کی جو شہرت تھی اس کا علم نہیں ہو سکا۔ معاصرین اور متاخرین کی کتابوں میں بھی اس کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہے ہاں اس نے جو کتابیں خود لکھی ہیں یا وہ نوٹس جو اس نے اپنے بارے میں اس دور کے واقعات اور لوگوں کے حالات بیان کرنے کے ضمن میں چھوڑے دی ہیں۔ یہ سب باتیں اس عظیم شخصیت کے اسرار و رموز کے متعلق بہت سی باتوں کی جانب اشارہ کرتی ہیں اس کی تالیفات کی ضخامت اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنی زندگی بھر تصنیف و تالیف میں مصروف رہا اور روزانہ یا ماہانہ تدوینِ حوادث کا طریقہ جو اس نے معاصر حالات بیان کرنے میں اختیار کیا ہے یہ اس کی باریک بینی اور حقائق کا شدت سے استقصار کرنے پر شاہد ہیں۔ اور لوگوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے میں اس کی سختی اور اس

---

[1] ملاحظہ ہو Margoliouth: Lectures on Arabic Historians [illegible]

کی بلند اخلاقی کی ترجمان ہے مصر میں عثمانی حکومت پر تنقید کرنا یا اس کا مذاق اڑانا اس لیے تھا کہ یہ لوگ مصری لوگوں کے مصالح سے غفلت کرتے تھے۔ باوجودیکہ قاہرہ میں عثمانی حکومت کی وجہ سے خوف و دہشت کا دور دورہ تھا۔ یہ سب چیزیں ابن ایاس کو مورخین اور محققین کے نزدیک بلند مقام عطا کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ موقف عثمانیوں کے متعلق سوانح کی کتابوں میں اس کا ذکر نہ ہونے کا سبب ہو۔

انتخاب

الترغیب والترہیب (جلد دوم)

الامام الحافظ زکی الدین عبد العظیم المنذریؒ

نیک اعمال کے اجر و ثواب اور بدعملی پر زجر و عتاب کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں مگر حافظ منذری کی اس کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اور کسی کو حاصل نہ ہو سکی اس مقبول و مستند کتاب کے اُردو تراجم کی متعدد کوششیں ہوئیں مگر کوئی ترجمہ مکمل ہو کر شائع نہ ہو سکا۔

ندوۃ المصنفین نے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس کے انتخاب و ترجمہ کا پروگرام بنایا اور اس کے لئے مولانا محمد عبد اللہ طارق صاحب دہلوی کی خدمات حاصل کیں چنانچہ اس کی پہلی جلد شائع ہو کر حسن قبول حاصل کر چکی ہے۔ جسے ملک کے اہل علم اور ارباب بصیرت نے بہت سراہا ہے۔ شائقین کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ اب کتاب کی جلد دوم بھی عمدہ کتابت و طباعت اور سفید کاغذ پر چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔

آج ہی بڑی مقدار میں آرڈر دیجئے۔

جلد اوّل مجلد -/۱۸ بلا جلد -/۱۵ جلد دوم مجلد -/۲۰ بلا جلد -/۱۴

(رجسٹرڈ نمبر)

[illegible] المصنفین [illegible]

تبصرے

دفترِ دوم مثنوی مولانائے روم - از جناب مولانا قاضی سجاد حسین -
تقطیع متوسط - ضخامت ۳۶۰ صفحات، کتابت - طباعت - کاغذ اعلا
گٹ اپ سب اعلیٰ اور معیاری - قیمت مجلد -/8
پتہ :- سب رنگ کتاب گھر، دہلی ۶ -

اِس کتاب کے دفترِ اوّل پر تبصرہ ایک برس پہلے ہو چکا ہے، بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب دفترِ دوم بھی منظرِ عام پر آگیا، ترجمہ کی زبان، حواشی کا آہنگ اور مقدمہ کی جامعیت اور دقتِ نظر ہر اعتبار سے دفترِ دوم دفترِ اوّل سے بڑھ چڑھ کر اور نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاوّل کا مصداق ہے، صفحہ ۳۱۴ پر آخری شعر سے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "اَنوارِ خدا" کا ترجمہ "خدا کے نوروں" کیا گیا ہے جو اگرچہ لفظی اعتبار سے درست ہے لیکن اُردو میں "نوروں" کا لفظ سامعہ پر گراں گذرتا ہے، اسی طرح صفحہ ۳۱۵ پر مولانا نے ایک آیت کا ایک ٹکڑا "حَیْثُمَا کُنْتُمْ اَلْآیۃ" بطورِ مصرعِ ثانی کے نقل کیا ہے لیکن قرآن میں "وُجُوھَکُمْ" ہے اور مولانا نے "وَجْہَکُمْ" لکھا ہے جو نحو اور بلاغت کے قاعدہ سے بھی غلط ہے، فاضل مترجم کو ایک نوٹ میں اس پر متنبہ کرنا چاہیئے تھا[1]، اسی طرح جہاں تک کتابت کا تعلق ہے یہ بات بھی کھٹکی کہ جملہ استفہامیہ کے آخر میں (متن میں) کہیں علامت استفہام نہیں ہے مثلاً شعر ذیل کی کتابت اس طرح ہونی چاہیئے تھی،

---

[1] مولانائے روم نے اس طرح کی غلطیاں اور بھی کئی جگہ کی ہیں، مترجم کو ہوشیار رہنا چاہیئے۔

ہر کہ باشد ؟ ظالم ظلمت فزا "
شیخ کہ بود ؟ عکس انوار خدا ص ۳۱۴

امید ہے کہ آیندہ ان چیزوں کا خیال رکھا جائے گا : بہرحال ان چند معمولی فروگذاشتوں سے قطع نظر فاضل مترجم کی کاوش و محنت سزاوار صد تحسین و آفریں ہے۔ امید قوی ہے کہ دفتر اول کی طرح دفتر دوم بھی مقبول عوام و خواص ہوگا۔

انتخاب الترغیب والترہیب جلد دوم : ترجمہ از جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب طارق دہلوی، تقطیع کلاں، ضخامت ۰۰۰؍ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت -/۱۲ پتہ : ندوۃ المصنفین، اُردو بازار، دہلی ۶

یہ کتاب علامہ منذری کی کتاب الترغیب والترہیب کے ترجمہ کی دوسری جلد ہے جو حدیث نمبر ۱۹۱ سے حدیث نمبر ۵۰۲ تک یعنی تین سو گیارہ حدیثوں پر مشتمل ہے، یہ سب حدیثیں کتاب الصلوٰۃ سے متعلق ہیں، آخری حدیث قربانی سے متعلق ہے، پہلی جلد کو جو قبول عام حاصل ہوا امید قوی ہے کہ یہ جلد بھی ایسی ہی مقبول ہوگی، احادیث کا ترجمہ اور اُن کی تشریح کمال حزم و احتیاط کے ساتھ جس شستہ و رفتہ اور سلیس و عام فہم زبان میں کیا گیا ہے اُس کی وجہ سے یہ کتاب عام مسلمانوں کے لئے تو نور بصیرت ہے ہی، اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے اصحاب مدارس و اہل علم کے لئے بھی لائق مطالعہ اور مفید ہے، کیوں کہ صرف تلخیص اور ترجمہ و تشریح پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صاحب الترغیب نے حدیث کے آخر میں جن ماخذ کا ذکر کیا ہے لائق مترجم نے اُن پر اضافہ کیا ہے اور حواشی میں اُن کی تشریح کرتے گئے ہیں، پھر چوں کہ یہ کتاب کثرت سے طبع ہوئی ہے اور کسی اصل اور قدیم نسخہ سے موازنہ و مقابلہ کا اہتمام نہیں کیا گیا، اس بناء پر چند در چند فاحش غلطیاں مثلاً صحابۂ کرام و تابعین عظام کے ناموں میں غلطی، راوی کے نام میں التباس یا حوالہ کی غلطی، خلفائے من طبعی چلی آرہی ہیں، لائق مترجم نے کتاب کے متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں سے ان کا تفاوت

مقدمہ میں مذکور ہے) مقابلہ و موازنہ اور اصل مآخذ و مراجع سے رجوع کرکے ان غلطیوں کی نشاندہی اور اُن کی تصیح کی ہے، بعض جگہ خود صاحبِ کتاب سے مسامحت ہوئی ہے مثلاً (ص ۲۰۶) ایک ہی راوی کو انھوں نے ایک جگہ "حسن بن مالک" لکھ دیا اور دوسری جگہ اسے "مالک بن حسن" کردیا، حالانکہ صحیح موخر الذکر ہے لائق مترجم اُس پر بھی تنبیہہ کرتے رہ گئے ہیں؛ حافظ ابن حجر نے "انتفاءُ الترغیب" کے نام سے اس کتاب کی تلخیص کی تھی جو ملی گا ئل (مہاراشٹر) سے شائع ہو چکی ہے، لائق مترجم نے کہیں کہیں کسی روایت کے صحت و سقم سے متعلق حافظ ابنِ حجر کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور اُس کے وجوہ و دلائل لکھے ہیں، (مثلاً ص ۲۰۰) لیکن ہمارے خیال میں بعض جگہ مترجم خود غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں، مثلاً صفحہ ۳۰۵ پر انھوں نے بعض مترجمین پر گرفت کی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اور رخصت ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی مسافر رَمَضان کا روزہ رکھ لے اور اُس پر تعب اور مشقت بھی نہ ہو تو بہتر یہی ہے کہ روزہ پورا کرے اور اُسے نہ توڑے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھ کر توڑ دیا، اس سے اُمت کو یہ سبق دینا منظور تھا کہ اگر روزہ مشقت کا باعث ہو تو ایک مسافر کے لئے اُس کے توڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اس کے باوجود جو صحابہ روزہ انگیز کرنے کی طاقت رکھتے تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ روزہ نہیں توڑا بلکہ اس کے بعد بھی روزہ رکھا تو اب حضور نے ناراض ہو کر فرمایا: اُولٰئِكَ العصاۃ، اُولٰئِكَ العصاۃ، حدیث کا سیاق و سباق صاف بتلاتا ہے کہ حضور کی ناخوشی صرف اُس دن کا روزہ نہ توڑنے پر نہیں ہے، کیوں کہ عصر کا وقت تو ہو ہی گیا تھا، ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بات تھی، اسی خیال سے اگر کسی نے روزہ نہیں توڑا تھا تو حضور اُس پر کیوں خفا ہوتے! خفگی کی بات یہی تھی کہ یہ حضرات اس کے بعد بھی روزہ رکھتے رہے، حدیث کے الفاظ فقیل لہ بعد ذالك (ذالك اشارۂ بعید کے لئے آتا ہے) سے ہماری اور دوسرے مترجمین کی رائے کی تائید نکلتی ہے کہ وہ لوگ آخر تک عاصی رہے، بہرحال کتاب عوام اور خواص دونوں کے لئے مفید ہے

مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

اسلام اور عصرِ حاضر: از مولانا محمد شہاب الدین ندوی، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۹۴ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد -/۶

پتہ:- فرقانیہ اکیڈمی، چک بانا ورا، بنگلور نار تھ۔

لائق مصنف اسلامیات کے معروف مصنف اور مقالہ نگار ہیں، ہمارے زمانہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز اور غیر معمولی ترقی نے اہلِ مذاہب کے دل و دماغ میں جو مرعوبیت اور اُس کی وجہ سے مذہب کے بعض مسلمات اور اُس کی تعلیمات سے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا کر دیئے ہیں اُن کو دفع کرنا اور سائنس کے ہی مسلمات کی روشنی میں اسلامی حقائق کو ثابت کرنا موصوف کی تصنیف و تالیف کا خاص مشن ہے، اس سلسلے میں وہ متعدد کتابیں شایع کر چکے ہیں جو اسلامی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں، زیرِ تبصرہ کتاب جو اٹھارہ مقالات کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر و بیشتر صدق میں شائع ہوئے ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، یہ مقالات ترتیب کے اعتبار سے تین ابواب پر تقسیم ہیں، پہلے باب کا عنوان ہے "قرآن اور سائنس" دوسرے کا "قرآن اور خلائیات" اور تیسرے کا "انسانیت کی تشکیلِ جدید" تینوں عنوانات نہایت بھاری بھرکم اور وسیع تر علم و تحقیق کے متقاضی ہیں، تاہم اس کتاب میں بھی جو کچھ ہے، دلچسپ، مؤثر اور بصیرت افروز ہے، اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

گزارش

خریداری بُرہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط وکتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر بُرہان کی چِٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں - تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت سخت دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اور بعض حضرات تو صرف دستخط ہی کو کافی خیال کرتے ہیں۔

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برہان

جلد نمبر ۷۷	بابت ماہ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۶ء	شمارہ نمبر ۴

فہرست مضامین

نظرات

ابھی پاکستان ریڈیو سے یہ خبر وحشت اثر معلوم کر کے سخت صدمہ اور رنج ہوا کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا قلب کی حرکت کے بند ہو جانے سے انتقال پرملال ہو گیا، دار العلوم دیوبند کے جو حضرات اساتذہ راقم الحروف کے بھی اساتذہ تھے حضرت مفتی صاحب اُن کی آخری یادگار تھے اب وہ بھی نہیں رہے، اِنَّا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دیوبند میں دو خاندان علم و فضل اور دینی خدمات و فیوض کے اعتبار سے بہت نمایاں ہیں، ایک عثمانی اور دوسرا صدیقی، مفتی صاحب مرحوم اول الذکر خاندان کے گل سرسبد تھے مولانا محمد یٰسین صاحب جو دار العلوم دیوبند میں درجۂ فارسی کے صدر المدرسین اور نہایت باکمال استاذ تھے وہ آپ کے والد ماجد تھے، ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے، از اول تا آخر پوری تعلیم دار العلوم میں پائی، ۱۳۳۶ھ میں فراغت پائی، اس زمانہ میں دار العلوم کا آفتاب جہاں تاب نقطۂ عروج پر تھا اس بنا پر مفتی صاحب کو اکابر علماء و مشائخ دیوبند سے استفادہ کا بہترین موقع ملا، کہتے ہیں کہ چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے، لیکن جہاں علم و عمل کے چندہ چیدہ شمعہائے روشن مصروف انجمن آرائی ہوں تو اُن کی فیض رسانی کا عالم کیا ہوگا! ذہانت، ذوق علم و جستجو اور محنت و کاوش کا ملکہ خدا داد تھا اس لئے مفتی صاحب جب فارغ ہوئے تو دار العلوم کے قابلِ فخر فرزند تھے، فراغت کے بعد حضرت مولانا مفتی

زالرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی اور تربیت کے زیرِ سایہ دارالافتاء میں
بھی کام کیا اور درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی، یہاں تک کہ دونوں شعبوں میں
بڑا نام پیدا کیا، اور اب خود اکابرِ دیوبند میں اُن کا شمار ہونے لگا، اگرچہ تمام علوم و فنون متداولہ
میں پختہ اور ٹھوس استعداد کے مالک تھے، لیکن خاص فن فقہ تھا اور اس مناسبت سے
تفقّہ فی الدین اُن کا جوہرِ ذاتی تھا۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مقیم ہو گئے، یہاں اسلامی دستور مرتب
کرنے کے لئے جو سرکاری کمیٹی بنی تھی برسوں تک اُس کے رکن رہے، اسی درمیان میں عربی کا ایک
بڑا مدرسہ قایم کیا جس کے خود مہتمم تھے، پاکستان میں اُن کی حیثیت صدر مفتی کی تھی، تصنیف
و تالیف کا ذوق فطری تھا دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ "امداد الفتاویٰ" کے نام سے آٹھ جلدوں
میں مرتب اور مدون کئے جو دیوبند سے شایع ہو کر مقبول عوام و خواص ہو چکے ہیں،
"معارف القرآن" کے نام سے کئی جلدوں میں تفسیر لکھی، ختمِ نبوت، مسائلِ جدیدہ، اور
دولت کی تقسیم اور اوزانِ شرعیہ کے نام سے الگ الگ نہایت مفید اور بصیرت افروز
رسالے لکھے، البلاغ اُن کا اپنا ماہنامہ تھا اُس میں بھی وقتاً فوقتاً اُن کے قلم سے بہت
اچھے دینی اور اصلاحی مقالات نکلتے رہتے تھے، کئی سال سے صحت خراب ہو گئی تھی،
متعدد بار دل کا دورہ پڑا، ہسپتال میں داخل رہے اور اچھے ہو گئے، گذشتہ سفرِ پاکستان
کے موقع پر کم و بیش تیس برس کے بعد اُن کی قیام گاہ پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا
تو بے حد خوش ہوئے، دعائیں دیں اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے، لیکن اُن کے
چہرہ بشرہ سے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ اب اگر دل کا دورہ پھر ہوا تو جاں بر نہ ہو سکیں گے چنانچہ
یہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مقام نصیب فرمائے آمین ثم آمین۔

افسوس ہے مولانا محمد اویس صاحب نگرامی بھی ایک طویل علالت کے بعد
۲۷ اگست کی سہ پہر کو لکھنؤ میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر اس خاکدانِ عالم سے رخصت

ہو گئے، عمر ترسٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

نگرام لکھنؤ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے، مولانا یہاں کے ایک نامور علمی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے تعلیم ندوہ میں پائی، فراغت کے بعد دار المصنفین اعظم گڈھ چلے گئے، کم و بیش سات برس یہاں مقیم رہ کر سیرت النبی جلد اول پر نظر ثانی کی، حافظ ابن قیم نے اپنی تصنیفات میں جہاں کہیں کسی آیت سے متعلق تفسیری کلام کیا ہے اُن سب کو تفسیر ابن قیم کے نام سے یکجا مرتب کیا، علاوہ ازیں معارف میں بھی متعدد مقالات لکھے، یوں تو سب ہی علوم اسلامیہ میں پختہ استعداد رکھتے تھے لیکن قرآن مجید کا ذوق سب پر غالب تھا۔ چنانچہ یہ سب مقالات بھی قرآن مجید سے متعلق ہیں، دار المصنفین سے جب وہ ندوۃ العلماء میں منتقل ہوئے تو یہاں بھی اُن کا خصوصی مشغلہ درس قرآن ہی رہا۔ مدرسہ کے اندر اور اُس کے باہر بھی، ندوہ میں آنے کے بعد درس کی ہمہ گیر مصروفیتوں کے باعث وہ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کر سکے، تاہم جو کچھ لکھ گئے ہیں اُس کی افادیت میں کلام نہیں ہو سکتا۔

طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، خوش خلق، خوش پوشاک و خوش خوراک تھے، خندہ جبینی اُن کی فطرت تھی، عملاً نہایت صالح اور اوراد و وظائف تک کے پابند تھے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور اس سلسلہ میں اُن سے برابر مراسلت بھی رکھتے تھے اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔

پچھلے دنوں ڈاکٹر وحید مرزا کا بھی انتقال ہو گیا، عمر اسی کے لگ بھگ ہوگی مرحوم ایک عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ امیر خسرو پر اُن کی کتاب جو اُن کے پی۔ ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے اب تک اس موضوع پر ایک بہترین اسکالرانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور چلے گئے تھے اور اردو انسائیکلوپیڈیا اسکیم سے وابستہ ہو گئے اور وہیں وفات پائی، غفر اللہ لہٗ۔

مقصودِ تخلیقِ کائنات

(۶)

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

دس ہزار قدوسی | معاہدۂ حدیبیہ کو ابھی دو سال بھی نہ ہونے پائے تھے، کہ قریش نے معاہدہ شکنی کر کے مکہ کے نواح میں مسلمانوں کے حلیف قبیلہ خزاعہ پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دیا اور کچھ لوگوں کو قتل کر دیا۔ اور اُن کے اَموال لوٹ لئے، ان میں کچھ مسلمان نماز کی حالت میں شہید ہوئے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو آپ نے قریشِ مکہ کو لکھا کیا مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے یا وہ قاتلین (بنی بکر) کی حمایت سے الگ ہو جائیں یا پھر حدیبیہ کے صلح نامے کو منسوخ سمجھا جائے۔ مگر قریش نے کوئی صاف جواب نہ دیا۔ اس پر آں حضرت دس ہزار اصحاب کے ساتھ عازمِ مکہ ہو گئے، اہلِ مکہ کو آپ کی آمد کا اس وقت علم ہوا جب آپ مکہ کے قریب پہنچ گئے، قریش کو اس عظیم لشکر کا علم ہوا تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔ اُن کا تاریک ماضی اُن کی نگاہوں کے سامنے پھر گیا، انھوں نے تیرہ سال تک مکہ میں آں حضرت کی تکذیب و تضحیک کی تھی، توہین و استہزار کا گھناؤنا مظاہرہ کیا تھا۔ آپ کو طرح طرح کے دُکھ دئے تھے، حتیٰ کہ آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور آپ کو مدینہ میں پناہ لینا پڑی؛ پھر اُنھوں نے مسلمان کو وحشیانہ تکالیف کا ہدف بنایا تھا، ان میں سے بعض مسلمان قتل کئے گئے، ایک کثیر تعداد حبش کی طرف ہجرت پہ مجبور ہو گئی، اور بقیہ ماندہ اپنے گھربار، کاروبار اور وطن کو چھوڑ کر ایمان کی حفاظت کے لئے

مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے، پھر مدینے چلے جانے کے بعد بھی انھوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے بار بار حملے کئے اور اکثر مکر و فریب سے بلا کر بہتوں کو بے رحمی سے قتل کر ڈالا، اور یہی لوگ تھے، جنھوں نے اب معاہدہ کو پسِ پشت ڈال کر مسلمانوں کے حلیف قبیلہ کو حالتِ نماز میں قتل کر دیا۔ ان حالات میں قریش کا سردار ابوسفیان خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، اپنے اسلام کا اظہار کیا اور قوم کے لئے معافی کی درخواست کی، کیا کسی ضابطہ اخلاق و سیاست کی رُو سے یہ لوگ رحم کے مستحق تھے، کیا تاریخ عالم میں کسی فاتح نے ایسے مجرموں پر رحم کھایا اور معاف کیا تھا، تاریخِ انسانیت میں یہ شرف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ کہ اپنی طرف سے اور اپنے جاں نثار ساتھیوں کی طرف سے ان شقی القلب دشمنوں کو معاف کر دیا۔ اور حکم دے دیا کہ (۱) جو شخص حرمِ کعبہ میں داخل ہو (۲) یا اپنے گھر میں بیٹھ رہے (۳) یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے (۴) یا حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے (۵) یا زخمی ہو (۶) یا اسیر ہو (۷) یا بھاگ جائے (۸) یا ہتھیار پھینک دے ——— اسے قتل نہ کیا جائے۔

اس موقع پر اصحابِ رسول کی عظمت کا پھر اظہار ہوا، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے بھی، ان کے ذاتی دشمنوں اور ایذا رسانوں کو معاف کر دیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو یقین کامل تھا، کہ آپؐ کے اصحاب بھی آپؐ کی صفاتِ عفو و رحم سے متصف ہیں۔ اور ان کا جذبۂ اطاعت و عشقِ رسول اس قدر بڑھ چکا ہے، اور وہ اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو اس قدر اپنے محبوب آقا کی رضا میں فنا کر چکے ہیں کہ کسی کو آپؐ سے اختلاف کا خیال تک بھی نہیں آئے گا، چنانچہ دس ہزار فرشتہ سیرت اہلِ ایمان کا یہ لشکر شہر میں داخل ہو گیا لیکن اعلانِ نبوی کے مطابق کسی مخالف کی نکسیر تک نہ پھوٹی، اور ان کی زبانوں پر حمد و ثنا اور تکبیر و تسبیح کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی امتِ مسلمہ کی تعریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تھا جس کی تائید دیگر اسرائیلی انبیاءؑ نے بھی کی تھی حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے فرمایا :-

" خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں (Ten Thousand Saints) کے ساتھ آیا۔ اور اس کے دہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ان کے لئے تھی، وہ سب قوموں سے محبت رکھتا (رحمۃ للعالمین) ہے اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں۔ اور وہ تیرے قدموں میں بیٹھے ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہوگا" (توریت کتاب استثنار، باب ۳۳ : ۱-۲)

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ارشاد ہے :-

" میرا محبوب سرخ و سفید ہے، دس ہزار میں ممتاز ترین سردار (Chiefest) ہے (غزل الغزلات ۵ : ۱۰)

" (خلومحدیم) وہ تو ٹھیک محمد ہے، میرا خلیل میرا حبیب یہی ہے۔ اے دختران یروشلم" (ایضاً ۵ : ۱۶)

مکّہ میں کوہ فاران پر کھڑے ہو کر آں حضرتؐ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تھا اور اسی شہر میں آپ دس ہزار مقدس و مطہر صحابہ کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے، قرآن حکیم نے مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان قدوسیوں کے اخلاق عالیہ کا یہ اثر ہوا کہ تمام اہلِ مکّہ خدمتِ نبوی میں عاجزانہ حاضر ہوئے، اپنے قصوروں پر ندامت کا اظہار کیا، جس پر رحمت دو عالمؐ نے لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ أَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کا مژدہ سنایا کہ آج کے دن تم سے کوئی باز پرس نہیں تم سب آزاد ہو، اس رحمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مکّہ ایک ہی دن میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ اور جو لوگ جان بچانے کے لئے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، واپس آکر مسلمان ہوگئے، کیوں کہ اب ان پر بتوں کی بے بسی اور بے چارگی، اللہ تعالیٰ کی قدرت و وحدانیت اور اسلام کی بلند تعلیم کی صداقت عیاں ہو چکی تھی۔

ان قدسی صفات اصحابِ نبی کے ایمانی خلوص اور رضائے الٰہی سے عشق کا ایک اور عجیب واقعہ قابلِ ذکر و توجہ ہے، ان میں سے مہاجرینِ مکہ کے مکانات مکہ میں موجود تھے، جن پر دوسرے مخالفین نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ بعض کے کاروبار ہتھیانے والے بھی موجود تھے، اور اگر یہ لوگ اشارہ بھی کرتے تو اخلاقی طور پر وہ اپنی املاک واپس لینے کے حقدار تھے، اور ممکن ہے کہ بعض غاصبوں نے واپس کر دینے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا ہو لیکن آں حضرتؐ کو مطلوب تھا کہ آپؐ کے جاں نثاروں کے ایمان میں دنیا طلبی کا ذرہ بھر بھی شائبہ باقی نہ رہے، اس لئے آپؐ نے استفسار پر فرمایا کہ مہاجرین جو مکان یا املاک ایک بار راہِ خدا میں قربان کر چکے ہیں، انھیں واپس نہ لیں، اور نہ ہی جس وطن کو وہ ترک کر چکے ہیں، دوبارہ اسے اپنا وطن بنائیں، چنانچہ اپنے آقا کا اشارہ پاتے ہی کسی نے بھی اپنی اشیاء کا خیال تک نہ کیا، اور جب آں حضرتؐ مدینہ کو لوٹے اور تمام اہلِ ایمان ساتھ ہی چلے آئے۔ اور پھر مرتے دم تک دیارِ حبیب اور شہرِ ہجرت سے نکلنے کا نام تک نہ لیا۔

ایک مزید آخری اور عظیم قربانی

عرب کے اکثر علاقوں بالخصوص حجاز میں مسلمانوں کی مخالفت دم توڑ چکی تھی، ملک کے گوشے گوشے سے مختلف قبائل کے وفود مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر رہے تھے یا آں حضرتؐ کی اطاعت اختیار کر رہے تھے، جنگ کی آگ کے شعلے دب چکے تھے اور اب آں حضرتؐ ملک میں امن و انصاف کے استحکام میں مصروف ہو گئے تھے اور آٹھ سالہ طوفانی و خونی آویزش کے بعد سکون و اتحاد کی فضا پیدا ہوئی تھی، کہ ایک قافلہ کے ذریعہ مدینہ اطلاع ملی کہ رومی شہنشاہ کی سرکردگی میں شمال کی طرف عرب قبائل مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں، یہ نیا خطرہ پہلے خطرات کے مقابلے میں زیادہ تشویشناک تھا، یہ خطرہ ایک ایسی سلطنت کی طرف سے تھا، جو چند سال پہلے ایران کی مجوسی شہنشاہیت کو شکست دے چکی تھی، اور متواتر جنگوں کے بعد چند ہزار مسلمانوں میں اتنی بڑی طاقت کے مقابلے کی بظاہر سکت نہ تھی، لیکن انھیں اپنی طاقت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر اعتماد و بھروسہ ضرور تھا، پھر ان

کے سامنے فتح و کامرانی کی وہ بشارات بھی تھیں جو نئے نئے علاقوں کی فتوحات اور غلبۂ دین کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے انھیں دے رکھی تھیں، بالخصوص غزوۂ خندق اور صلح حدیبیہ کے وقت، جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی چابیاں دی گئیں اور میری اُمت اُن علاقوں کو ضرور فتح کرے گی جہاں اُن کے قدم ہنوز نہیں گئے۔

اس نئے خطرے کی سنگینی کو بھانپ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ دشمنانِ دین کو حجاز بلکہ عرب کی حدود سے باہر روک لیا جائے۔ تاکہ جنگ کی آگ مسلمانوں کی بستیوں تک نہ پہنچنے پائے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے اُمتِ مسلمہ سے جان اور مال کا مطالبہ کیا، یہ مطالبہ عام انسانوں کے لئے کئی جہات سے ایمان آزما تھا۔ گرمی کا موسم تھا، اور وہ بھی عرب کی شدید گرمی، سفر دور دراز تھا۔ پھر غذا اور پانی کی قلت اس پر مستزاد تھی۔ دوسری طرف فصل تیار کھڑی تھی، اور اس سے لطف اندوز ہونے کا وقت بھی آپہنچا تھا نیز ایک انتہائی طاقتور دشمن کا سامنا تھا۔ یہ حالات مومن صادق اور منافق میں امتیاز کرنے کی کسوٹی تھے۔

منافقین کا فرار منافقین کو جنگِ خیبر میں شرکت سے روک دیا گیا تھا، کیوں کہ انھوں نے موت کے خوف سے سفرِ حج میں نبی اکرمؐ کا ساتھ دینے سے گریز کیا تھا۔ لیکن اُنھیں ایک اور موقع دینے کا الفاظ ذیل میں وعدہ دیا گیا تھا:۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (الفتح: ۱۶)	"پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں سے کہہ دیجئے کہ تم عنقریب ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے، ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اطاعت قبول کرلیں، پس اگر تم اطاعت کروگے تو اللہ تمھیں اچھا بدلہ دے گا، اور اگر تم پھر جاؤ گے جس طرح تم

پھر گئے تھے تو وہ تمھیں دردناک عذاب

میں مبتلا کرے گا"

چنانچہ رومی لشکر کے خلاف لشکرکشی نے وہ موقع مہیا کردیا، لیکن اس گروہ نے یہ آخری موقع بھی کھودیا۔ کیوں کہ انھیں تو قربانی کے بغیر دولت مطلوب تھی بھلا جان و مال کو کیسے خطرے میں ڈالتے۔ اور یہ امتیاز ہو کر رہنا تھا تاکہ ہمیشہ کے لئے منافقین مومنوں سے الگ ہوجائیں، اور اس کے بعد جہاد اور غلبۂ اسلام کے لئے خالص مومن رہ جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے ان سے جہاد کی توفیق ہی چھین لی، اور انھوں نے مختلف حیلوں سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر جہاد میں شرکت نہ کرنے کے مختلف بہانے کئے۔

"آپ سے جہاد سے رخصت کی اجازت وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑ گئے، اور وہ اپنے شک میں متردد ہیں۔ اور اگر ان کا نکلنے کا ارادہ ہوتا تو اس کے لئے سامان مہیا کرتے لیکن اللہ نے ان کا جہاد کے لئے اٹھنا پسند نہ کیا، سو ان کو بوجھل کردیا اور کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ (التوبہ: ۴۵-۴۶)

دراصل اسلامی معاشرے اور بالخصوص فوج میں منافقین کا وجود نہ پہلے کارآمد تھا اور نہ ہی اب ہوتا۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا

"اگر یہ منافق تم میں شامل ہوکر نکلتے تو تم میں سوائے فساد کے اور کچھ زیادہ نہ کرتے اور تمھارے درمیان تمھارے لئے فتنہ اندازی کی خاطر چغلیاں کرتے پھرتے اور تم میں ان کے جاسوس بھی ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے، یقیناً انھوں نے پہلے بھی فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے خلاف تدبیریں کرتے رہے، یہاں تک کہ حق آگیا اور ان کی ناگواری کے باوجود اللہ کا حکم غالب رہا" (التوبہ: ۴۸)

ان حالات میں اُمت کو منافقین سے پاک کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا، پس آں حضرتؐ کو ارشاد

الہی ہوا :-

فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ إِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (التوبہ : ۸۳-۸۴)

"پس اگر اللہ تجھے ان میں کسی گروہ کی طرف لوٹا کر لائے اور وہ نکلنے کی تجھ سے اجازت مانگیں تو کہہ دے کہ میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے، تم پہلی مرتبہ بھی بیٹھنے پر رضامند ہو گئے سو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو، اور تو ان میں سے کسی پر جو مر جائے نماز جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، کیونکہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ مر گئے اس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے۔"

پس جب نبی اکرم صلعم اس غزوۂ تبوک سے بہ خیر و عافیت لوٹے تو آپ نے منافقوں کا نام لے لے کر انھیں کھڑا کیا اور مسجد سے نکلوا دیا اور یہ فتنہ آپ نے اپنے زمانے میں کچل دیا۔

مومنین کی ایمانی عظمت | منافقین کے برعکس اس موقع پر مومنین نے مثالی ایثار کا نمونہ دکھایا، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں شہادت دی۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (التوبہ : ۴۴)

"جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں وہ تجھ سے اجازت نہیں مانگتے کہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کریں، اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔"

یہی وہ فدائیانِ اسلام اور عاشقانِ رسولِ خیر الانامؐ تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے جنت کے عوض جانیں اور اموال خرید لئے تھے، جیسا کہ اس موقع پر فرمایا :-

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (التوبہ: ۱۱۱)

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لئے ہیں۔ اس کے بدلہ میں کہ ان کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، سو وہ قتل کرتے ہیں۔ اور قتل ہوتے ہیں۔ یہ وعدہ اس کے ذمے سچا ہے، توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے سو تم اپنے سودے پر جو تم نے اس سے کیا ہے خوش ہو جاؤ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ خدا کی طرف رجوع کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے۔ رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے والے، اللہ کی حدوں کے محافظ۔ اور ان مومنوں کو خوش خبری دے۔"

ان اہلِ ایمان نے پہلے کبھی کسی بڑی سے بڑی قربانی سے گریز و دریغ نہ کیا تھا، تو اب کیوں کرتے تاہم موجودہ خطرہ بعض وجوہ سے مزید قربانی کا متقاضی تھا تیس ہزار مجاہدین پر مشتمل لشکر کی ضروریاتِ جہاد کی فراہمی نے ہی آں حضرت صلعم کو مالی ایثار کی ترغیب پر ابھارا تھا اور ہر اہلِ ایمان نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آں حضرتؐ کے ارشادِ مبارک پر سب کچھ قدموں میں لا ڈھیر کیا، گھر میں صرف اللہ اور رسولؐ کا نام چھوڑ آئے۔ اور اس میدان میں سب پر سبقت لے گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنا نصف مال پیش کر دیا۔ اور حضرت عثمان غنیؓ نے (۹۰۰) نو سو اونٹ (۱۰۰) ایک سو گھوڑے

اور ایک ہزار دینار حاضرِ خدمت کر دئے اور زبانِ مبارک نبویؐ سے مجہز جیش العسرۃ (تنگ حال لشکر کا سامان مہیا کرنے والا) کا خطاب پایا، اسی طرح ہر صحابی نے خلوص نیاضی اور فراخدلی سے کام لیا، اور اپنی فداکاری کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، دنیا بھر میں یہ عجیب ترین لشکر ہے کہ اپنے پاس سے دولت بھی دیتا ہے۔ اسلحہ بھی بہم پہنچاتا ہے، اور پھر جان کا ہدیہ بھی پیش کر دیتا ہے۔ اور بال بچوں اور مال و دولت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جب تک دُنیا قایم ہے، سپہرِ حق و صداقت کے یہ ستارے اپنے اطوار سے انسانیت کی بزم کو تابندگی بخشتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ کے رسول پاکؐ نے ان کے متعلق کیا ہی خوب فرمایا اَصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ کسی ایک کی پیروی کروگے تو ہدایت پاؤ گے۔"

اس ایمان کا یہ برگزیدہ اور منتخب روزگار لشکر سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے شمال میں تبوک کے مقام پر پہنچا، دشمن مقابل نہ آیا، اردگرد کے رؤسا کو حلیف بنایا اور مطمئن مدینہ لوٹا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نوازش نے ساتھ دیا، مسلمانوں کی قوتِ ایمانی میں اضافہ ہوا، اور آیندہ کے لئے رومی سلطنت کے مقابل حوصلے بلند ہوتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ : ۱۱۷)	"اللہ اپنے نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر مہربان ہوا جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں اس کا ساتھ دیا بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کجی آنے لگی تھی، پھر ان پر مہربان ہوا، وہ ان پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ کی رحمت میں نبیؐ اور آپؐ کے متبع مہاجر و انصار سب برابر کے شریک ہیں اور مہاجرین و انصار کی خوبی یہ بیان کی ہے، کہ انھوں نے عُسرت اور تنگی کے وقت

جان ومال کے ساتھ اپنے محبوب نبیؐ کا ساتھ دیا۔ پس اللہ کی رحمت کی ان پر بارش ہوئی اور اللہ تو ہمیشہ ہی ان پر رؤف ورحیم ہے، اسی سورۃ کے اختتام پر آں حضرت صلعم کے متعلق فرمایا، وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ -کہ آپ مومنوں پر رؤف ورحیم ہیں پس اُمّتِ مسلمہ —— مہاجرین وانصار کے گروہ —— کا درجہ کتنا بلند ہے کہ خدا اور اُس کا رسولؐ ہر دو ان پر مہربان ورحیم ہیں،

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے بالخصوص اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ یعنی اولین مہاجرین وانصار میں سے سبقت لے جانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے، ان کے مقامِ عظمت کا الفاظ ذیل میں ذکر کیا ہے :-

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (توبہ: ۱۰۰)

"اور پہلے سبقت لے جانے والے مہاجرین اور انصار سے، اور وہ جنھوں نے نیکی میں ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اور اس نے ان کے لئے باغات تیار کئے۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ انہی میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے۔"

یہ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ وہی تھے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی زمانۂ نبوت میں ایمان لائے تھے، جب کہ ہر طرف خطرات ہی خطرات تھے، اور جان، مال، عزت، بال بچوں اور گھر بار کی بربادی کے مقابل محض جنت اور رضائے الٰہی کا وعدہ تھا، لیکن ہجرت کے بعد ان مہاجرین وانصار کو مزید قربانیاں دیتے ہوئے دس سال ہونے کو آئے تھے، اور اس عرصہ میں انھوں نے عنایاتِ الٰہی کے بے شمار تمغے حاصل کئے تھے ان کے دشمن مغلوب ہو چکے تھے، حسناتِ دُنیا و دین کے دروازے ان پر کھل چلے تھے اور ان کے اتباع کو سعادتِ دارین کا وسیلہ ٹھہرایا جا چکا تھا، اور آیندہ نسلوں کو تاکید کی جا چکی تھی، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان اصحابِ رسولؐ پر صلوٰۃ

بھیجتے ہیں۔ تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ تم ان جاں نثارانِ اسلام کی کامل پیروی کرو، ان کے لئے مغفرت مانگتے رہو کیوں کہ ان کے اتباع سے منہ موڑنے والا جہنمی ہوگا، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء: ۱۱۵)

اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ اس کے لئے ہدایت واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا دوسرے راستے کی پیروی کرے، ہم اسے پھیر دیں گے جدھر وہ پھرتا ہے۔ اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

دوسرے لفظوں میں "سبیل المؤمنین" یعنی اصحابِ رسولؐ کی راہ سے ہٹنے والا گمراہ اور جہنمی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں سے بڑھ کر مومن کوئی نہیں ہو سکتا، جن کو خود اللہ تعالیٰ نے مومن کہا ہو اور وہ یہی مہاجرین و انصار تھے ...... أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر اصحابِ رسولؐ اور ان کے بعد آنے والے تمام پیروکاروں کو بشارت ملی کہ جب تم نے رضائے الٰہی کو ہر شے پر مقدم کر رکھا ہے، تو آگاہ رہو، کہ اللہ بھی تم سے راضی ہو گیا۔ تمہارے لئے جنت تیار کر دی گئی ہے۔ جس میں ہمیشہ رہو گے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ان سب کی تعداد غزوۂ تبوک کے وقت تیس ہزار سے کچھ زیادہ ہو چکی تھی، ان میں السابقون الاوّلون کے علاوہ وہ لوگ بھی تھے جو ہجرت کے بعد جہاد میں شریک ہوتے اور وہ بھی تھے جو فتح مکہ کے وقت یا فتح کے بعد ایمان لائے۔ جن میں قریشِ مکہ نمایاں مقام رکھتے تھے۔

غزوۂ تبوک کے وقت پیچھے رہ جانے والے مومن | آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اصحاب حُسنِ نیت، اخلاقِ عالیہ، محبت و اطاعتِ رسولؐ کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض نے دو مواقع پر غفلت و تساہل سے کام لیا اور مُعًابعد اس پر ندامت کا اظہار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی خطاؤں پر قلمِ عفو پھیر دیا۔ ان واقعات کا ذکر قرآنِ حکیم میں کیا ہے۔ اور اس طرح اصحابِ رسول اور آنے والے اہلِ ایمان کو درسِ عبرت و اصلا

دیا کہ عشق و محبت میں تساہل بھی روا نہیں۔

پہلا واقعہ جنگِ اُحد کا ہے۔ قریش کی پسپائی کے بعد چند مسلمانوں نے وہ مورچہ چھوڑ دیا جہاں انھیں آں حضرتؐ نے متعین کیا تھا، یہ محض فیصلے کی غلطی تھی، جس سے مسلمان لشکر کو شدید نقصان پہنچا، اس کے بعد مسلمانوں نے پھر صفوں کو درست کرکے دشمن کو بھاگنے پر مجبور کردیا اور خود بارگاہِ الٰہی میں طالبِ مغفرت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر ان کے اعمال سے بڑھ کر ان کے قلوب اور نیتوں پر تھی، اور چونکہ ادھر توخلوص اور نیک نیتی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے انھیں وَلَقَدْ عَفَا اللّٰہُ عَنْھُمْ کی بشارت سے نوازا گیا۔

اسی طرح ایک دوسری بلا ارادہ کوتاہی، غفلت اور لغزش کا واقعہ تین مخلص اصحابِ رسولؐ کو غزوۂ تبوک کے وقت پیش آیا۔ یہ حضرات کعب بن مالک، ہلال بن اُمیہ اور مرارہ بن ربیع (رضی اللہ عنہم) تھے یہ دورِ اول میں ایمان لائے تھے، اس سے قبل ہر جہاد میں حصہ لیا تھا، اُمت میں ان کا بلند مقام تھا، پھر غزوۂ تبوک کے موقع پر انھوں نے حسبِ توفیق مالی اعانت بھی کی تھی، جہاد میں شرکت کے لئے سب سامان تیار کر رکھا تھا۔ لیکن جب لشکر روانہ ہوا تو یہ تینوں اصحاب کسی مصروفیت کی وجہ سے اس دن شریکِ سفر نہ ہو سکے، سوچا کہ اگلے روز جا ملیں گے، اسی طرح چند دن ٹل گئے فاصلہ زیادہ ہوگیا، تو پھر ندامت کے مارے رُک گئے۔ کہ اب لشکر سے ملنا محال ہے۔ حتیٰ کہ پچاس دن بعد آں حضرتؐ اس مہم سے فارغ ہوکر لوٹ آئے۔ واپسی پر آں حضرتؐ نے پیچھے رہ جانے والوں سے شرکت نہ کرنے کی وجہ دریافت کی، منافقین تو جھوٹے عذر سُنا کر چھوٹ گئے۔ لیکن ان تین مخلص اصحاب نے سچ سچ بتا دیا کہ ان کے پاس عدم شرکت کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ آں حضرتؐ نے انھیں حکمِ الٰہی کا انتظار کرنے کو کہا، کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں کو ان سے بول چال کو منع کر دیا، پھر ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ کردیا۔ یہ بہت بڑی آزمائش تھی، انھی دنوں غسّان کے عیسائی حاکم نے حضرت کعب بن مالک کو لکھ بھیجا کہ " تمھارے آقا نے تمھاری قدر نہیں کی۔ ہمارے پاس

آجاؤ۔ ہم تمھاری کما حقہٗ قدر و منزلت کریں گے" حضرت کعب اس آزمائش میں ثابت قدم نکلے، رقعہ آگ میں ڈال دیا، اور قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ "مجھے اپنے آقا کی ناراضگی تمھاری نوازش سے بدرجہا عزیز تر ہے۔" دن گذرتے گئے، حتیٰ کہ پچاس دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ان تینوں مخلصوں کی توبہ قبول فرمائی اور دیگر مہاجرین و انصار کے ساتھ ان کا بالفاظ ذیل ذکر فرمایا

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (التوبہ، ۱۱۷۔۱۱۸)

"اللہ اپنے نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر مہربان ہوا، جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں اس کی اتباع کی بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کجی آنے لگی تھی، پھر ان پر مہربان ہوا اور ان تینوں پر بھی جو پیچھے رکھے گئے تھے۔ یہاں تک کہ زمین باوجود اپنی فراخی کے اُن پر تنگ ہو گئی۔ اور وہ اپنی جانوں سے تنگ آ گئے، اور یقین کر لیا کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ تب وہ ان پر مہربان ہوا، تاکہ وہ رجوع کریں۔ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

تمام اہلِ ایمان میں سے تیس ہزار تو گرمی اور سفر کی مشکلات سے بے نیاز ہو کر اپنے آقا کا ساتھ دیتے ہیں، اور صرف تین افراد پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور وہ بھی جان بوجھ کر نہیں اور اس غفلت اور کوتاہی پر اس قدر ندامت کا اظہار کرتے ہیں کہ دوسرے اہلِ ایمان کے ساتھ تینوں بھی رحمتِ خداوندی کی خوشخبری پاتے ہیں، گویا کہ آں حضرتؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری جہاد میں نئے اور پرانے تمام اہلِ ایمان، ایثار، خلوص کا ایسا عظیم مظاہرہ کرتے ہیں جس کی نظیر کہیں اور تلاش کرنا عبث ہے۔ پھر ان لوگوں میں کثرت ان لوگوں کی ہے جو دو سال پہلے تک اسلام

کے دشمن تھے، اور فتح مکہ کے بعد ایمان لائے۔ لیکن انھوں نے اپنی اس قلیل مدت میں اسلام کی خاطر خلوص و ایثار کا ایسا عظیم مظاہرہ کیا کہ رسول اللہ اور سابقون الاولون کے ساتھ رحمت الٰہی میں حصہ دار ہو گئے۔ اور وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی کے مصداق بن گئے۔ اور ذاتِ الٰہی جس پر چاہے فضل و رحمت کے دروازے کھول دے۔

غم کے آنسو قرآنِ حکیم نے امتِ مسلمہ کے ایک اور گروہِ مخلصین کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ یہ وہ اہلِ ایمان تھے، جو خلوصِ نیت، جذبۂ جہاد اور ایثار میں کسی سے کم نہ تھے، اور اس کا مظاہرہ اس سے قبل بارہا کر چکے تھے، لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اس مہم میں شرکت نہ کر سکے، ان فدایانِ اسلام کی قلبی تڑپ کی کیفیت وحیِ الٰہی کے الفاظ میں پڑھئے :-

لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی وَلَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ؕ مَا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ مِنْ سَبِیْلٍ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ، وَّلَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَآ اَتَوْکَ لِتَحْمِلَہُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُکُمْ عَلَیْہِ تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُہُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوْا مَا یُنْفِقُوْنَ

(التوبہ: ۹۱ - ۹۲)

"نہ کمزوروں پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے اخلاص رکھیں، نیکی کرنے والوں پر الزام کی کوئی راہ نہیں، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور نہ ان پر الزام ہے کہ جب وہ تیرے پاس آئے کہ تو انھیں سواری دے تو تو نے کہا مجھے کچھ نہیں ملتا جس پر تمھیں سوار کروں تو وہ واپس چلے گئے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اس غم سے کہ وہ مال نہیں پاتے جسے وہ خرچ کریں"

باقی

غَزَالی یا غَزّالی

(محمد عُزیر بہاری۔ مرکزی دار العلوم۔ ریوڑی تالاب بنارس)

امام ابوحامد محمد بن محمد الغزالی (۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء — ۵۰۵ھ / ۱۱۱۱ء) کی سیرت سے متعلق یہ پہلو بڑا دل چسپ اور عجیب ہے کہ اب تک ان کی نسبت "غزالی" کے تلفظ کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف چلا آیا ہے، کچھ اس کی "زاء" کو مشدد قرار دیتے ہیں اور کچھ اس کی تخفیف کے قائل ہیں۔ ذیل میں ہم پہلے تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے مستند علماء و مورخین کی تصریحات پیش کریں گے پھر ان کی روشنی میں کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) سَمعانی یا ابن السمعانی[۱] (م ۵۶۲ھ): ابنِ خلّکان (م ۶۸۱ھ) ان کی کتاب "الانساب" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ان الزاء مخففة۔ نِسبَۃٌ اِلی غَزَالَۃ،	غَزالی میں "زاء" مخفف ہے، اس کی نسبت
وھی قریۃ من قری طوس[۲]۔	غَزالہ کی طرف ہے جو طوس کا ایک گاؤں ہے

مگر یہ عبارت ہمیں "الانساب" مطبوعہ لیڈن ۱۹۱۲ء میں نہیں ملتی[۳]۔ بلکہ اس میں تو

---

[۱] دونوں ہی طرح ان کی نسبت معروف ہے۔ جیسے باقِلّانی اور ابن الباقِلّانی (م ۴۰۳ھ)، شخصیت ایک ہی ہے۔
[۲] وفیات الاعیان ۱/ ۸۱-۸۲ (طبع مصر ۱۹۴۸ء)
[۳] "الانساب" مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۳ء میرے پیش نظر نہیں، ممکن ہے اس سے حقیقت حال کا پتہ چل جائے

سہو سے اس نسبت "غزالی" کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ضمناً کسی مقام پر اس کی طرف اشارہ کر جانا بھی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ امام موصوف کی شخصیت ان حضرات سے کسی طرح کم اہمیت کی مستحق نہیں جن کا مستقل تذکرہ کتاب میں موجود ہے، ایسا لگتا ہے کہ مطبوعہ نسخہ سے "غزالی" کی نسبت ساقط ہوگئی ہے[1]۔ یا ممکن ہے سمعانی نے "الانساب" کے بجائے اپنی کتاب "ذیل علی تاریخ بغداد" میں اس پر بحث کی ہو، کیوں کہ اس میں امام موصوف کی سوانح شامل ہے جیسا کہ ابن تغری بردی (م ۸۷۴ھ) کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے[2] — یہ امکان اس بنا پر پیدا ہوگیا ہے کہ مذکورہ بالا عبارت کے بعد "وفیات الاعیان" کے صرف ایک ہی مخطوطہ نسخہ میں (جو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے) یہ الفاظ ہیں (اور وہ بھی حاشیہ پر)

"لکن ھذا قالہ السمعانی فی کتاب الانساب، واللّٰہ اعلم"[3]

لیکن سمعانی نے کتاب الانساب میں یہی لکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ محشی نے شاید غلطی سے اپنے حافظہ کی بنیاد پر "ذیل" کے بجائے "الانساب" کا حوالہ دے دیا ہے۔

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، سمعانی نے کسی نہ کسی کتاب کے اندر ضرور اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اس لئے ان کی طرف اس قول کا انتساب صحیح سمجھنا چاہیئے، دوسرے مؤرخین مثلاً سبکی (م ۷۷۱ھ) وغیرہ نے بھی امام غزالی اور ان کے بھائی شیخ ابوالفتوح احمد بن محمد غزالی (م ۵۲۰ھ) کے تذکرے میں سمعانی کا حوالہ دیا ہے۔

پس سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) کی یہ تحریر درروایت قابل اعتماد نہیں:

وانشاء لذلک ابن السمعانی ایضا

ابن السمعانی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے

---

[1] مشہور محقق علامہ احمد تیمور پاشا (م ۱۹۳۰ء) نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔ دیکھئے: ضبط الاعلام ص ۹۱ (طبع قاہرہ ۱۹۴۷ء)

[2] ملاحظہ ہو: النجوم الزاہرۃ ۵/ ۲۵۰ (طبع یورپ)

[3] اس بات کا انکشاف "وفیات الاعیان لابن خلکان" کے انگریزی ترجمہ (Vol. I, PP. 80) میں ڈی سلین نے کیا ہے۔

وانکر التخفیف، وقال: سألت اهل طوس عن هذہ القریة فانکروها۔[1]

(کہ غزالی جیسے الفاظ میں "یا" کی زیادتی خوارزم اور جرجان والوں کی عام عادت ہے)۔ انھوں نے تخفیف "زا" کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جب طوس والوں سے اس گاؤں (غزالہ) کی نسبت دریافت کیا تو انھوں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی۔

کیوں کہ انھوں نے اس کے لیے کسی مستند مأخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے، ان سے پہلے کسی دوسرے مؤرخ نے بھی یہ قول سمعانی کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔ لہٰذا یہ قابلِ قبول نہیں۔ میکڈونلڈ (D. B. Machdonald) نے بھی بلا بنیاد لکھا ہے کہ سمعانی نے تشدید کو درست قرار دیا ہے۔[2] اس لیے ہمیں اس کی صحت سے بھی انکار ہے۔ مزید بحث اس وقت ہم فضول سمجھتے ہیں:

(۲) ابن الاثیر (م ۶۳۰ھ): موصوف فرماتے ہیں:

ھو منسوب إلی الغزّال بائع الغزل او الغزالی علی عادة أھل خوارزم و جرجان۔[3]

"غزالی" غزّال کی طرف منسوب ہے جس کے معنی ریسماں فروش کے ہیں۔ یا غزالی خوارزم اور جرجان والوں کی عادت کے مطابق ہے

اور تخفیف والے قول کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[1] اتحاف السادة المتقین لشرح اسرار احیاء علوم الدین ۱/۱۸ (مطبعہ میمنہ قاہرہ ۱۳۱۱ھ)

[2] دیکھیے: Encyclopaedia of Islam Vol. 2, PP. 146 (طبع ۱۹۲۷ء)

[3] اللباب فی تہذیب الانساب ۲/۱۷۰ (طبع قاہرہ ۱۳۵۷ھ) ابن الاثیر کا یہ قول "تاج العروس من جواہر القاموس" (مطبعہ خیریہ قاہرہ ۱۳۰۶ھ) ۸/۴۴ مادہ "غ ۔ ز ۔ ل" میں بھی موجود ہے۔ نووی نے بھی "دقائق الروضہ" مسمی بہ "الاشارات" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے: طاش کبری زادہ (م ۹۶۲ھ) کی "مفتاح السعادة ومصباح السیادة" ۲/۲۴۴ (طبع دار الکتب الحدیثیة قاہرہ)؛ "تحفة الارشاد" میں بھی "دقائق الروضہ" کے حوالے سے اس قول کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو: اتحاف السادة المتقین ۱/۱۸

والتخفیف خلاف المشہور[1] — غزالی تخفیف زا، مشہور قول کے خلاف ہے

(۳) نووی (م ۶۷۶ھ) | انھوں نے اپنی چار کتابوں میں اس پر بحث کی ہے: "التبیان" شرح صحیح مسلم مسمیٰ بہ "المنہاج"، دقائق الروضۃ مسمیٰ بہ "الاشارات" اور "الارب" — سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی لکھتے ہیں:

وغزالۃ کسحابۃ قریۃ من قری طوس، قیل: والیھا ینسب ابوحامد کما صرح بہ النووی فی التبیان۔[2]

غزالہ بروزن سحابہ طوس کا ایک گاؤں ہے، کہتے ہیں کہ امام ابوحامد (غزالی) اسی کی طرف منسوب ہیں جیسا کہ امام نووی نے تبیان میں تصریح کی ہے۔

"المغنی"، لمحمد بن طاہر الفتنی (م ۹۸۶ھ) کے محشی نے لکھا ہے:

کما مشی علیہ الامام النووی فی شرحہ لصحیح مسلم، قال والتشدید فیہ من لحون العامۃ، فاعرف ذلک[3]

امام نووی تخفیف زا کے قائل ہیں۔ چنانچہ شرح صحیح مسلم میں ایک مقام پر لکھتے ہیں: مشدد پڑھنا عوام کا لحن ہے۔

دقائق الروضۃ کی عبارت اس طرح ہے:

التشدید فی الغزّالی ھو المعروف الذی ذکرہ ابن الاثیر، وبلغنا أنہ منسوب الی غزالۃ بتخفیف الزای قریۃ من قری طوس[4]۔

غزالی بالتشدید ہی مشہور ہے جیسا کہ ابن الاثیر نے ذکر کیا ہے۔ مگر ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ وہ غزالہ تخفیف زا، کی طرف منسوب ہیں، جو طوس کا ایک گاؤں ہے۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) نووی کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] حوالہ مذکور جو گذشتہ صفحہ کے حوالہ نمبر ۳ پر ہے۔
[2] تاج العروس ۸/۴۴ ۔ اتحاف السادۃ المتقین ۱/۱۸ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔
[3] المغنی ص ۶۰ (طبع لاہور ۱۹۷۳ء)
[4] دیکھئے: اتحاف . . . ۱/۱۸ بحوالہ "تحفۃ الارشاد"؛ مفتاح السعادۃ ۲/۲۴۴

ویروی عنہ أنہ أنکرھا، وقال: انما انا الغزالی بخفۃ الزای نسبۃ الی غزالۃ قریۃ بطوس۔ (ن) فی الاعراب[1]

امام غزالی سے منقول ہے کہ انھوں نے تشدید کا انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں غزالی بہ تخفیف زاء ہوں منسوب بہ غزالہ جو طوس کا ایک گاؤں ہے۔

(۴) ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) امام غزالی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

وقد تقدم الکلام علی "الطوسی" "والغزالی" فی ترجمۃ أخیہ احمد[2]

لفظ طوسی اور غزالی کی تحقیق امام صاحب کے بھائی احمد کے تذکرے میں گذر چکی ہے۔

وہاں لکھا ہے:

والغزّالی — بفتح الغین المعجمۃ وتشدید الزاء المعجمۃ وبعد الالف لام — ھذہ النسبۃ الی الغزّال علی عادۃ اھل خوارزم وجرجان، فانھم ینسبون الی القصّار القصّاری، والی العطّار العطّاری۔[3]

غزّالی — غین معجمہ کے زبر اور زاء معجمہ کی تشدید کے ساتھ، پھر الف کے بعد لام — یہ نسبت ہے غزّال کی طرف اہل خوارزم وجرجان کے طریقے پر جو قصّار کو قصّاری اور عطّار کو عطّاری کہتے ہیں۔

پھر تخفیف کا قول سمعانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وھو خلاف المشہور"[4]

(۵) ابن دقیق العید (م ۷۰۲ھ) قطب الدین الحلبی (م ۷۷۹ھ) اپنی کتاب "تاریخ مصر" میں لکھتے ہیں:

---

[1] المغنی ص ۶۰۔ واضح رہے کہ (ن) سے مراد نووی ہیں، جیسا کہ شروع کتاب (ص ۲) میں تصریح کر دی گئی ہے
[2] وفیات الاعیان ۳۵۵/۲
[3] " " ۸۱/۱-۸۲
[4] حوالہٗ مذکور

سمعت شیخنا ابن دقیق العید یقول: روینا أنه الغزالی بالتخفیف نسبة الی غزالة قریة بطوس، قال: والصحیح التشدید نسبة الی الغزّال، والعجم تزید یاء النسب فی الحرفة۔[1]

میں نے اپنے استاد ابن دقیق العید سے سنا ہے وہ فرمارہے تھے کہ ہمیں غزالی بہ تخفیف کی روایت ملی ہے۔ یعنی منسوب بہ غزالہ جو طوس میں ایک گاؤں ہے۔ وہ کہتے ہیں: مگر تشدید ہی صحیح ہے یعنی غزّالی منسوب بہ غزّال۔ عجمی لوگ حرفت اور پیشہ والے اسماء میں یاء نسبتی کا اضافہ کردیتے ہیں۔

(۶) ابوالفداء (م ۷۳۲ھ) | یہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

والغزّالی نسبة الی الغزل، والعجم تقول فی القصار قصاری وفی الغزّال غزّالی وفی العطار عطّاری[2]

غزّالی غزل کی طرف منسوب ہے۔ عجمی لوگ قصّار کو قصّاری، غزّال کو غزّالی اور عطّار کو عطّاری کہتے ہیں۔

(۷) ذہبی (م ۷۴۸ھ) | موصوف تحریر فرماتے ہیں:

والغزّالی هو الغزّال، کذا العطّاری والخبّازی علی لغة أهل خراسان۔[3]

غزّالی دراصل غزّال ہے جیسے عطّاری اور خبّازی (کہ اصل میں عطّار اور خبّاز ہے) اہل خراسان کی زبان میں (یار کا اضافہ کردیا جاتا ہے)

(۸) صلاح الدین صفدی (م ۷۶۴ھ) | ان کا بیان ہے کہ:

---

[1] ملاحظہ ہو: بدرالدین زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی کتاب "المعتبر فی تخریج احادیث المنهاج والمختصر" (اس کا ایک قلمی نسخہ دارالکتب الظاہریہ دمشق میں زیر رقم ۱۱۱۵ [حدیث] موجود ہے، دوسرا مخطوطہ مکتبہ تیموریہ میں زیر رقم ۱۵۴ [حدیث] محفوظ ہے)۔ بعینہ یہی عبارت سیفری نے بھی اپنے "مجموع" میں نقل کی ہے۔ دیکھئے: ضبط الاعلام ص ۱۰۸-۱۰۹۔ [2] المختصر فی اخبار البشر ۲/۲۲۶ (مطبع حسینیہ مصر) [3] العبر فی خبر من غبر ۴/۱۰ (طبع کویت ۱۹۶۳ء)۔ ذہبی کا یہ قول "شذرات الذہب" ۴/۱۱ (مطبعة القدسی قاہرہ ۱۳۵۰ھ) میں بھی موجود ہے۔

قال الامام الغزالی فی بعض مصنفاته: قد نسبنی قوم إلی الغزّال، وإنما أنا الغزَالی بتخفیف الزای نسبة الی قریة من قری طوس یقال لها غزَالة۔[1]

امام غزالی نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے: لوگ مجھے غزّال کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ میں غزَالی تخفیف زاء منسوب بہ غزَالہ ہوں جو طوس کا ایک گاؤں ہے۔

(۹) یافعی (م ۷۶۸ھ) انھوں نے بھی ابنِ خلّکان ہی کی طرح ضبط کیا ہے، پھر ان کا قول بھی بلا کم وکاست "وفیات الاعیان" سے نقل کر دیا ہے۔[2]

(۱۰) فیّومی (م ۷۷۰ھ) اپنی مشہور و مستند کتاب "المصباح المنیر" میں لکھتے ہیں:

غزَالة قریة بطوس، والیها ینسب الامام ابو حامد، اخبرنی بذلك الشیخ مجد الدین بن محمد بن محی الدین بن أبی الطاهر شروان شاه بن أبی الفضائل فخر آور بن عبید الله ابن ست النساء بنت أبی حامد الغزالی ببغداد سنة عشر و سبعمائة، وقال: اخطأ الناس فی تثقیل جدنا وإنما هو مخفف۔[3]

غزَالہ طوس کا ایک گاؤں ہے، اسی کی طرف امام ابو حامد (غزالی) منسوب ہیں۔ مجھے اس کی اطلاع شیخ مجد الدین بن محمد بن محی الدین ابو الطاہر شروان شاہ بن ابی الفضائل فخر آور بن عبید اللہ بن ست النساء بنت ابی حامد غزالی نے ۷۱۰ھ میں بغداد میں دی۔ اور کہا کہ لوگوں نے ہمارے نانا (غزالی) کے نام کو غلطی سے مشدّد بنا دیا ہے، حالانکہ وہ مخفف ہے قریۂ غزَالہ کی طرف منسوب۔

---

[1] مفتاح السعادة ۲/۲۴۳
[2] دیکھئے: مرآة الجنان ۳/۱۸۹-۱۹۰ (طبع حیدرآباد ۱۳۳۸ھ)
[3] المصباح المنیر ص ۶۸۵ (طبع میری) اسی سے نقل کرتے ہوئے اتحاف السادة المتقین ۱/۱۸ میں

(۱۱) سیوطی (م ۹۱۱ھ) | انھوں نے ہر دو اقوال نقل کرنے کے بعد تخفیف والے قول کی تضعیف کی ہے[1]

(۱۲) محمد بن طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ) | غزالی کا تلفظ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

الغزّالی بمفتوحة وشدّة زای[2] — غزّالی میں زا مفتوح اور مشدد ہے۔

پھر نووی کا قول "الارب" سے نقل کیا ہے، جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

(۱۳) شہاب الدین خفاجی (م ۱۰۶۹ھ) لکھتے ہیں:

وھو بتشدید الزای المعجمة فی المشھور، واصله الغزّال بغیر نسبة، فزادوا فیه یاء النسبة تاکیدا کالعصّاری علی عادة اھل جرجان وخوارزم۔ وقیل: نسب لغزالة بنت کعب الاحبار جدته وقیل: نسب انه بتخفیف الزای نسبة لغزالة قریة من قری طوس کما ذکرہ النووی فی التبیان، وانکر ابن الاثیر تخفیفه[3]۔

غزالی مشہور قول کے مطابق بتشدید زاء معجمہ ہے، اصل میں یہ غزّال تھا بلا نسبت کے، پھر اس میں لوگوں نے بغرض تاکید یائے نسبتی بڑھا دی جرجان اور خوارزم والوں کا یہی طریقہ ہے جیسے عطّاری ..... دوسرا قول یہ ہے کہ غزالی غَزّالہ بنت کعب الاحبار (اپنی دادی) کی طرف منسوب ہیں۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ غَزَالی بتخفیف زاء کی نسبت غَزالہ کی طرف ہے جو طوس کا ایک گاؤں ہے۔ نووی نے تبیان میں اس کا ذکر کیا ہے، مگر ابن الاثیر تخفیف کے منکر ہیں۔

(۱۴) ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) | ان کا میلان تشدید کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے صرف ذہبی کا قول نقل کرنے پر اکتفار کیا ہے[4]

---

[1] لب اللباب فی تحریر الانساب ص ۱۸۶ (طبع لیڈن ۱۸۴۰ء) [2] المغنی ص ۶۰ (طبع لاہور ۱۹۷۳ء)
[3] نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض ۴/۴۹۴ (مطبعہ ازھریہ مصر ۱۳۲۷ھ)
[4] شذرات الذہب ۴/۱۱

(۱۵) مرتضیٰ زَبیدی بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) | انھوں نے اپنی دو کتابوں ("تاج العروس من جواہر القاموس" اور "اتحاف السادۃ المتقین لشرح احیاء علوم الدین") میں اس نسبت پر مختصر و مفصل بحث کی ہے۔ متعدد اقوال نقل کرنے کے بعد اخیر میں لکھتے ہیں:

والمعتمد الآن عند المتأخرین من ائمۃ التاریخ والانساب ان القول ما قال ابن الاثیر انہ بالتشدید[1]	اس وقت متاخرین ائمہ تاریخ وانساب کے نزدیک ابن الاثیر کا تشدید والا قول ہی زیادہ معتبر ہے۔

پھر آگے چل کر موصوف فرماتے ہیں: "میں نے اپنے شیخ سید عیدروس سے سنا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے غزّالی بہ تشدید سنا ہے"[2]

(۱۶) رضی الدین بن محمد بن علی بن حیدر حسینی شامی | موصوف نے دونوں اقوال بلا ترجیح نقل کیے ہیں:

الغزّالی بالتشدید الی الغزل کالغزّال، وبالتخفیف الی غزالۃ قریۃ بطوس[3]	غزالی بہ تشدید غزل کی طرف منسوب ہے جیسا کہ غزّال ہے۔ اور بہ تخفیف غزالہ کی طرف جو کہ طوس کا ایک گاؤں ہے

(۱۷) زُویمر (S. M. ZWEMER) اس نے چوں کہ مخفف پڑھنے کی ایک دوسری توجیہہ بیان کی ہے اس لئے ہم اس کا قول بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ غزالی غزالہ کی طرف منسوب ہے جو دراصل ایک خاندان کا نام ہے[4]۔ تھیچر (Rev. G.W. Thatcher) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے[5]

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۱/۱۸ [2] حوالہ مذکور ــــ اس طرح کے ایک خواب کی تفصیل اسی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر حاشیہ میں موجود ہے [3] اتحاف ذوی الالباب لشوارد لب اللباب ص ۱۲۶ (مخطوطہ ۱۳۱۰ھ، جامعہ سلفیہ بنارس میں محفوظ ہے) [4] دیکھئے اس کی کتاب A Moslem Seeker After God (London 1920) اس کا عربی ترجمہ "حیاۃ الغزالی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ [5] ملاحظہ ہو: Encyclopaedia Britanica Vol. XI, P.P. 916 ــــ میری نظر سے اس کے دو ایڈیشن گذرے ہیں: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ ہیں علماء و مورخین کے وہ بیانات جنھیں اصل اور اساس قرار دے کر ہمیں حقیقت کی تلاش کرنی چاہیئے۔ دورِ حاضر کے بعض محققین نے اپنی تحقیقات بھی پیش کی ہیں[1]۔ ان سب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "غزالی" کو مشدد یا مخفف پڑھنے سے متعلق علماء کے تین گروہ ہیں: ایک تشدید ہی کو صحیح قرار دیتا ہے، اور دوسرا تخفیف کو، اور تیسرا دونوں کو درست سمجھتا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی تنگی نہیں برتتا — جہاں تک اس آخری رائے کا تعلق ہے ہم اسے قابلِ قبول نہیں سمجھتے کیونکہ تشدید یا تخفیف میں سے کسی ایک کے متعلق معتد بہ دلائل فراہم ہو جانے کے بعد کوئی تیسری راہ اختیار کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی خصوصًا ایسی حالت میں جب کہ تشدید یا تخفیف کے دلائل باہم متعارض ہوں جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

ہم نے ترتیبِ زمانی کا لحاظ رکھتے ہوئے اوپر علماء کے جو اقوال نقل کئے ہیں ان کا سرسری جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام غزالی کے زمانۂ حیات ہی سے تشدید اور تخفیف ہر ایک کے قائل موجود رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ متقدمین میں عمومًا تشدید ہی متداول اور مشہور رہا ہے جس پر شعراء کے عربی اشعار بھی دلالت کرتے ہیں۔ ذیل کے ابیات ملاحظہ ہوں، ان سب میں غزّالی کو مشدّد استعمال کیا گیا ہے:

۱۔ مَعْنٌ فی الجود وقیسٌ الرأ ی وکالغزّالی والمزنی

۲۔ ولطرفہ الغزّال الحیلۃ الھوی وکذلک الاحیاء للغزّالی الورٰی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۱) پندرھواں ایڈیشن (۲) طبع جدید ۱۹۶۹ء — دونوں میں "غزالی" پر W. M. W T کے قلم سے مقالہ ہے — نتیجہ کا مضمون کسی دوسری اشاعت میں موجود ہوگا۔ میں نے اس کا حوالہ عبداللطیف الطیباوی کی کتاب "التصوف الاسلامی العربی" ص ۱۴۴ (طبع مصر ۱۹۲۸ء) میں دیکھا ہے۔

[1] ان میں تین حضرات قابلِ ذکر ہیں:۔ (۱) میکڈونلڈ Fourn of (D. B. Machdonald The Royal As Soc, 1902, PP. 18 — 22 (۲) علامہ احمد تیمور پاشا: ضبط الاعلام ص ۱۰۸-۱۱۲ (۳) قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی: معارف (اعظم گڑھ) [illegible]

٣- أحيي قلوب العاشقين بلحظه الـ — ـغزّال والاحياء للغزّالي

٤- ما بالها قتّالة غزّالة — يا ابدهر، والاحياء للغزّالي

٥- فو خدك النعمان انّ بليّتي — وشكايتي من جفنك الغزّال

٦- صنفت شجونا بالغزّال حزن — فقرأنا مصنّف الغزّالي

٧- فلا تلم الرازيّ والحيرة التي — بها اعترف الجمّ الغفير كغزّالي

٨- وله مهجة بوردي خدّ — ولحاظ تروي عن الغزّالي

٩- غزّال طرفك إن رنا احيى به — وكذلك الاحياء للغزّالي

١٠- عن شعرك الفحام أم عن ثغرك الـ — نظّام أم عن طرفك الغزّال

١١- ابوحامد غزّال غزل مدقّق — من العلم لم يغزل كذلك مغزل[1] الغزل

عربی کا کوئی ایسا شعر نہ مل سکا جس میں غزالی مخفف استعمال ہوا ہو۔ ممکن ہے ایسے چند ابیات تلاش و جستجو کے بعد دستیاب ہو جائیں مگر یقیناً ان کی تعداد کم ہوگی[2] — اس کے برخلاف اردو میں بعض اشعار ملے ہیں جن میں مخفف ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل ابیات دیکھئے :

١- ہے غزالی کی روش، طرز تکلم ان کا — لیک آزادی لئے پھرتی ہے حد سے باہر[3]

٢- عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی[4]

٣- رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی[5]

البتہ فارسی اشعار میں دونوں طرح کے نمونے ملتے ہیں :

---

[1] ان ابیات کے سیاق و سباق اور شاعروں کے نام معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو:
ضبط الاعلام ص ۱۱۰ - ۱۱۲ ؛ مرآۃ الجنان ۲/ ۲۰۴ ؛ ۳/ ۱۸۶

[2] علامہ احمد تیمور پاشا فرماتے ہیں : "ولعله ان وجد يكون قليلا" ضبط الاعلام ص ۱۱۲

[3] یہ منشی امجد علی اشہری کا شعر ہے۔ دیکھئے : زمانہ (آگرہ) ۲۱ اکتوبر ۱۸۹۹ء (بحوالہ "تاریخ صحافت اردو" ۳/ ۱۳)

[4] علامہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) کا مشہور شعر ہے۔ دیکھئے : بال جبریل ص ۵۶ (کلیاتِ اقبال (اردو) ص ... ایڈیشن ۱۹۷۵ء)

[5] یہ بھی علامہ اقبال کا ہے۔ دیکھئے : بانگ درا ص ۲۰۳ (کلیاتِ اقبال ...)

۱۔ حجۃ الاسلام غزّالی بسالِ چار صد — با چل و پنج آمد از دورانِ گیتی در وجود [1]
۲۔ بس گفتا مجتبٰے کرمی دانی دری پرسا — بعہدِ علم غزّالی بعہد علم غزّالی [2]
۳۔ ہر دبیر و شاعر و مفتی کہ او طوسی بود — چوں نظام الملک و غزّالی و فردوسی بود [3]
۴۔ دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم — دلِ جُنَید و نگاہِ غزَالی و رازی [4]
۵۔ تا غَزَالی درس اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت [5]
۶۔ . . . . [6]

میرے خیال میں ان مختلف اشعار کو تشدید یا تخفیف میں سے کسی ایک کی صحت کے لئے بطور "دلیل" پیش کرنا درست نہیں۔ کیونکہ اوّلاً تو یہ خود باہم مختلف ہیں۔ اگر ایک شخص کوئی شعر پیش کرے تو اس کا مخالف بھی اپنی تائید کے لئے دوسرا شعر پیش کر سکتا ہے۔ ثانیاً یہ بہت ہی معروف بات ہے کہ شعر میں وزن کی رعایت بھی شاعر کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اس طرح وہ بعض الفاظ میں خفیف سی تبدیلی کا مجاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اوپر کے تمام اشعار پڑھ جائیے معلوم ہوگا کہ جس جگہ غزّالی بالتشدید کا استعمال ہوا ہے وہاں بالتخفیف استعمال کرنے سے وزن برقرار نہیں رہ سکے گا، اسی طرح اس کے برعکس دیکھ سکتے ہیں — پس ہمیں کسی ٹھوس بنیاد پر ایک جانب کو راجح اور صحیح قرار دینا ہوگا، ان اشعار سے کام نہیں چل سکتا۔

(باقی)

---

[1] قائل کا پتہ نہیں۔ شیخ آذری (م ۸۶۶ھ) نے "جواہر الاسرار" میں اسے نقل کیا ہے۔ دیکھئے: معارف (اعظم گڈھ) جون ۱۹۲۹ء

[2] یہ شعر ملک عماد زوزنی (م ۶۷۳ھ) کا ہے۔ حوالۂ مذکور

[3] قائل کا نام معلوم نہیں۔ حوالۂ مذکور

[4] یہ شعر علامہ اقبال کا ہے۔ دیکھئے ارمغان حجاز ص ۴۳ (کلیاتِ اقبال اردو)

[5] یہ بھی علامہ اقبال کا ہے۔ دیکھئے: جاوید نامہ [میں نے یہ شعر "کلیات اشعار فارسی مولانا اقبال لاہوری" (طبع تہران ۱۳۴۳) ص ۳۵۰ سے نقل کیا ہے]

[6] راسخ کی "مثنوی ناز و نیاز و داد و فریاد" (مخطوطہ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ۔ زیر رقم ۶۴۱) کے ذیلی عنوان "انجام نمودن حکایتہای ناز و نیاز و رجوع شاعر بہ مثنوی داد و فریاد" کے تحت ایک شعر ہے جسے نوٹ

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی علمی اور ثقافتی حیثیت تاریخ کی روشنی میں

(۳)

ڈاکٹر سمیع الدین احمد، لکچرر شعبۂ فارسی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

اسٹوری نے مصنف سیر الاولیاء کے حوالہ سے لکھا ہے[1] کہ برنی نے جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کا مخلص مرید تھا، اپنی عمر کے آخری چند برس عزلت، یادِ خدا اور تصنیف و تالیف کے مشاغل میں گذارے اور اسی حصۂ عمر میں کئی علمی اور ادبی کتابیں تصنیف کیں۔ اس کو امیر خسرو اور حسن دہلوی جیسے باکمال رفقاء کی دوستی اور ہم نشینی کا شرف حاصل رہا اور ان کے اقوال و مذاکرات کو اس نے جا بجا تاریخ فیروز شاہی میں ثبت کیا ہے۔ صاحب سیر الاولیاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ اس سیر الاولیاء میں تاریخ فیروز شاہی کے علاوہ برنی کی حسب ذیل کتابوں کا بھی حوالہ ملتا ہے۔

---

1. Persion literature, Section II Fasciculus 3 pp. 506 - 507

(۱) ثنائی محمدی[1]۔

(۲) صلوٰۃ کبیر۔

(۳) عنایت نامہ الٰہی۔

(۴) مآثر سادات

(۵) حسرت نامہ

ان تصانیف کے علاوہ برنی نے آل برامکہ پر تالیف شدہ ایک قدیم عربی کتاب[2] کا فارسی ترجمہ بھی بعنوان اخبارِ برامکہ (یا اسٹوری کے بیان کے مطابق اخبار برمکیان) ترتیب دیا تھا جو ۷۵۵ھ (مطابق ۱۳۵۴ء) میں مکمل ہوا اور فیروز بن رجب (مشہور بہ فیروز شاہ تغلق) کے نام معنون کیا گیا۔

تاریخِ فیروز شاہی میں غیاث الدین بلبن کے سالِ جلوس (۶۶۴ھ - ۱۲۶۵ء) سے لے کر سلطان فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سالِ جلوس (۷۵۸ھ - ۱۳۵۷ء) تک کے تاریخی حالات و واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے اس اہم تالیف کو منہاج سراج جوزجانی کی تاریخ طبقاتِ ناصری کا تکملہ قرار دیا جا سکتا ہے جو ۶۵۸ھ میں مکمل ہوئی۔ سلاطینِ دہلی کی تاریخ اور اُن کے دورِ حکومت کے سیاسی، تمدنی اور تہذیبی حالات کے لئے برنی کی یہ تصنیف ایک معتبر اور وقیع مآخذ کا کام کرتی ہے۔ اسی بنا پر ذکر الملوک یا تاریخ حقی (تصنیف شیخ عبدالحق دہلوی) اور دوسری متاخر تاریخوں میں اس عہد (بلبن تا فیروز تغلق) کے تذکرے بیشتر تاریخ فیروز شاہی سے ہی منقول ہیں۔ فن تاریخ نویسی کے اعلیٰ معیار، جزالتِ تحریر، شگفتگیِ بیان اور اپنے دل نشین اسلوبِ نگارش کی بنا پر یہ

---

[1] غالباً اس کا واحد مخطوطہ نسخہ رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

[2] ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے مصنف کا نام ابوالقاسم طایفی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات در ایران، جلد سوم بخش دوم، ص ۱۲۹۲)

تصنیف فارسی نثرِ انشاء کے قابلِ قدر شاہکاروں میں شامل کی جا سکتی ہے[1]۔

سلاطینِ دہلی کی تاریخ کے سلسلہ کی تیسری کڑی شمس الدین بن سراج الدین بن عفیف الدین ——— عرف عام میں شمس سراج عفیف ——— کی تاریخ فیروز شاہی ہے جو غالباً ہندوستان میں تیمور کے حملہ کے فوراً بعد ۸۰۲ھ (مطابق ۱۳۹۹ء) کے لگ بھگ تصنیف ہوئی۔ اس کتاب کو تاریخی تسلسل کی وجہ سے برنی کی تاریخ فیروز شاہی کا ضمیمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس عہد کا ایک قابلِ ذکر اور ممتاز مورخ خواجہ عبدالملک عصامی تھا جس نے ۷۵۰ھ (۱۳۴۹ء) میں ایک منظوم تاریخ فتوح السلاطین یا شاہنامۂ ہند عصامی کے عنوان سے مرتب کی[2]۔ عصامی کی پیدائش ۷۱۱ھ کے لگ بھگ ہوئی تھی۔

---

[1] ضیاء الدین برنی اور تاریخ فیروز شاہی کے موضوع پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ ایلیٹ اور ڈاوسن (ج ۳، ص ۹۳) میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ مرحوم پروفیسر محمد حبیب نے Lpe and ... ught of zia uddin Barani کے عنوان کے تحت سات ابواب پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ (Medieval India Quarterly) کی تیسری جلد (جنوری۔ اپریل، ۱۹۵۸ شمارہ ۴/۳) میں سپردِ قلم کیا۔ شیخ عبدالرشید سابق صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی ایک مضمون انگریزی میں اور ایک اردو میں اسی موضوع پر لکھا ہے۔ اسی عنوان کے تحت ایک محققانہ اور تنقیدی مقالہ انگریزی میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی تحریر کیا ہے جس کے لیے ملاحظہ ہو Historiam of Medivel India ed Mohibbul - Hasan 1968, Meevakakshi Prakashan Meerut اس کے علاوہ بھی متعدد دوسرے ماخذ ہیں جن کا ذکر طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

[2] فتوح السلاطین دراصل سلطان علاء الدین حسن بہمن شاہ (گنگو یا کانگو) کے ایماء پر ۱۳۴۹ء یا ۱۳۵۰ء میں لکھی گئی۔ صباح الدین عبدالرحمان صاحب نے اپنے مقالہ بعنوان "جذباتی ہم آہنگی" (ارمغانِ مالک، ص ۶۹۶) میں لکھا ہے کہ حسن بہمنی محمد تغلق کے ایک منجم گنگو برہمن کا ملازم تھا۔ چونکہ موخر الذکر اس کا محسن تھا، لہٰذا اس نے اسی رعایت سے اپنے آقا کا نام اپنے نام میں شامل کر لیا۔ جب ۱۳۴۷ء میں بہمن شاہ نے دکن میں آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی اور خود مختاری کا اعلان کیا تو عصامی اس کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ یہ منظوم تاریخ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور اس میں عہد غزنوی سے سال تصنیف تک کے تاریخی حالات درج ہیں۔ پہلی جلد میں غزنوی فتوحات سے لے کر غوری حکمرانوں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جب ۱۳۲۹ء یا ۱۳۲۷ء (۷۲۶-۷۲۹ھ) میں فخرالدین جونا المعروف بہ سلطان محمد بن تغلق نے مع امراء و رؤسا، عساکر و افواج اور حشم و خدم دہلی کو خیرباد کہہ کر نئے دارالخلافہ دیوگری (دولت آباد) کی طرف کوچ کیا تو عصامی بھی ہم سفر تھا بعد میں وہ علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دامن دولت سے وابستہ ہوگیا اور اس نے چند ماہ کی مدت میں اپنی مثنوی جو شاہ نامۂ فردوسی کے انداز و تقلید میں نظم کی گئی ہے مکمل کی اور اس کو اپنے آقا و مربی کے نام غالباً ۱۳۵۰ء یا ۷۵۲ھ کے حدود میں معنون کیا۔

فتوح السلاطین میں بحر متقارب میں تقریباً بارہ ہزار ابیات ہیں۔ اگرچہ اس کا علمی و ادبی پایہ بہت بلند نہیں لیکن تاریخی واقعات و حوادث کی تفصیل و شرح کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ معظمی صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے عصامی کو اس عہد کا ممتاز ترین ہندوستانی رزمیہ گو شاعر کہا ہے[1]۔

آخری خلجی حکمران قطب الدین مبارک شاہ اور اس کے غیر اصل وارث خسرو خان کے زوال اور موت کے بعد ۱۳۲۰ء میں ایک علائی سردار غازی ملک غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء - ۱۳۲۵ء) کے نام سے سلطنت دہلی کے تخت پر متمکن ہوا اور اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی فتوحات تک کا تذکرہ شامل ہے۔ ڈاکٹر آغا مہدی حسین نے اسی پہلی جلد کا انگریزی ترجمہ مع حواشی اور تشریحات مرتب کیا ہے۔ جو شعبۂ تاریخ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں فتوح السلاطین کا اڈیشن آغا مہدی حسین ہی کے قلم سے تیار ہوا اور آگرہ سے شائع ہوا اور پھر ۱۹۴۸ء میں اس کا دوسرا اڈیشن بقلم اے ایس اوشا مدراس سے شائع ہو چکا ہے۔

[1] ملاحظہ ہو مضمون بعنوان Glimpses of Indo-Persian literature انڈو ایرانیکا جون ۱۹۵۷ء ص ۶ (Indo-Iranica June 1957 P.6)

طرح ایک نئے دورِ اقتدار کا آغاز ہوا۔

عہدِ تغلق میں سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ تہذیبی، علمی اور ادبی مشاغل کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس لحاظ سے ان باوقار سلاطین کے عہدِ حکومت کو ایک امتیازی شان حاصل رہی ہے۔ ان کے زمانہ کے ادبی، تمدنی اور علمی ماحول کی رونق اور گرم بازاری کا ذکر معاصر اور متاخر ماخذوں میں جابجا ملتا ہے۔ اس دور میں متعدد شاعر، ادیب، انشاپرداز، علماء اور مشائخ اور اربابِ فن موجود تھے جن کے کارنامے اس عہد کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا روشن اور زریں باب ہیں۔ خصوصی طور پر غیاث الدین تغلق کے وارث محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء-۱۳۵۱ء) اور سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء - ۱۳۸۸ء) کے زمانۂ حکومت میں اربابِ کمال کافی تعداد میں موجود تھے۔ صفِ اول کے سخنوروں کے علاوہ (جن کی تعداد زیادہ نہ تھی) نسبتاً غیر معروف اور درجہ دوم کے متعدد شاعر ایسے تھے جو اس زمانہ میں زندہ تھے اور جنھوں نے اپنے شعری آثار چھوڑے ہیں۔ بطور مجموعی شعر و سخن کے فروغ و ارتقاء کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس خاندان کے حکمران علم دوست، باذوق، باصلاحیت، مدبّر اور دور اندیش تھے اور نہ صرف یہ کہ باکمال اربابِ فن کی قدر اور سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود بھی علمی اور تہذیبی ذوق و شوق سے بہرہ مند تھے اور فنون و علوم میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ برنی نے سلطان محمد تغلق کے جود و سخا، فراست و درایت، ذاتی فضائل، شعر فہمی، علم دوستی، طبّاعی اور کمالات کی بہت تعریف کی ہے[1]۔ اس کے ذوقِ علمی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"و در معقولاتِ فلاسفہ رغبتے تمام داشت و چیزے از علمِ معقول خواندہ بود"[2]

برنی نے خود لکھا ہے کہ میں سترہ سال اور تین ماہ سلطان محمد تغلق کی خدمت میں ملازم

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، سرسید احمد خان، ص ۴۵۶ بعد

[2] ایضاً ص ۴۶۴

دوگنا رہا اور مجھے 'انعامات وافرہ' اور 'صدقات متواترہ' نصیب ہوئے[1]۔

فیروز تغلق کے عہدِ حکومت کی علمی و تہذیبی حالت اور اس کے بذل و نوال اور داد و دہش کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

"........ و ادرارات و انعامات و وظایف علماء و مشائخ و مدرسان و مفتیان و مذاکران و متعلمان و حافظان و مقربان و ارباب مساجد و آستانہ داران و حیدریان و قلندران و مستحقان و مسکینان دار الملک دہلی از ہزار ہا گذشت و بہ لکھا رسید و مدارس و مساجد قدیم کہ خالی و مندرس گشتہ بود، از مدرسان و مذاکران و متعلمان مشحون و مملو گشت و رونق علم و رواج تعلم از سر پیدا آمد....... الخ[2]"

اسی مورخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے خانقاہوں کے اخراجات اور مشائخ طریقت کی امداد مالی کے لیے اوقاف قایم کئے اور ان کے لیے جاگیریں اور زمینیں مقرر کیں۔ بزرگانِ دین کے لیے وظایف اور مختلف صوفی بزرگوں کے خاندان والوں اور ان کے ورثاء کے لئے مشاہرے مقرر کئے[3]۔

مکرمی صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ محمد تغلق کے عہدِ حکومت میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کے درمیان ثقافتی روابط بہت بڑھ گئے تھے اور اس کی معارف پروری کا یہ عالم تھا کہ اس نے دس ہزار دینار طلائی قاضی مجد الدین شیرازی کو اور اور چالیس ہزار دینار برہان الدین سمرقندی کو ارسال کئے تھے۔ یہ دونوں اصحاب اُس زمانہ کے جید اور متبحر علماء میں شمار ہوتے تھے[4]۔ اسی سلسلہ میں موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، سرسید احمد خان، ص ۵۰۴ بعد۔

[2] ایضاً " " ، ص ۵۵۹

[3] ایضاً ص ۵۶۰ تا بعد

[4] ملاحظہ ہو مقالہ انگریزی انڈو ایرانیکا جون ۱۹۵۵ء ص ۶

ایک دفعہ ایک شیرازی دانش مند نے کچھ کتابیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیں تو اس نے بطور انعام اس عالم کو بیس[2] ہزار مثقال سونا عطا کیا۔[1]

شہاب الدین العمری کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے صباح الدین صاحب نے مزید لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے دربار میں عربی، فارسی اور ہندی کے ایک ہزار شاعر جمع رہتے تھے۔[2] وہ باوجود اپنی قساوتِ قلبی، سر پھرے پن اور خونریزی اور سفاکی کے خود بھی عالم و فاضل اور باذوق ہونے کے علاوہ فن کاروں کو نوازنے اور علم و فضل کی حمایت میں کسی سے کم نہ تھا۔[3]

جس طرح برنی کو محمد تغلق کی سرپرستی حاصل رہی، اسی طرح شمس سراج عفیف کی تربیت فیروز شاہ تغلق کے زیرِ عاطفت ہوئی اور وہ ایک مدت تک اس کی نوازشوں کا خوشہ چین اور اس کے دامنِ دولت سے وابستہ رہا۔ طرح طرح عمارات کے اعلیٰ ذوق کے علاوہ جس کا ثبوت وہ مساجد، قلعے، محلات، مقبرے اور مدرسے ہیں جو اس نے تعمیر کرائے تھے۔[4] اس مخیر اور دریا دل بادشاہ کو علمِ تاریخ سے بھی گہرا شغف تھا۔ ظلم و ستم کا وہ ماحول جو محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں ہر چہار طرف قایم تھا اب ختم ہو چکا تھا، لہٰذا اس نیک دل حکمران نے امن و امان قایم کرنے کے علاوہ خانقاہوں اور جماعتِ خلوف پر سے سختی اور سخت گیری کا تسلط دور کیا اور مشائخ و صوفیا کی زندگی میں آزادی، سکون اور طمانیتِ قلب کی حکمرانی قایم کی۔ اس کو مشایخ وقت سے گہری عقیدت تھی اور

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ انگریزی انڈو ایرانیکا جون ۱۹۵۷ء ص ۶

[2] ایضاً۔

[3] ایشوری پرشاد نے اپنی مشہور کتاب History of Medieval India میں اس کے کمالات اور اکتسابات کی بڑی تعریف کی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۲۲۹۔

[4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف ص ۳۲۹ بعد

اسی جذبہ کے تحت اس کے تعلقات حضرت چراغ دہلی سے ارادتمندانہ اور مخلصانہ تھے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر سال ایک بڑی رقم اہل علم حضرات کو بطور عطیہ دینے اور مدرسوں، مساجد اور دوسرے تمدنی تہذیبی اور تعلیمی مراکز کی امداد کے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ فتوحاتِ فیروز شاہی کو جو اصولِ حکمرانی، انسدادِ افعالِ ذمیمہ، اقوال، فرامین، رفاہِ عامہ، تعمیرات اور دوسرے کارہائے نمایاں کے ذکر و تفصیلات پر مشتمل ہے، ایک اہم کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔[1]

اسٹوری نے لکھا ہے کہ ۷۷۲ھ (۱۳۷۰ء) یعنی فیروز شاہ کے بیسویں سالِ جلوس میں کسی نامعلوم مصنف نے کتاب بنام سیرت فیروز شاہی ترتیب دی جو چار ابواب پر مشتمل ہے اور جس میں سلطان فیروز تغلق کا تذکرہ اور اُس کے کارناموں کا حال بڑے بلیغ اور مرصع انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اسٹوری نے اسی سلسلہ میں بانکی پور کے مخطوطہ (ج۷، ۵۴۹) کا حوالہ دیا ہے جو ۱۸۲ اوراق پر مشتمل ہے۔[2]

اب تک عام طور سے ہندوستانی فارسی نثر کے جو اسالیب مختلف موضوعات کی شرح و بسط کے لئے اختیار کئے گئے تھے۔ ان کی بنیاد سادگی بیان، صفائی مضمون سلاست اور دل نشینی پر تھی اور چند گزشتہ مشہور و معروف تصانیف جیسے کشف المحجوب تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، جوامع الحکایات، طبقات ناصری، فوائد الفواد اور

---

[1] اسٹوری نے طبقاتِ اکبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس نے یہ فرامین و اقوال جو خود اس کے مرتب کردہ تھے، مسجد فیروز آباد کے ایک ہشت پہلو گنبد میں کتبات کی شکل میں کندہ کرا دئے تھے۔ اسٹوری نے یہ بھی لکھا ہے کہ فتوحاتِ فیروز شاہی ۱۸۸۵ء میں دہلی سے شایع ہوئی۔ ملاحظہ ہو: Persian literature section II Fasc. 3, P. 509

[2] ایضاً، ص ۵۰۹۔

تاریخ فیروز شاہی برنی اور تاریخ فیروز شاہی شمس عفیف وغیرہ میں بیشتر رواں اور سادہ
تحریر ہی بروئے کار آیا ہے اور یہی انداز فی الواقع ان کی شہرت اور مقبولیت کا ضامن
ہے لیکن اس عہد (نیمۂ اول قرن ہشتم میلادی) میں عین ماہرو عامل ملتان نے اپنے مکتوبا
اور مراسلات کے ذریعہ فارسی نثر نویسی کے میدان میں ایک جدید طرز مرصع کا اضافہ ک
اس سے پہلے امیر خسرو نثر مصنوع اور عالمانہ عبارت آرائی کی بنیاد ڈال چکے تھے ا
سلسلہ میں ان کی تصانیف اعجاز خسروی اور خزائن الفتوح (یا تاریخ علائی) کا مختصر
اور ان کے طرز تحریر کا ذکر ضمناً پہلے کیا جاچکا ہے[1]۔ عین الدین عین الملک عبداللہ بن
مشہور بہ عین ماہرو[2] کا شمار عہد علائی اور عہد تغلق کی بہت ممتاز اور معروف شخصیتوں
ہوتا ہے وہ عام طور سے ملتانی کی نسبت سے مشہور ہے۔ اس نے دہلی سلطنت کے
فرماں رواؤں علاء الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، خسرو خان، غیاث الدین تغ
محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق کا دور حکومت دیکھا تھا اور مختلف اوقات میں مختلف
مناصب پر فائز رہا۔ وہ اپنے عہد میں زبردست سیاسی اثرات اور انتظامی حیثیت
کا مالک تھا اور اس زمانہ کے با اقتدار مدبرین حکومت میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس
شخصیت کا دوسرا تابناک پہلو وہ ہے جس میں وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور
کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے اس کے منشآت اور مکتوبات کا مجموعہ جس میں

---

[1] اس کے علاوہ اس سے بھی پہلے تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل کی معروف تصنیف تا
(جس کا ذکر اس مقالہ کی پہلی قسط میں کیا جاچکا ہے) کا انداز نگارش بھی عبارت آرائی کے سبب
خاصا بوجھل، عربی آمیز اور مرصع ہے۔ جابجا اشعار کی ترصیع (اور کہیں کہیں تو عربی کے اشعار
کئے گئے ہیں) نے کلام کو اور زیادہ مصنوع اور بلیغ بنا دیا ہے۔ [2] عفیف لکھتا ہے
"منقولات عین الملک را عین ماہرو گفتندے" (تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۰۶)

نے مراسلہ نگاری کو ایک جداگانہ فن کی حیثیت سے پیش کیا ہے عام طور سے انشائے ماہرو کے نام سے شہرت رکھتا ہے[۱]۔ لیکن شمس سراج عفیف نے اس مجموعہ کا نام "ترسل عین الملک" لکھا ہے:

"یکے ازاں ترسل عین الملکی است کہ در جہان بہ ہر یک زبان معروف و مشہور است"[۲]

یہ کتاب ان سرکاری نیز نجی مکتوبات کا مجموعہ ہے جو مصنف نے وقتاً فوقتاً مختلف اعیانِ سلطنت، امراء و رؤسا، مشائخ و علماء، سادات اور فضلا اور اپنے اعزہ واقربا کو لکھے تھے۔ اس اعتبار سے ان خطوط کی حیثیت سرکاری بھی ہے اور خالصتہً شخصی بھی لیکن دونوں قسم کے خطوط میں ادبی اور علمی شان اور عبارت آرائی کا طمطراق برقرار نظر آتا ہے اس کے علاوہ کچھ مراسلے وہ ہیں جو شاہی فرامین و احکام پر مشتمل ہیں۔

عین ماہرو کی سمجھ بوجھ، علمی فضیلت اور ادبی کمالات کا ذکر کرتے ہوئے شمس سراج عفیف لکھتا ہے[۳]۔

---

[۱] انشائے ماہرو کو (بعنوان منشآت عین الدین عین الملک عبداللہ بن ماہرو) شیخ عبدالرشید صاحب سابق صدر شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کی مطبوعات کے تحت ۱۹۶۵ء میں شایع کیا ہے۔ متن کے علاوہ جس میں کافی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے اور امکانی صحت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ مؤلف نے انگریزی میں ایک بسیط اور مشرح مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں مصنف کی زندگی، حالات، کوائف، سیاسی اور ادبی حیثیت اور تاریخی اور علمی حیثیت سے انشائے ماہرو کی اہمیت، مکتوبات کے خلاصے اور اس عہد کی تاریخ اور سیاست سے متعلق اہم نکات اور دوسرے متعلقہ مسائل و موضوعات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے عین ماہرو کے ذکر کے سلسلہ میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے بھی اپنی کتاب تاریخ ادبیات در ایران، جلد سوم بخش دوم (ص ۱۳۰۸) میں اس ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے۔ [۲] تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۰۸ [۳] ایضاً

"المقصود عین الملک در کفایت و درایت انچنیں شخصے بود . . . . وفضل اورا غایتے نبود"

"چنانچہ چندیں کتب فضل در عہد دولت محمد شاہ[1] و فیروز شاہ تصنیف کردہ اوست"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عین الملک اس مجموعہ خطوط کے علاوہ بھی دوسری کتابوں کا مصنف تھا لیکن جہاں تک ہمارا محدود علم ہے، انشاء کے اس کارنامہ کے علاوہ اس کی تحریر کا کوئی دوسرا نمونہ اب تک علم تحقیق کی دنیا میں روشناس نہیں ہو پایا ہے۔ مرحوم شیخ محمد اکرام کے حسب ذیل بیان سے بھی جو انھوں نے اس کتاب کے مذکورہ بالا اڈیشن میں 'تعارف' کے عنوان کے تحت دیا ہے؛ اس کتاب کی مجموعی اہمیت کا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان مکتوبات سے نہ صرف تاریخی اور جغرافیائی معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ ایک ایسے قدیم دور کے تہذیب و تمدن اور ثقافتی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے معاصر ذرایع بہت تھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کا ادبی پایہ بھی بہت بلند ہے چنانچہ حضرت امیر خسرو اور سراج عفیف ایسی معاصر علمی ہستیوں نے اپنی تصانیف میں عین الملک ماہرو کے بلند علمی و ادبی مقام اور اس کے ان شاہپاروں کا ذکر بڑے موثر اور سنجیدہ الفاظ میں کیا ہے"[2]

---

[1] یعنی محمد بن تغلق۔

[2] اس ضمن میں اکرام صاحب مرحوم کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عہد علائی اور عہد تغلق کے اس بدیع الفکر عالم اور صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز نے ۷۶۴ھ (۱۳۶۲ء) کے بعد کبھی وفات پائی۔

اسی اڈیشن کے انگریزی مقدمہ میں شیخ عبدالرشید صاحب نے اور اکرام صاحب نے
بحوالۂ بالا تعارف میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ انشائے ماہرو کا دنیا میں واحد نادر
نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مقدم الذکر نے لکھا
ہے کہ اسی منفرد نسخہ کی تین نقول کرائی گئی تھیں جن میں سے ایک سے انھوں نے استفادہ
کیا اور اسی کی مدد سے اس کتاب کا موجودہ متن تیار کیا ہے۔

ذیل میں انشائے ماہرو کا ایک اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس سے نہ صرف اس کتاب
کے عام سبک سے آگاہی ہو سکے گی بلکہ یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ اگر ایک طرف انشا ساد
کا رواج تھا تو دوسری طرف نثر مرصع کے نمونے بھی دامن ادب کو وسیع کر رہے تھے۔

"تا براق قلم را در میدانِ سیم گون کاغذ جولان گاہ انشار و ابداع تصنیف
و اختراع طویل و عریض خواہد بود، و غواص خامہ پختہ کار از بحار مشکبار در رغرر
بلاغت و جواہر زواہر براعت بدستیاری بنان بیان عیان خواہد نمود، قلم سحر
آفرین صاحب دیوان ممالک انشار کہ مستدعی تحسین و مستوجب مدح و آفرین
است و در زمان استخراج امور لطایف و آوان استنباط کنوز ظرایف و عطارد در
مقامِ اقتباس فوائد موقوف و در التقاط فرائد چوں تیر راست ایستادہ، و مثال
تمثال جوز الکر خدمت و زبانِ مدحت بستہ و کشادہ است، و در حلِ مشکلات و
کشفِ معضلات و اظہارِ فضایل و کتمان سرایر خصایل ناظم مناظم دین و دولت
و راقم صحایف انتظام ملک و ملت باد و تحریر قلم او در افاضت معانی چوں
تیغ آفتاب جہانگیر، و اعادی آن خدمت چون قلم نگونسار و دستگیر بحق من قال
"وعلّم بالقلم"۔

عین ماہرو کہ صحایف موالات موروث را بلطایف مصافات مکتسب آراستہ
و نقش دولت خواہی و رقم یگانگی بر صفحات خلوص اعتقاد نگاشتہ است، بعد اسلام مقام

عبودیت در مرکز اخلاص چوں قلم قیام نمودہ وعرضہ داشت کہ چون آرزومندی محبان خدمت کریم خداوندی از دایرہ عبارت بیرون بود، لبساط شرح و لبسط شوق بدست ایجاز بر مبنای " والکرام من التطویل تصدیع" در نوشت"[1]

ایک اہم اور قابلِ توجہ حقیقت جس کی جانب پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے - یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی فارسی زبان اور ادبیات کی اس درجہ ترقی گویا دو تہذیبوں کے باہم ارتباط اور آمیزش کی دل کش اور پُر از معلومات داستان ہے - علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے وہ بیش بہا اور قدیم سرمائے جو سنسکرت یا دوسری ہندوستانی زبانوں میں محفوظ تھے - اب آہستہ آہستہ ادبِ فارسی کے کشادہ دامن میں جگہ پانے لگے اور ہندوستانی حکمت یا فکر کا عنصر فارسی ادبیات اور علوم کا جزو بننے لگا - اس علمی لین دین میں مسلمان فرمانرواؤں کی وسیع القلبی اور علم دوستی کو بڑا دخل تھا جس کے سبب سے ان سلاطین نے علوم و ادب کے سرمایہ کی فارسی میں منتقلی میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا - ایک عام (اگرچہ کسی حد تک غیر مصدقہ) تصور یہ ہے کہ عہدِ غزنوی میں پہلی بار سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی بنیاد پڑ چکی تھی، لیکن عہدِ علائی اور دورِ تغلق میں ہندوستانی علوم و فضایل کی طرف دریا دلی اور دل چسپی کے ساتھ توجہ دی جانے لگی - لہٰذا اس دور کی ثقافت کا ایک روشن اور اہم پہلو یہ ہے کہ ہندوستانی سرمایۂ علم و فضل کو فارسی کے قالب میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کی گئی اور اس روایت کو باقاعدہ طور پر سرکاری سر پرستی حاصل ہوئی - سلطان فیروز شاہ تغلق کے درباری شاعر عزالدین خالدخانی نے سنسکرت سے فارسی شعر کے قالب میں دلایل فیروز شاہی ترتیب دی جس کا موضوع نجوم، فال اور شگون تھا -

---

[1] انشای ماہرو، متذکرہ بالا اڈیشن، ص ۱۱۷ -

بدایونی نے لکھا ہے کہ فتح نگر کوٹ[1] کے بعد جو ۷۷۲ھ (۱۳۷۰-۷۱ء) کے لگ بھگ حاصل ہوئی تھی، وادی کانگڑہ میں جوالا مکھی نام کے مندر سے مختلف موضوعات سے متعلق ایک ہزار تین سو (۱۳۰۰) سنسکرت میں لکھے ہوئے قلمی نسخے حاصل ہوئے اور وہ سب مخطوطات وہاں کے پجاریوں کی ملکیت میں ایک مدت دراز سے محفوظ چلے آرہے تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے برہمنوں اور مسلمان مترجموں کو بلا کر خواہش ظاہر کی کہ ان کتابوں میں سے کچھ کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے۔ اس جگہ بدایونی کا بیان بعینہ نقل کر دینا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہو:

"..... و یک ہزار و سی صد کتاب از برہمنان سابق درین بت خانہ است کہ بہ جوالا مکھی اشتہار دارد ..... سلطان برا ہمہ را طلبیدہ بعضے ازان کتاب را فرمود تا مترجمان بزبانِ فارسی ترجمہ نمایند۔ ازاں جملہ عزالدین خالد خانی کہ از شعرا و منشیان عصرِ فیروزی بود کتابے در بیان ہبوط و صعود سیاراتِ سبعہ و سعادت و نحوست آنہا و تفاؤل و شگون بنظم آوردہ و دلایل فیروزی نام نہاد.. الخ[2]

بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے ۱۰۰۰ھ میں اس کتاب کو اول سے آخر تک مطالعہ بھی کیا تھا[3]۔ اس کتاب اور اس موضوع سے متعلق معلومات اس دور کے چند ماخذوں میں بھی مل جاتی ہے[4]۔

---

[1] جس کا نام بعد میں سابق شاہنشاہ مرحوم محمد بن تغلق کے نام کی رعایت سے محمد آباد رکھا گیا۔ (بدایونی ج ۱، ص ۲۴۸)

[2] منتخب التواریخ، ج ۱، ص ۲۴۹۔

[3] ایضاً

[4] بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی کی شایع کردہ کتاب History and Culture of the Indian People۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تراجم کی بحث کی ذیل میں بدایونی ہی کے بیان سے مزید علم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ترجمہ کی چند کتابیں موسیقی و رقص وغیرہ کے موضوعات پر جو عہد فیروزی میں مرتب ہوئی تھیں اس کی نگاہوں سے گذری تھیں۔ وہ لکھتا ہے:

"چند کتابے دیگر قبل ازیں ہم بنظر فقیر رسیدہ کہ بنام سلطان فیروز ترجمہ شدہ، بعضے ازاں در علم بنگل یعنی فن موسیقی و اقسام اکھارہ (؟) کہ آن را پاتربازی می گویند، و بعضے در غیر آن ..... الخ[1]

اسی عہد میں ــ ۷۷۲ھ کے حدود میں ــ مولانا داؤد نے ہندی زبان میں لکھی ہوئی ایک عاشقانہ مثنوی لورک و چاندا کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا اور اسے فیروز شاہ کے نام منسوب کیا[2]۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ اس نظم کی مقبولیت اور تاثیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی جلد ششم (متعلق بہ دہلی سلطنت) میں صفحہ ۵۳۶ پر دلایل فیروز شاہی کا ذکر درج ہے اور مترجم کا نام عزالدین خالد خانی دیا ہوا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آگے چل کر سنسکرت سے فارسی میں تراجم کی مزید بحث کے سلسلہ میں اسی کتاب میں صفحہ ۵۳۸ پر مترجم کا نام عزیزالدین خالد کرمانی دیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر رضا جلالی نائینی نے اپنے مضمون Persian translations of Sanskirit warks (مجلہ ہندوایران، شمارہ دوم، سال چہارم، تیر ۱۳۵۰ھ ش) میں بھی دلایل فیروز شاہی اور اس کے مرتب کا ذکر کیا ہے لیکن ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

عزالدین خالد خانی اور دلایل فیروز شاہی پر مفید اطلاعات پروفیسر این، ایس گورکیہ صاحب نے بھی اپنے مقالہ Persian Staudies in Medieval peri—od of Indian History Indo Iran, April, 1973 میں فراہم کی ہیں۔

[1] منتخب، ج ۱، ص ۲۴۹ [2] ایضاً ص ۲۵۰۔

کا یہ عالم تھا کہ دہلی میں شیخ تقی الدین واعظ ربانی منبر پر کھڑے ہو کر اس کے کچھ اجزا خطبہ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جس کو سن کر سامعین پر ایک عجیب وجد کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ جب کچھ علمائے وقت نے ان سے سوال کیا کہ اس ہندوستانی مثنوی کے اشعار کے انتخاب اور قرأت کا کیا سبب ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ سر تا پا حقایق و اسرار معرفت سے مملو ہے اور اہلِ دل اور صاحبانِ وجد و حال کے لیے سامان ذوق و شوق اس سے حاصل ہوتا ہے، نیز اس کے معانی اور قرآن کے مفاہیم و مطالب میں مطابقت پائی جاتی ہے[1]۔ چند جدید ماخذوں میں وراہ می ہیرا (Varahami hira) کی کتاب (Panchsiddhantika) کے ترجمہ کا حوالہ ملتا ہے جس کو عبدالعزیز بہائی شمسی نوری نے غالباً اسی صدی میں سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا[2]۔ اس مختصر سی بحث سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اگرچہ پہلے بھی تراجم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن عہد فیروزی میں اس ادبی روایت کو خصوصی تقویت حاصل ہوئی اور پھر آئندہ بھی یہ علمی سرگرمی جاری رہی جس کا بدیہی ثبوت

---

[1] منتخب، ج ۱، ص ۲۵۰

[2] ملاحظہ ہو مقالہ فارسی بعنوان "سہم گرانقدر ہند در گسترش دامنۂ زبان و ادبیاتِ فارسی" از معظلی دکتر سید امیر حسن عابدی، دانش گاہ دہلی، مجلہ ہند و ایران، جنوری ۱۹۷۲ء۔ بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی کی شایع کردہ دورۂ سلطنت دہلی سے متعلق تاریخی کتاب میں جس کا حوالہ پہلے دیا گیا ہے، صفحہ ۵۲۸ پر موسیقی اور رقص کے موضوع پر کسی سنسکرت کی کتاب کے فارسی میں ترجمہ کے سلسلہ میں عبدالعزیز شمس تھانیسوری کا نام دیا گیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو مقالہ انگریزی از قلم دکتر سید رضا یلالی نائینی، مجلہ ہند و ایران، جولائی ۱۹۷۲ء۔ فاضل مقالہ نگار نے اس بات کا شک ظاہر کیا ہے کہ غالبًا یہ ہے کہ عبدالعزیز شمس بہاری نوری اور شمس عفیف سراج، (مصنف تاریخ فیروز شاہی) دونوں ایک ہی شخصیتیں ہیں، لیکن ہماری حقیر رائے میں یہ خیال سہو محض ہے۔

یہ ہے کہ نہ صرف خصوصیت کے ساتھ پندرھویں صدی میں بہمنی سلاطین کے زیر توجہ سنسکرت سے فارسی میں چند ترجمے ہوئے[1] بلکہ تیموری سلاطین کے زمانہ حکومت میں بھی ہندی یا سنسکرت کی علمی وادبی کتابوں، حکایات و قصص وغیرہ کے علاوہ دوسری زبانوں کے علوم و فضائل کو بھی فارسی میں منتقل کیا گیا اور ان کوششوں سے ادب و علم کو بڑی وسعت حاصل ہوئی۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان، علوم اور ادبیات کو فروغ دینے میں ہندوستانی صوفیائے کرام اور ان کی تبلیغات و تعلیمات، تذکرات و ملفوظات اور ان کی تصنیفات اور تالیفات کا بہت اہم اور مقتدر رول رہا ہے۔ ان مشائخ عظام نے خواہ وہ شمالی ہندوستان کے ہوں، چاہے ان کا تعلق سرزمین دکن سے ہو، اپنے اپنے دور میں ——— تصوف و سلوک کی اولین تبلیغی سرگرمیوں سے لے کر موجودہ پندرھویں صدی عیسوی تک یا اس کے بعد بھی ——— اپنی اپنی شخصیتوں کے گرد متعدد علمی، ادبی اور تہذیبی آثار و باقیات کا روشن اور تابناک ہالہ چھوڑا ہے اور بہت سی کتابیں ان کی یادگار ہیں جن میں اخلاقی، مذہبی، فلسفیانہ اور متصوفانہ موضوعات و مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔ انھیں آثار میں سے چند ایسی کتب ہیں جو اولیائے کرام کے تذکروں، حالات زندگی، تعلیمات اور سیرت سے متعلق ہیں۔ یہ سارے کارنامے ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کا اہم حصہ اور جزو لاینفک ہیں لیکن موضوع کی طوالت اور اس طرح کی تصانیف کی کثرت کی وجہ سے ان سب کے احاطہ اور ان پر تفصیلی بحث کی یہاں گنجائش نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے جائزہ کے لئے جداگانہ دفتر درکار ہے۔

اس سلسلہ کی ایک ممتاز اور اہم تصنیف جو فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں مکمل ہوئی اور جس کا ذکر یہاں ضروری ہے، سید محمد بن سید نورالدین مبارک علوی کرمانی معروف بہ میر خرد کی مشہور کتاب سیرالاولیاء ہے جس کا پورا نام "سیرالاولیاء فی محبۃ الحق جل و علا" ہے اور جس میں چشتی سلسلہ کے بزرگوں خاص طور سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت

---

[1] ان ترجموں کا ذکر آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ اورحضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے حالاتِ زندگی اور واقعات، ان کے خلفاء ومریدین، حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی، اجمیریؒ کے تذکرے اور ان کے مریدوں اورجانشینوں کے واقعات اورحالات، نیز اقوال و مذاکرات درج ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متفرق مسایل و موضوعات ہیں جن کے بارہ میں مفید تفصیلات اسٹوری نے فراہم کی ہیں[۱]۔ یہ اہم کتاب جو دس ابواب میں تقسیم کی گئی ہے، اسی وقت مکمل ہوئی جب کہ مصنف کی عمر پچاس سال تھی۔ میرخرد سلطان فیروز شاہ تغلق کا ہم عصر اور حضرت شیخ نصیرالدین اودھی[۲] چراغ دہلی[۳] کا مرید تھا۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ وہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مریدوں میں سے تھا۔

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس نے حضرت چراغ دہلیؒ سے بیعت سے پہلے اپنی زندگی کے اولین دور میں حضرت سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدینؒ کے حضور میں بھی زانوی ارادت تہہ کیا ہو[۴]۔

اسٹوری نے خزینۃ الاصفیا اور شجرۂ چشتیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ میرخرد نے ۷۷۰ھ (۱۳۶۸ء-۱۳۶۹ء) میں وفات پائی[۵] لیکن ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے مرحوم سعید نفیسی کے اس قول کا حوالہ دیتے ہوئے جو موخرالذکر کی کتاب تاریخ نظم ونثر فارسی (ص ۷۰۹) میں مذکور ہے لکھا ہے کہ صاحب سیرالاولیاء نے ۷۷۰ھ میں انتقال کیا[۶]۔

موضوع اور طرزِ نگارش دونوں ہی کے لحاظ سے سیرالعارفین اس دور کی ایک اہم نمایندہ تصنیف کہی جاسکتی ہے[۷]۔

(باقی)

---

[۱] ملاحظہ ہو Persian Lit. Vol. I. Part 2 Biography صفحات ۹۴۱ و تا ۹۴۲۔ [۲] چونکہ وہ اجودھیا (اودھ) میں پیدا ہوئے تھے، اس لئے اودھی کہے جاتے ہیں۔ [۳] ان کی وفات ۷۵۷ھ میں ہوئی۔ [۴] ..... سید وحیدالدین کرمانی مبارک کہ از مریدان شیخ نظام الدین اولیاء است و سید خرد اشتہار دارد وکتاب سیرالاولیاء تصنیف اوست ....." (تاریخ فرشتہ، ج ۲، ص ۳۹۷) [۵] اس سلسلہ میں اسٹوری کا بیان ہے: Muhammad b. Mubarak Received his Sufism from Sh. Nizam-al-Din. Subsequently he became the disciple of Nasir-al-din Mahmud Chiragh-i-Dihli. (Ibid Vol. I Part 2 P- 942)
[۶] ایضاً ص ۹۴۲۔ [۶] تاریخ ادبیات در ایران، ج ۳، بخش ۲، ص ۱۳۱۵۔ [۷] سیرالاولیاء کا ایک اڈیشن لالہ چرنجی لال کے اڈیشن کے نام سے ۱۸۸۵ء کے غدر کے فوراً بعد دہلی سے شایع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی محب ہند

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات و تاثرات

(۶)

سعید احمد اکبرآبادی

پشاور سے روانگی ۱۱؍مارچ: مغرب کے بعد پونے آٹھ بجے ہم لوگ کراچی کے ارادہ سے ہوٹل سے روانہ ہوئے، ایرپورٹ پر ڈیڑھ دو گھنٹے کے قریب انتظار کرنا پڑا۔ مگر اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بعض دیرینہ دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ ان میں ایک مسٹر شریف الحسن ہیں، یہ خالص دلی والے تھے نہایت ذہین اور صالح نوجوان تھے، میرے خواجہ تاش دوست ہیں کیوں کہ ہم دونوں سینٹ اسٹیفنس کالج میں پڑھتے تھے۔ جو میرے استاد تھے اُن کے بھی تھے، ایم۔اے میں میرا اُن کا مضمون ایک ہی تھا یعنی عربی، وہ مجھ سے جونیر تھے، دہلی یونیورسٹی کے ایم۔اے کے امتحان میں ہم دونوں نے فرسٹ کلاس حاصل کیا۔ تقسیم کے وقت ہی پاکستان چلے گئے، آج کل کسی وزارت میں سکریٹری ہیں، ان کا ہڈکوارٹر اسلام آباد ہے، پشاور کسی سیمینار میں شرکت کی غرض سے آئے تھے، اب اس وقت اسلام آباد واپس جا رہے تھے یہاں اچانک ملاقات ہوئی تو ہم دونوں کو بڑی خوشی ہوئی، انھوں نے دو

دن کے لئے اسلام آباد آنے اور اُن کے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی، مگر میں نے کہا کہ وعدہ نہیں کر سکتا۔

دس بجے کے لگ بھگ جہاز روانہ ہوا، چونکہ یہ چارٹرڈ تھا اس لئے ہم سب لوگ ایک ہی جگہ تھے، ڈنر کا انتظام اسی میں تھا۔ جب اس سے فراغت ہوگئی تو مولانا کوثر صاحب نیازی جو اسی جہاز سے ہمارے ہم سفر تھے انھوں نے جہاز میں گھوم پھیر کر فرداً فرداً ہر شخص سے مل کر اُس کی خیریت پوچھی حکیم محمد سعید صاحب بھی نچلے نہیں بیٹھے، رواں دواں رہے، مولانا کوثر نیازی جب میرے پاس آئے تو خیریت طلبی اور مزاج پرسی کے بعد دریافت کیا کہ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد میرا پروگرام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: "بعض ضروری کاموں کی وجہ سے مجھ کو ہندوستان واپس جانے کی جلدی ہے تاہم کراچی اور لاہور میں میرے اعزا اقربا اور احباب کی بہت بڑی تعداد ہے، ان کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا، اس لئے ارادہ یہ ہے کہ اختتام کانفرنس کے بعد پانچ دن کراچی میں اور پانچ ہی دن لاہور میں قیام کروں گا! اور بس، اللہ اللہ خیر صلا۔ یہ سن کر مولانا اپنے خاص انداز گفتگو میں چمک کر بولے: "اور دو دن اپنے بھائی کے ساتھ اسلام آباد میں قیام نہ کیجئے گا۔؟ انھوں نے یہ جملہ اس کرم گسترانہ انداز میں کہا کہ میں انکار نہیں کر سکا اور بولا: "بہت بہتر ہے، میں قیام تو نہ کر سکوں گا، البتہ آپ سے الوداعی ملاقات کی غرض سے ایک دن کے لئے لاہور سے اسلام آباد بھی آؤں گا" مولانا نے فرمایا: "شکریہ! ہاں آپ اسلام آباد ضرور آیئے"

مولانا آگے بڑھے تھے کہ حکیم محمد سعید صاحب میرے پاس آکر بیٹھ گئے، اُن سے گپ شپ ہوتی رہی، پونے بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ کراچی کے آثار نظر آنے لگے، اب جہاز کی رفتار کے سست ہونے کے ساتھ دل کی حرکت تیز ہونے لگی اور آتش شوق مشتعل ہوکر دل و دماغ پر چھا گئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ میری منجھلی بیٹی مسعودہ، اُس کے شوہر ابو المحمود سعید، ان کے بچے اور میرا ایک بیٹا جنید احمد یہ سب کراچی میں تھے، بنگلہ دیش بننے سے پہلے یہ

سب لوگ مشرقی پاکستان میں تھے، وہاں ابوالمحمود سعید رحمٰن کو ہم سب لوگ مونا کہتے ہیں ایک کمپنی میں منیجنگ ڈائرکٹر تھے اور جنید بھی ایک بینک میں جونیئر آفیسر کی پوسٹ پر تھا، اللہ کے فضل و کرم سے ان کے پاس کیا نہیں تھا۔ زندگی بڑی عزت اور آرام سے بسر ہو رہی تھی کہ اچانک بنگلہ دیش کا ہنگامہ ہوا تو یہ سب کچھ وہاں چھوڑ چھاڑ اپنی جانیں سلامت لے کر اچی پہنچ گئے، گویا ایک موجِ خون تھی جو ان کے سر سے گذر گئی، ایک سیلابِ بلا تھا جو ان کے کاشانۂ ہستی کو متزلزل کر گیا، مگر کون کس سے کہے؟ اور کیا کسی سے شکوہ کرے یہاں تو عالم یہ تھا :۔

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے چمن اڑ گئے آندھیاں آتے آتے

کراچی میں ان لوگوں کے دو ڈھائی برس انتہائی پریشاں حالی میں گذرے۔ آخر خدا کا شکر ہے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد مونا کو سوئٹزرلینڈ کی ایک مشہور کمپنی میں پروڈکشن منیجر کی بڑی اچھی جگہ مل گئی اور میرا لڑکا جنید بھی ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا، بنگلہ دیش کے حادثہ کے بعد سے اب تک ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا، طبیعت سخت بے چین تھی، اب کراچی کے آثار نظر آئے تو یہی بے چینی اضطراب امید میں تبدیل ہو گئی۔

کراچی | جہاز نے کراچی کی سرزمین پر قدم رکھا، ہم لوگ باہر آئے تو دیکھا کہ مندوبین کے استقبال کے لئے اہالیانِ کراچی کی ایک خاصی تعداد ایرپورٹ پر موجود تھی، انھیں لوگوں میں ایک طرف میرے چند دوستوں کی معیت میں مسعودہ، اس کے شوہر، بچے اور جنید کھڑے تھے، میں قریب آیا تو مسعودہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پانچ برس کے بعد خدا نے ان لوگوں کی شکلیں دکھائی تھیں اور اس مدت میں ایک قیامت ان کے سر پر سے گذر چکی تھی، اس [illegible] دل بھر آیا۔ کچھ زیادہ گفتگو کا موقع نہیں تھا، کانفرنس کے ڈسپلن کے ماتحت فوراً بس میں جا کر بیٹھ گیا، مونا کے پاس اُن کی اپنی ذاتی کار تھی، اُن کو معلوم تھا کہ میرا قیام کس ہوٹل میں ہوگا۔ اس لئے ادھر [illegible] بس روانہ ہوئی

اور اُدھر مونا سب کے ساتھ اپنی کار میں الگ روانہ ہوئے اور ہم سے پہلے ہوٹل پہنچ گئے۔
مہران ہوٹل | کراچی کے ہوٹلوں میں بے حد ہجوم رہتا ہے، اس لئے مندوبین کو انٹرکونٹی نینٹل اور مہران دونوں درجۂ اول کے ہوٹل ہیں اور پاس پاس ہیں اُن میں تقسیم کر دیا گیا، میرا قیام مہران کے کمرہ نمبر ۱۰۱ میں ہوا، ہوٹل پہنچتے پہنچتے ساڑھے بارہ ہو گئے تھے، مونا کا مکان ہوٹل سے قریب تھا اور اُن کے پاس کار بھی تھی۔ اس لئے سہولت یہ تھی کہ کانفرنس کے پروگرام کے دوران اگر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بھی فرصت ہوئی تو مونا کار لے کر آ گئے اور مجھے گھر لے گئے، لاہور میں یہ سہولت نہیں تھی۔ ایک بجے کے قریب کل صبح کی ملاقات کے وعدہ پر سب رخصت ہوئے اور میں پڑ کر سو گیا۔

صبح ناشتہ پر سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب اڈیٹر معارف سے ملاقات ہوئی تو بڑی خوشی ہوئی کہ اُن کا قیام بھی اسی ہوٹل میں تھا، اس وقت سے کانفرنس کے ختم ہونے تک اکثر مواقع پر میرا اور اُن کا ساتھ رہا اور ہم مذاقی و ہم مشربی کے باعث یہ صحبتیں پُر لطف رہیں البتہ اب دل کو ایک آزار یہ لگ گیا ہے کہ انھیں دیکھتے ہی بے ساختہ شاہ صاحب (معین الدین احمد ندوی مرحوم) کی یاد تازہ ہوتی اور تڑپا جاتی ہے۔

کانفرنس | آج ۱۲ مارچ نو بجے صبح سے کانفرنس کا انعقاد حبیب بنک پلازا کی نہایت شاندار عمارت کی بائیسویں منزل میں تھا۔ یہ بڑی پُر فضا اور دل کش منزل ہے، پورا کراچی شہر یہاں سے نظر آتا ہے وقت مقررہ پر ہم وہاں پہنچے تو ہال اگرچہ زیادہ بڑا نہیں ہے، بھرا ہوا تھا، آج کل پرنس آغا خان یہاں آئے ہوئے تھے۔ اجلاس اُن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قرآنِ مجید کی تلاوت کے بعد حسبِ معمول پہلے حکیم محمد سعید صاحب نے انگریزی میں مختصر افتتاحی تقریر کی، پرنس آغا خان نے ایک سنجیدہ اور معقول تقریر کی، انھوں نے کہا: اسلام خدا کا آخری پیغام ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیا

والمرسلین تھے۔ اور قرآن کے بعد اب کوئی اور کتاب سماوی آنے والی نہیں ہے، اس بنا پر آج جدید تہذیب نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں ہم کو اُن کا حل قرآن اور سیرت مقدسہ کی روشنی میں ڈھونڈنا اور تلاش کرنا ہوگا۔ یہ کام بہت اہم اور ضروری ہے اور اسے جلد ہونا چاہیئے، حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں، وقت کا کاروان برق رفتاری سے آگے بڑھتا جا رہا ہے، اب ہمارے سامنے صرف دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ہم اپنے آپ کو موجوں کے حوالہ کر دیں اور دنیا جس روش پر چل رہی ہے ہم بھی آنکھیں بند کر کے اسی روش پر چل پڑیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنا ایک مقام پیدا کریں اور اُس پر جم جائیں، اگر ہم نے پہلی صورت اختیار کی تو ہم خود بھی تباہ و برباد ہوں گے اور دوسروں کو بھی اُس تباہی سے نہیں بچا سکیں گے جو ایک الادینی اور خالص مادی تہذیب کا لازمی مقدر ہے، البتہ اگر ہم نے دوسری صورت اختیار کی اور جدید تہذیب کو ایک نیا اور روحانی موڑ دے دیا تو ہم خود بھی محفوظ اور صحیح سلامت رہیں گے اور انسانیت کی بھی ایک عظیم خدمت انجام دے سکیں گے جو خدا کی طرف سے عائد کردہ ہمارا فریضہ ہے۔"

مولانا کوثر نیازی کا مقالہ | اس کے بعد مولانا کوثر نیازی کا پُر مغز اور مدلل مقالہ ہوا جو مبسوط و مفصل بھی تھا۔ مقالہ انگریزی، اُردو اور عربی تینوں زبانوں میں چھپا ہوا تھا۔ لیکن مولانا نے اسے عربی میں پڑھا۔ عنوان "پیغمبر انقلاب" تھا۔ اس میں پہلے اسلام سے پہلے دنیا کی مختلف قوموں کے عموماً اور عرب کے جو اخلاقی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی حالات و معاملات تھے ان سب کا وسیع النظری کے ساتھ تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا تھا، اس کے بعد یہ دکھایا گیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مبعوث ہو کر ان حالات میں کیسا عظیم انقلاب پیدا کیا کہ زندگی کا کوئی ایک شعبہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ اسی انقلاب نے جو عالمگیر تھا اور ہمہ گیر بھی تاریخ اور فکر انسانی کو ایک نیا موڑ دیا، اس نے

ایک عجیب وغریب معاشرہ پیدا کیا جو عمل، اخلاق اور کردار کے اعتبار سے ایک مثالی معاشرہ تھا اور دوسری جانب اُس کے ذوقِ علم وتحقیق کا یہ عالم تھا کہ اُس نے انفس وآفاق اور کائناتِ عالم کے سربستہ رموز واسرار کی گرہ کشائی کی، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ انقلاب پیدا کرکے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صالح فکر وعمل کے لئے جو قدریں متعین کی ہیں وہ اس درجہ لازوال، ابدی اور حقیقی ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لے کر اب تک پوری دنیا میں کوئی اصلاحی تحریک ایسی پیدا نہیں ہوئی جس پر اسلام کی چھاپ نہ ہو، مولانا نے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے متعدد اہم اور موثر دلائل پیش کئے اور آخر میں اپنا مقالہ The Glory of Mohammad مصنفہ سرفلپ گبر کے اس اقتباس پر ختم کیا۔

" اسلام جو بجا طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لایا ہوا دین ہے اُس نے انسانی تہذیب وتمدن اور اخلاقیات کے عروج وترقی کے لئے جو کام کیا ہے وہ اُن تمام مذاہب کے کاموں سے زیادہ ہے جو تخلیقِ انسانی سے لے کر اب تک انسان کی روح کو گرماتے رہے ہیں "

غرض کہ پورا مقالہ بڑی دلچسپی اور توجہ سے سنا گیا، جو حضرات عربی سے واقف نہیں تھے وہ انگریزی اور اُردو ترجمہ پڑھتے رہے، اس مقالہ پر یہ نشست ختم ہوگئی اور کافی کے لئے وقفہ ہوگیا، سب لوگ اس سے بھی اوپر کی منزل یعنی حبیب بنک پلازا کی ۲۳ ویں منزل میں جو آخری منزل ہے اُس میں چلے گئے، یہاں پہنچ کر مجھ کو نیویارک امریکہ کا اسکائی اسکریپر اور ٹوکیو (جاپان) کا گھومنے والا ٹاور یاد آگیا۔ میں نے ان دونوں کی سیر کی ہے اور اُس وقت جو لطف آیا تھا وہ اب تک یاد ہے، یہ کافی بہت پُرتکلف تھی مگر اپنی عادت کے مطابق مجھے صرف کافی کی ایک پیالی پر اکتفا کرنا پڑا، کیونکہ اب واسطہ پشاور کی توبہ شکن آب وہوا سے نہیں کراچی کی احتیاط طلب آب وہوا سے تھا وشتان بینہما۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب | سوا دس بجے دوسری نشست شروع ہوئی تو مقالات بہت تھے اور وقت بہت کم یعنی پونے دو گھنٹے، اس لئے متعدد مقالات جن کا پروگرام میں تذکرہ تھا بالکل نہیں پڑھے گئے اور جو پڑھے بھی گئے تو وہ ادھورے رہے، اسی نشست میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا مقالہ ہونا تھا اس کا حشر بھی یہی ہوا۔ مقالہ اُردو میں اسلام کی رواداری پر کافی طویل اور مفصل تھا۔ مگر وقت صرف آٹھ منٹ دیا گیا تھا۔ اس لئے جب اُن کی باری آئی تو میرے مشورہ کے مطابق انھوں نے دو چار جملے نفس مقالہ کے متعلق کہے اور باقی وقت دار المصنفین کے تعارف اور سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں اُس کی خدمات کے تذکرہ پر صرف کر دیا، ڈاکٹر یوسف نجم الدین اور مسٹر مسرت حسین زبیری کے مختصر مقالات بھی اسی نشست میں ہوئے۔

دوسرے دن یعنی ۱۳ / مارچ کو کانفرنس کا انعقاد کوئٹہ بلوچستان میں ہونا تھا لیکن چوں کہ وہاں کا موسم خراب تھا اور غالباً اس لئے بھی کہ وہاں کے سیاسی حالات قابلِ اطمینان نہیں تھے۔ یہ پروگرام ملتوی ہو گیا، اس لئے اس دن کانفرنس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ البتہ سوشل پروگرام جاری رہا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

۱۴ / مارچ کو کانفرنس کا آخری اجلاس نو بجے حبیب بنک پلازا کی بلڈنگ اور ۲۲ ویں منزل پر پھر شروع ہوا اس میں سب سے اچھی، موثر اور ٹھوس تقریر مسٹر اے کے بروہی کی ہوئی، موصوف ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں اور اپنی لیاقت و قابلیت، وسعتِ مطالعہ، سنجیدگیٔ فکر اور قانونی مہارت کے لئے مشہور و معروف ہیں، تقریر کا موضوع "پیغمبر اسلام کا پیغمبرانہ مشن" تھا۔ اسلوبِ بیان جدید اور ماڈرن ذہن کی استعداد فہم و ادراک کے مطابق تھا مگر سرچشمۂ فکر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفہ اور علم الکلام تھا۔ سب حضرات اس سے کافی محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد کافی کا وقفہ ہو گیا، وقفہ کے اختتام پر دوسری نشست شروع ہوئی تو اُس میں حسبِ ذیل نا تمام مقالات

ہوئے: "طبی اخلاق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں" ڈاکٹر ڈیوڈ بیلگم (امریکہ) علم کی دو قسمیں: روح کے لئے مذہب اور جسم کے لئے طب" ڈاکٹر پینی لوپ جانسٹن (برطانیہ) "اسلامی قوانین کی ناقابلِ تغیر اور لچکدار نوعیت" جسٹس قدیر الدین احمد (پاکستان) "پیغمبر بے مثال" سید ہاشم رضا (پاکستان) "اسلام اور مذہبی رواداری" ڈاکٹر ایم۔او۔اے عبدل (نائجیریا) پیغمبر اسلام اور جدید دور کے جرائم کے معاملات و مسائل" مولانا ارشاد الحق تھانوی" "قرآن و سنت کا باہمی رشتہ" ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن ایڈوکیٹ (پاکستان) "پیغمبر اسلام امن اور سلامتی کے قاصد کی حیثیت سے" مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (پاکستان) مفتی صاحب ضعف اور علالت کے باعث خود نہیں آسکے تھے، اُن کے فرزند ارجمند مولانا محمد تقی عثمانی نے یہ مقالہ عربی میں پڑھا، "پیغمبر اسلام موجودہ دور سائنس کے لئے ایک عہد آفرین شخصیت کی حیثیت سے" ڈاکٹر سید سبط نبی نقوی (پاکستان) "جاپان میں اسلام" ڈاکٹر عبدالکریم ساتو (جاپان) "مورشیس میں اسلام" مسٹر حسین د اہل (مورشیس) "پیغمبر اسلام اور تعلیم" ڈاکٹر محمد سلطان (سوڈان) "قرآن اور سائنس کی تعلیم" ڈاکٹر وارث علی ترمذی۔

ڈیڑھ لاکھ ریال کے پانچ انعامات | اب کانفرنس ختم ہوگئی تو اس موقع پر مکہ مکرمہ کے رابطہ العالم الاسلامی کے سکریٹری شیخ محمد صالح القزاز نے اعلان کیا کہ رابطہ ڈیڑھ لاکھ ریال کے پانچ انعامات حسب ذیل ترتیب سے اُن لوگوں کو تقسیم کرے گا جن کے مقالات سیرت نبوی پر سب سے بہتر ثابت ہوں گے۔

پہلا انعام: پچاس ہزار ریال

دوسرا انعام: چالیس ہزار ریال

تیسرا انعام: تیس ہزار ریال

چوتھا انعام: بیس ہزار ریال

پانچواں انعام : دس ہزار ریال۔

شرائط | ان انعامات کے شرائط مطلوبہ یہ ہیں :۔

(۱) بحث تاریخی حوادث و واقعات کے مرتب بیان کے ساتھ مکمل ہو (۲) جدید ہو، پہلے سے مطبوعہ نہ ہو، (۳) مقالہ نگار کو سیرتِ نبوی کے تمام مطبوعہ اور مخطوطہ آخذ و مراجع کا حوالہ دینا چاہیئے جن پر مقالہ مبنی ہو (۴) مقالہ نگار کو اپنا پورا سوانحی خاکہ لکھنا چاہیئے، (۵) مقالہ واضح اور روشن ٹائپ ہو، (۶) مقالہ کی زبان عربی ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور زندہ زبان بھی۔ (۷) مقالات کے پہنچنے کی آخری تاریخ یکم محرم الحرام ۱۳۹۷ھ ہے، اس کے بعد کوئی مقالہ قبول نہیں کیا جا سکے گا، (۸) مقالات اس پتہ پر روانہ کئے جائیں: سکریٹری۔ رابطۃ العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ۔ (۹) مقالات سر بمہر ہونے ضروری ہیں۔

جج کمیٹی | ایک کمیٹی اس کا فیصلہ کرے گی کہ انعام کا مستحق کون اور کس درجہ کا ہے، کمیٹی کے ارکان :۔

(۱) شیخ حسن عبد اللہ آل الشیخ وزیر تعلیم، مملکت سعودیہ
(۲) شیخ عبد اللہ بن حمید چیف جسٹس مملکتِ سعودیہ
(۳) شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز صدر مفتی مملکتِ سعودیہ
(۴) مولانا کوثر نیازی وزیر امور دینیہ و اوقاف حکومتِ پاکستان۔
(۵) شیخ ڈاکٹر عبد الحلیم محمود شیخ الجامع الازہر۔
(۶) مولانا ابو الحسن الندوی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ،
(۷) مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، پاکستان،

ترکی کا اعلان | اس موقع پر ترکی کے وزیر تعلیم نے اعلان کیا کہ آئندہ سال اُن کا ملک اسی نوع کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے منعقد کرنے کا شرف حاصل کرے گا۔

تجاویز | شام کو پانچ بجے انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل میں مولانا کوثر نیازی کی صدارت میں مندوبین

کا ایک جلسہ ہوا جس کا مقصد اُن تجاویز پر غور کرنا تھا جو مختلف حضرات کی طرف سے وزارتِ اوقاف وامور مذہبی کو وصول ہوئی تھیں، یہ تجاویز مقتبنے منہ اتنی باتیں کے مصداق بڑی کثرت سے تھیں۔ تاہم بعض تجاویز بہت اہم تھیں، مثلاً شیخ الجامع الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود کی تجویز: تمام اسلامی ممالک سے سفارش کی جائے کہ وہ اسلامی شریعت کا نفاذ کریں، باہم اسلامی اتحاد اور یگانگت پیدا کریں، سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کریں، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی فلم نہ بننے دیں، عربی زبان کی تعلیم کو عام کریں، بلجیم کے پروفیسر جان نیپرٹ (Prof: Jan Knappert) کی تجویز: اسلامک اسٹڈیز کی ایک کانگرس ہر سال منعقد ہو تو اس مضمون کے علما ایک دوسرے سے ہر سال مل کر استفادہ وافادہ کریں" یہ اور دوسری سب تجاویز جب پڑھ کر سنادی گئیں تو ان پر کسی قسم کے بحث ومباحثہ کے بغیر مولانا کوثر نیازی کی تجویز کے مطابق یہ سب تجاویز ایک کمیٹی کے حوالہ کردی گئیں اور مولانا کو اختیار دیا گیا کہ وہ کمیٹی کے فیصلوں کا اعلان کردیں، اس کے بعد مولانا نے بحیثیت صدر مجلس کے چند اعلانات کئے جن میں ایک یہ اعلان بھی تھا کہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا مستقل سکرٹریٹ پاکستان میں قایم رہے گا، نیز یہ کہ کانفرنس میں جو مضامین پڑھے گئے ہیں وہ اور جو نہیں پڑھے جا سکے وہ بھی، سکرٹریٹ کی طرف سے عنقریب کتابی شکل میں شایع کئے جائیں گے، آخر میں امریکہ کے ڈاکٹر عبدالرؤف نے سب مندوبین کی طرف سے حکومت پاکستان اور ہمدرد فاؤنڈیشن مولانا کوثر نیازی اور حکیم محمد سعید صاحب کا پُرزور دلی شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس قدر اہم اور تاریخ میں اپنی نوعیت کی منفرد کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام وانتظام کیا اور مندوبین کی خاطر تواضع اور اُن کی راحت رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس پر کانفرنس ختم ہوگئی،

<u>کراچی میں سوشل پروگرام</u> کراچی پاکستان کا عظیم الشان اور نہایت وسیع شہر ہے اور ربیع الثانی دنوں میں شہر میں جگہ جگہ عید میلاد النبی کے جلسے بڑے پیمانوں پر ہو رہے تھے، جلوس نکل رہے تھے

شہر میں چراغاں ہو رہا تھا، اس بنا پر ہماری کانفرنس کا سوشل پروگرام بھی بہت متنوع اور نہایت وسیع رہا۔ اس پروگرام کا آغاز ۱۲ ر مارچ کو ایک نہایت پر تکلف لنچ سے ہوا۔ یہ لنچ مہران ہوٹل میں ہی علماء کی عوامی پارٹی کی طرف سے دیا گیا تھا، لنچ سے پہلے جناب قاری محمد الیاس صاحب نے تلاوتِ کلامِ پاک کی، پھر مولانا ارشاد الحق صاحب تھانوی نے انگریزی میں استقبالیہ تقریر کی، اُس کے جواب میں کویت کے شیخ یوسف الرفاعی نے مندوبین کی طرف سے شکریہ میں مختصر تقریر کی، پھر کھانا ہوا۔ قاری محمد الیاس صاحب اور اُن کے پورے خاندان سے میرے دیرینہ اور عزیزانہ تعلقات ہیں، انھیں تعلقات کی بنا پر انھوں نے مجھ سے اس وقت کہا کہ آج شب میں لیاقت آباد میں (جو مہاجرین کی ایک نہایت وسیع اور اہم بستی ہے) عید میلاد النبی کا مشہور و معروف جلسہ ہے جس میں ڈیڑھ دو لاکھ سے کم مردوں اور خواتین کا اجتماع نہیں ہوتا، اہل جلسہ کا اصرار ہے کہ آپ اس جلسہ میں ضرور آئیں اور تقریر کریں، میں نے ہامی بھرلی لیکن ہوا یہ کہ مغرب کے بعد مونا اور مسعودہ آگئے اور میں اُن کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اُن کے گھر چلا گیا، وہاں کچھ اور مرد اور خواتین جو میرے اعزہ میں موجود تھے، اُن سے باتوں میں ایسا مشغول ہوا کہ وقت کی خبر ہی نہ رہی، آخر نو بجے کے قریب جب ہوٹل واپس آیا تو یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ جلسہ میں میری تقریر کا اعلان ہو چکا تھا اور قاری محمد الیاس دو مرتبہ کار لے کر ہوٹل آچکے تھے، اس ناگہانی وعدہ خلافی کی ندامت اور شرمندگی اب تک ہے۔ اللہ معاف فرمائے۔ (باقی)

گزارش

خریداری بُرہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت منی آرڈر کوپن پر برہان کی چیٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں، نہ ہو اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اور بعض حضرات تو صرف دستخط ہی کافی خیال کرتے ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

مولانا محمد عبداللہ طارق رفیق ندوۃ المصنفین

سیرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول ودوم یکجا مجلد۔
مجموعی صفحات ۶۶۲، کتابت وچھپائی خاصی، سائز کلاں (۲۰×۲۶/۸)
مرتب مفتی عزیز الرحمن صاحب بجنوری، قیمت ہر دو جلد ۳۰/-
ناشر چند اہل خیر حضرات۔ پتہ: مدنی دار التالیف بجنور (یوپی)

سیرتِ نبوی پر جو کتابیں شایع ہو چکی ہیں ناقابلِ شمار ہیں، ان میں بہت ضخیم بھی ہیں اور چھوٹے کتابچے بھی ہیں، اسی طرح بہت اونچا درجہ رکھنے والی اور بہت شہرت رکھنے والی بھی ہیں اور معمولی قسم کی غیر مستند بھی بہت ہیں۔ اوسط درجہ کی کتبِ سیرت میں علامہ سید جمال الدین محدث کی "روضۃ الاحباب فی سیرۃ النبی والآل والاصحاب" کی ایک زمانہ میں بڑی شہرت و مقبولیت رہ چکی ہے اور بہت سے بلند پایہ علماء نے اس کو بے حد پسند کیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے اسے سیرت کی بیشتر کتابوں سے بہتر قرار دیا ہے، اس کے مصنف علامہ سید جمال الدین بڑے محدث اور ایک دوسرے مشہور محدث میرک شاہ کے والد اور مشکوۃ المصابیح کے راویوں میں ہیں، ملا علی قاری نے شرح مشکوۃ کے لئے مشکوۃ کے جن چند نسخوں کو بنیاد بنایا ہے ان میں ایک نسخہ سید جمال الدین محدث کا بھی ہے جس پر ان کے حواشی ہیں۔

ہندوستان میں اس کتاب کے بہت سے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں جن میں سے دو تین نسخے تبصرہ نگار کی نظر سے بھی گزرے ہیں، آج سے ایک صدی قبل یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہوئی اور کچھ ہی عرصے بعد نایاب ہوگئی اور غالباً اسی لئے ایک زمانہ میں اس قدر شہرت رکھنے والی کتاب آج غیر معروف ہو کر رہ گئی ہے

مؤلفؒ نے اس کتاب کو تین دفتروں میں مرتب کیا ہے، اور جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں ہے یہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت نہیں بلکہ آپ کی ازواج مطہراتؓ اور اولادِ اطہار اور صحابۂ کرام بلکہ تابعین اور اس سے آگے بڑھ کر تبع تابعین اور محدثین مشہورین سب کی مکمل تاریخ ہے۔ کتاب کا نام بھی اس وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ اچھا تھا کہ اصل کی طرح ترجمہ کے نام میں بھی اس کی رعایت رکھی جاتی۔

اس کتاب کے ساتھ تمام خوبیوں کے باوجود ایک سانحہ یہ ہے کہ اس کے نسخوں میں بہت اختلاف و الحاق اور تحریف و تصحیف ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا ہے کہ "اگر روضۃ الاحباب کا کوئی نسخہ ایسا دستیاب ہوجائے جو تحریف و الحاق سے خالی ہو تو سیرت پر لکھی ہوئی تمام کتابوں سے بہتر ہے" ——— اور کیا عجب ہے کہ یہ تحریف و الحاق ہی اب تک ارباب ذوق کی عام بے توجہی کا سبب ہو۔

یہ کتاب فارسی زبان میں تھی مفتی عزیز الرحمان صاحب نے جو اہلِ علم کے حلقوں میں جانے پہچانے اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اس کو اردو کا جامہ پہنا کر اردو داں حضرات کے لئے قابلِ استفادہ بنا دیا ہے جگہ جگہ مترجم نے حواشی بھی لکھے ہیں جن میں کہیں تکمیل مبحث کے لئے کوئی روایت نقل کی ہے کہیں ناظرین کو مضمون کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے اور کہیں مسلک حنفی کی تائید کی ہے جس میں بعض مقامات پر مناظرانہ رنگ آتے آتے رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر تعبیر میں بھی درشتی آگئی ہے مثلاً جلد دوم صفحہ ۱۳ کی ساتویں سطر یا صفحہ ۹۲ کی ۱۹ ویں سطر۔ ترجمہ کی زبان ایسی ہے کہ اس میں

سلاست کی ابھی بہت گنجائش ہے، مترجم موصوف سے جس پختہ قلم اور شگفتہ و رواں عبارت کی توقع ہونی چاہئے تعجب ہوا کہ وہ اس میں کیوں نہیں ہے۔

بعض مقامات پر ترجمانی میں بھی چوک ہوتی ہے مثلاً حصہ دوم صفحہ ۸۰ پر حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کے مشہور قصیدہ "بانت سعاد" کو ان کے بھائی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے ص ۱۸۰ پر صاحب تلخیص مغازی کی طرف ایک روایت منسوب کی گئی ہے حالانکہ اس روایت کی طرف انھوں نے برائے تردید صرف اشارہ کیا ہے اصل روایت انھوں نے اس سے اوپر ذکر کی ہے۔ دوسری ہی جلد میں صفحہ ۲۷۲ پر قاضی عیاض مالکی کے ایک قول کے متعلق لکھا گیا ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس سے انکار کیا ہے، حالانکہ اصل کتاب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حجر نے اس کو تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ قاضی عیاض کی یہ تاویل مستبعد نہیں ہے۔ یہ تمام مقامات اصل کتاب میں درست ہیں۔

کتاب کے تعارف میں مترجم نے صفحہ ۴ پر لکھا ہے کہ وہ اس کے مستند ہونے کے لئے اس قدر کافی ہے کہ مرقاۃ میں ملا علی قاری نے نہایت فخر کے ساتھ جگہ جگہ اس کا حوالہ دیا ہے اور دلیل میں پیش کیا ہے" یہاں ہمارے فاضل مترجم کو سہو ہوا ہے، ملا علی قاری کی مرقاۃ میں جگہ جگہ حوالے اس کتاب کے نہیں ہیں بلکہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ المصابیح پر بہت سے حواشی لکھے ہیں ملا علی قاری ان حواشی کا حوالہ دیتے ہیں۔

معجزات کے بیان میں مصنفؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کا ذکر کیا ہے فاضل مترجم نے حاشیہ میں اس پر گفتگو کی ہے اور جو حدیث اس سلسلہ میں ماخذ ہے ملا علی قاری کے حوالے سے اس کا موضوع ہونا بھی خود ہی لکھ دیا ہے، لیکن اس کے باوجود اخیر میں ایک غیر ذمہ دارانہ بات بھی لکھ ڈالی "لیکن متفرق مطالعہ کی بنا پر جہاں عدم سایہ کی تائید ہوتی ہے وہاں اگر معجزہ کے طور پر احیاناً اس کو تسلیم کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں" (جلد ۲ صفحہ ۲۹) کس قدر عجیب طرز استدلال ہے، جب روایت بے بنیاد ہے تو معجزے کے طور پر ہی کیوں تسلیم کر لیا جائے؟ کیا معجزات بلا دلیل تسلیم کر لئے جاتے جا سکتے ہیں؟ قریب قریب یہی طرز استدلال ایک اور جگہ ج ۲ ص ۲۹۴ پر بھی ہے۔ ص ۳۲۶ پر نماز چاشت کے متعلق حاشیہ میں ہے کہ "حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ اس کا انکار کرتی ہیں بعض حضرات نے چاشت کی نماز کو بدعت قرار دیا ہے" اتنے پر مترجم کا خاموش ہو جانا شبہ پیدا کرتا ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے، یا کم از کم مترجم کا رجحان اسی طرف ہے حالانکہ جمہور اہل علم کا مسلک

یہ نہیں ہے حضرت عائشہؓ وغیرہ کے انکار کی علماء محققین نے تاویل کی ہے حافظ زکی الدین منذری اور علامہ زیلعی نے اس پر مدلل کلام کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۲۷)

کتاب کے صفحہ ۶۰، ۲۴۷، ۲۷۲ (جلد اول) کا اصل سے مقابلہ کرکے اندازہ ہوا کہ ترجمہ میں حذف و تلخیص بھی ہوئی ہے جس میں بعض جگہ مصنف کی مراد بھی بدل گئی ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اصل کتاب ہی کے نسخوں میں اختلاف و تصحیف بہت ہے اس میں ترجمہ کی کتابت کی غلطیوں کا اور اضافہ ہو گیا ہے، معمولی اور عام غلطیوں سے قطع نظر صحابہ کرام اور دیگر متعلقہ اشخاص کے ناموں میں بہت سی غلطیاں ہیں جن کو معمولی نہیں کہا جا سکتا، مثلاً ج ۲ ص ۶ پر حماس کا جماش ج ۲ ص ۵۷، ص ۸۲ اور ص ۳۶۸ پر ابن خطل کا ابن حنظل بن گیا ہے، ص ۶۷ پر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا نام تین جگہ تین ہی طرح آیا ہے ان میں ایک صحیح ہے۔ ص ۳۰ پر حبابہ دو جگہ آیا ہے صحیح صبابہ صاد سے ہے۔ اسی صفحہ پر ایک نام مثیلہ آیا ہے صحیح نمیلہ (ن م ی ل ہ) ہے، جیسا کہ الاصابہ ج ۶ ص ۲۵۵ اور خود اصل کتاب میں ہے۔ ص ۹۷ پر طلحہ آیا ہے صحیح طلاطلہ ہے جیسا کہ سیرت کی دیگر کتابوں کے علاوہ اصل کے نسخہ میں بھی ہے ص ۱۰۹ پر درید بن عثمہ کا زید بن صمہ بن گیا ہے ص ۹۷ پر طفیل دوسی کے دال واو کو کاتب نے واؤ دین (ڈبل کومہ) سمجھ کر نقل کیا ہے اس لئے وہ عجیب سا لفظ بن گیا ہے۔ حافظ ابن عبد البرؒ علوم حدیث کے مشہور امام ہیں ان کا نام "ابن عبداللہ" چھپا ہے، اصل کتاب میں " مالکی کہ صاحب کتاب استیعاب است" بھی تھا اگر اس کا بھی ترجمہ ہو جاتا تو کم از کم ایک صاحب علم کے لئے اس غلطی کا پکڑنا آسان تھا لیکن شاید بغرض اختصار یہ نہیں لکھا گیا، نتیجہ یہ کہ یہ نام "ابن عبداللہ" ہی سمجھا جاتے گا اور اہل علم کو بھی اس پر متنبہ ہونا مشکل ہے۔ جلد اول میں ص ۳۰۵ پر اخنس بن شریق کا اغنس بن شریف بن گیا ہے۔ ج ۲ ص ۹۴ پر ایک سطر کی کتابت مکرر ہو گئی ہے۔

یہ تمام اغلاط اسی ایڈیشن کے نہیں ہیں لہذا سب کے لئے فاضل مترجم و ناشر ہی ذمہ دار نہیں لیکن کاپیوں کی تصحیح اور اس سے بھی پہلے دوران ترجمہ اگر دیگر کتب سیرت سے مدد لی جاتی تو ان اغلاط سے بچا جا سکتا تھا۔

کتابت کے سلسلے میں بھی ہمارے فاضل مترجم کو ذمہ دار طباعت ہونے کی حیثیت سے کافی پریشانی ہوئی جیسا کہ دوسری جلد کے شروع میں انھوں نے کاتبوں کی ستم ظریفی کا حال لکھا ہے چنانچہ خط پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس کو تین کاتبوں نے لکھا ہے، اس بے ترتیبی کا اثر کتاب میں ظاہر ہونا ہی تھا چنانچہ صفحہ ۵ صفحہ ۴ سے پہلے لگ گیا ہے، دوسری جلد میں ص ۱۲۰ کے بعد ص ۱۳۹ پڑ گیا ہے اور یہ

غلطی آخر کتاب تک گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۷۶ نہیں لکھی۔ اس بالارادہ یا بلاارادہ غلطی کے نتیجہ میں ہمارے مترجم صاحب کو دس صفحات کی اُجرت زائد دینی پڑی ہوگی۔

فاضل مترجم کو شروع میں مصنّف کے حالات کا علم نہیں ہوا تھا جیسا کہ انھوں نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے اب محترم ایڈیٹر صاحب کے نام انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ حالات مل گئے ہیں جو اگلی جلد کے شروع میں درج کر دئے جائیں گے۔

تبصرہ طویل ہوا جاتا ہے مگر اخیر میں ایک اور بات کہہ دینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ مصنّفِ کتاب علّامہ سید جمال الدین محدث کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان مصنفین میں شمار کیا ہے جنھوں نے بعض شیعہ مصنفین سے سنی سمجھ کر روایات نقل کرلی ہیں لکھتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر سے حضرت علی کی بیعت کے سلسلے میں اور شہادتِ حضرتِ عثمان کے سلسلے میں اور چند مقامات پر انھوں نے ایسی روایات درج کردی ہیں، (ملاحظہ ہو تحفہ اثنا عشریہ ص۳۱ مکائد شیعہ کید پنجاہ ویکم)

اس سلسلہ میں ایک بات اور ذہن میں کھٹکتی ہے، مصنّف نے یہ کتاب میر علی شیر نوائی متوفی ۹۰۶ھ کے حکم بلکہ اصرار سے لکھی ہے جو شاہ حسین مرزا حاکم خراسان کا وزیر تھا یہ خود بہت بڑا فاضل و مصنّف اور اونچے درجہ کا شاعر تھا، اور اس کے حالات سے[1] جہاں تک اندازہ ہوتا ہے یہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا اس لئے کیا بعید ہے کہ اس کتاب میں ایسی روایات مصنّف نے اس کے ایما پر یا اُس کی خوشنودی کی خاطر از خود قصداً درج کردی ہوں واللہ اعلم ہمیں توقع ہے کہ اگر ہمارے فاضل مترجم کی نظر ان چیزوں پر ہوتی تو وہ اس پر مقدمہ میں ضرور توجہ دلاتے اور ایسے مقامات سے ذرا سنبھل کر گزرتے، اب بھی وہ بعض مقامات پر چونکے ہیں چنانچہ ج ۱ ص۱۶۲ پر ایک جگہ تنبیہ کی ہے کہ یہ مقولہ شیعیت سے متاثر معلوم ہوتا ہے، اسی طرح ص۱۸۵ پر مصنّف نے طول بیانی سے کام لیا ہے اس پر بھی مترجم نے بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا اسقام کی طرف اس لئے توجہ دلائی گئی ہے کہ آئندہ جلد میں مزید اہتمام کیا جائے اور اگر زیر تبصرہ جلد بھی دوبارہ چھپے تو اس وقت بھی ان معروضات کا خیال رہے۔ ان چند مسامحات سے قطع نظر فاضل مترجم نے اس میں جو محنت و کاوش کی ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے، کتاب کا تجزیہ بہت عمدہ کیا ہے، تھوڑے تھوڑے حصّوں کی اس طرح عنوان بندی کی ہے کہ ہر حصّہ اپنی جگہ ایک مستقل کتاب معلوم ہوتا ہے۔ حواشی میں بھی خاصی محنت اور کتابوں کی مراجعت کی گئی ہے۔ جناب سیٹھ محمد مصطفیٰ صاحب اور جناب سیٹھ رفیع الدین صاحب کا جذبہ بھی قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں تعاون کیا امید ہے کہ سیرت نبوی کے شائقین اس کتاب کی قدر کریں گے۔

[1] ملاحظہ ہو قاموس المشاہیر از نظامی بدایونی ج ۲ ص۹۶

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ ہمارا یہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈشا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو ازسرِنو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان دہلی

جلد ۷۷ | بابت ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ مطابق نومبر ۱۹۷۶ء | شمارہ ۵

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ہندوپاک میں سفارتی تعلقات قائم ہوئے، امرتسر اور لاہور کے درمیان ریل کی آمد و رفت شروع ہوئی، تجارتی معاہدہ ہوا، اس کے علاوہ اور بھی مختلف طریقوں سے دونوں طرف سے خیرسگالی اور دوستی کے جذبات کا مظاہرہ ہو رہا ہے، ان سب چیزوں کو دیکھ کر اِدھر اور اُدھر دونوں طرف امید توی تھی کہ اب کم ازکم حسب سابق آمد و رفت، رسل و رسائل اور اخبارات و رسائل کے تبادلے اور ان کے آنے جانے میں سہولت ہوگی۔ لیکن افسوس بقول حسرت ؎

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے اخبار الجمعیۃ میں پاکستان کے مشہور روزنامہ نوائے وقت کا ایک شذرہ نظر سے گزرا جس میں لکھا تھا کہ "پاکستان میں ہندوستان کے اخبارات و رسائل کو ڈاکخانہ برائے ممالکِ غیر (FORAIN POST OFFICE) میں روک لیا گیا ہے اور انھیں تقسیم نہیں کیا جارہا ہے۔ کیونکہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس راہ سے مخالفِ پاکستان لٹریچر آرہا ہے"۔ اس شذرہ کے نظر سے گزرنے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد پاکستان میں برہان کے خریداروں اور دوستوں کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ اگست سے "برہان" اُن کو نہیں مل رہا ہے، سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں دفتر برہان میں ایک خط پاکستان کی وزارتِ اوقاف و امور مذہبی کے پریس سکریٹری کا بھی وصول ہوا جس میں شکایت درج تھی کہ "برہان تین مہینوں سے نہیں پہنچ رہا ہے" ہمیں اس خط کو پڑھ کر تعجب اس لیے ہوا کہ اگر وہاں اخبارات اور رسائل کی تقسیم کو گورنمنٹ کے حکم سے روک دیا گیا ہے تو ایک وزارت کے پریس سکریٹری کو اس کا علم لازمی طور پر ہونا چاہیے اور پھر ان کا دفتر برہان کو خط لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا، اِس بنا پر ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ اقدام گورنمنٹ

کے کسی حکم کے بغیر فون پوسٹ آفس کے حکام نے از خود اپنی صوابدید سے کیا ہے، جیسا کہ ہم نے اپنے "سفرنامۂ پاکستان" کی پہلی قسط میں لکھا ہے، اب سے کم و بیش ایک برس پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ یعنی ڈاک خانہ کو جب یہ معلوم ہوا تھا کہ ہندوستان سے بعض فلمیں ناجائز طریقے سے درآمد ہو رہی ہیں تو انھوں نے ڈاک روکنی شروع کر دی، مگر جب ان کے ہاں اس کے انبار لگ گئے اور انھوں نے اس بارے میں گورنمنٹ سے استصواب کیا تو وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے خود حکم دیا کہ ڈاک کو نہ روکا جائے، اور اسے تقسیم کیا جائے، چنانچہ یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور پاکستان میں برہان کے خریداروں اور قدردانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔"

پہلے ہندوستانی فلموں کی ناجائز درآمد کا سوال تھا، اس مرتبہ نوائے وقت کے شذرہ کے مطابق 'مخالف پاکستان لٹریچر' کی درآمد کو ڈاک کے تقسیم نہ ہونے کا سبب بتایا گیا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ہم اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں، امید ہے ان پر ٹھنڈے دل سے سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائیگا

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ جب سے ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ ہوئی صورتحال بالکل مختلف ہے، ایمرجنسی کے نفاذ سے اب تک کسی اخبار یا رسالہ میں، یا کسی کتاب یا پمفلٹ میں ہماری نظر سے کوئی ایسی تحریر ہرگز نہیں گزری جس کو اینٹی پاکستان کہا جاسکے، اس کے برعکس پاکستان کی نسبت کوئی خبر یا کوئی مضمون شائع ہوتا ہے تو اس کا لب ولہجہ معاندانہ یا مخالفانہ نہیں بلکہ ہمدردانہ اور صلح جویانہ ہوتا ہے، کوئی اِکّا دُکّا اور غیر اہم تحریر اگر اینٹی پاکستان ہو تو ہو اور اتنے بڑے ملک میں ایسا ہونا چنداں مستبعد بھی نہیں ہے، ورنہ حق یہی ہے کہ ملک کی عام فضا دوستی اور صلح جوئی کی ہے، اور یہ خود ہم نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ یہاں کے اخبارات میں مسٹر بھٹو کی ایک تقریر کا جو اقتباس شائع ہوا تھا اس میں موصوف نے خود اس کا اعتراف کیا تھا کہ ہندوستان میں ایمرجنسی کے بعد سے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ ختم ہو گیا ہے۔"

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ پروپیگنڈہ اور تنقید میں فرق کرنا چاہیے، مخالف پروپیگنڈہ بیشک بُری شے ہے اور وہ پروپیگنڈہ کرنے والے کے دل کی کپٹ اور اس کے کھوٹ کو ظاہر کرتا ہے لیکن تنقید جو سنجیدہ اور متعین لب و لہجہ میں ہو اس کو گوارا کرنا چاہیے، اس سے احتساب نفس کا موقع ملتا ہے، چنانچہ

ہر ملک میں ایسی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں ملکی گورنمنٹ پر، اسکے کسی ایک طرزِ عمل یا پالیسی پر یا ملک کے کسی ادارے یا شخص پر تنقید گرم یا سرد ہوتی ہے، ایسی کتابیں یا مقالات و مضامین ہرگز اس لائق نہیں ہوتے کہ انکی اشاعت یا اُن کے مطالعے کو ممنوع قرار دیا جائے، جہاں تک پاکستان کے اخبارات و رسائل کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ وہ ہندوستان میں برابر تقسیم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ دفتر برہان میں پاکستان سے کتابیں اور رسالے دونوں موصول ہو رہے ہیں، اس بنا پر ہم پاکستان گورنمنٹ سے مخلصانہ اور پُرزور درخواست کرتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں دوستی اور خیر سگالی کی جو فضا قائم ہوگئی ہے اس کے مطالبات اور تقاضوں کی طرف توجہ کرے ، شک اور بدگمانی سے تعلقات میں بدمزگی اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور اعتماد اعتماد کو جنم دیتا ہے اور اس سے روابط و علائق میں خوشگواری اور استحکام پیدا ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے لوگوں کو پاکستان کا ویزا حاصل کرنے میں پہلے جو دشواریاں پیش آتی تھیں عام شکایت ہے کہ سفارتی تعلقات بحال ہونے کے بعد بھی ان دشواریوں میں کمی نہیں ہوئی اور وہ علیٰ حالہا قائم ہیں۔ حکومتِ پاکستان کو اس طرف بھی توجہ کر کے ویزا دینے کا کوئی ایسا فارمولا تلاش کرنا چاہیے جس سے یہ دشواریاں ختم یا کم از کم کم ہو جائیں، رہا شرح ڈاک کا معاملہ! تو اس پر دونوں حکومتوں کو غور کرنا چاہیے، خصوصاً اس وقت جبکہ دونوں ملکوں میں تجارتی تعلقات قائم ہو گئے ہیں ان تعلقات کا یہ تقاضا بھی ہے کہ جب دونوں ملکوں میں اشیا کی درآمد برآمد بڑھے گی تو اس سلسلے میں جو مراسلت اور خط و کتابت ہو اس کو گراں نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں امید ہے کہ تجارتی معاہدہ یا ثقافتی امور کے سلسلے میں آئندہ جو میٹنگ ہوگی اس میں دونوں حکومتیں شرح ڈاک کے مسئلہ پر بھی عوام کی فلاح اور بہبودی کے نقطۂ نظر سے غور کریں گی۔

جناب طارق مختار کا جو مضمون ابن ایاس پر اکتوبر کے برہان میں شائع ہوا تھا، افسوس ہے اس کے متعلق یہ نوٹ درج ہونے سے رہ گیا کہ یہ مضمون اوریجنل نہیں بلکہ مصطفیٰ زیادہ کی کتاب "المؤرخون فی مصر" کے ایک باب کا ترجمہ تھا۔ قارئین نوٹ کر لیں۔

اجتہاد کا تاریخی پس منظر

اجتہاد کی حقیقت

جناب مولانا محمد تقی امینی صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"اجتہاد" کے لغوی معنی کسی بات کی تحقیق میں انتہائی جدوجہد کرنا۔ کلام عرب میں یہ لفظ اسی جدوجہد میں استعمال ہوتا ہے جس میں محنت شاقہ برداشت کرنی پڑے چنانچہ:

اجتهد فی حمل الرحاء — چکی کا پاٹ اٹھانے میں اس نے جدوجہد کی۔

کہنا صحیح ہے اور:

اجتهد فی حمل خردلة — رائی کا دانہ اس نے اٹھانے میں جدوجہد کی۔

کہنا صحیح نہیں ہے۔

اجتہاد کی تعریف ائمہ مجتہدین نے اجتہاد کی یہ تعریف کی ہے۔

هو استفراغ الجهد وبذل غاية الوسع اما فی درك الاحكام الشرعية واما فی تطبيقها[1]

شرعی احکام کی معرفت حاصل کرنے یا جزئیات پر ان کو منطبق کرنے میں خالی الذہن ہو کر غور و فکر کی انتہائی طاقت صرف کرنا۔

اس طرح اجتہاد کے اصلاً دو مواقع ہیں:۔

(۱) جو مسائل موجود نہیں ہیں ان کا حل دریافت کرنا۔

---

[1] ابو اسحق شاطبی۔ الموافقات ج ۴ کتاب الاجتہاد۔

(۲) جو مسائل موجود ہیں ان کا موقع ومحل متعین کرنا۔

پہلے میں چونکہ نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے اس بنا پر غور وفکر کی زیادہ طاقت صرف ہوتی ہے اور دوسرے میں مسائل موجود ہوتے ہیں صرف موقع ومحل متعین کرکے قابل نفاذ بنانا ہوتا ہے اس بنا پر زیادہ طاقت نہیں درکار ہوتی بلکہ کم ہی سے صورت حال واضح ہوجاتی ہے۔ غالباً اسی فرق کی وجہ سے اجتہاد تام وناقص کی دو قسمیں کی گئی ہیں۔

فالناقص هو النظر المطلق فی تعرّف الحکم وتختلف مراتبه بحسب الاحوال والتام هو استفراغ القوة النظریة حتی یحس الناظر من نفسه عن مزید طلب[1]

ناقص وہ ہے جس میں حکم کی شناخت میں مطلقاً غور وفکر کیا جائے۔ موقع ومحل کے لحاظ سے غور وفکر میں کمی بیشی کے مراتب مختلف ہوتے ہیں تام وہ ہے جس میں غور وفکر کی انتہائی طاقت صرف کی جائے کہ اس سے زیادہ میں مجتہد اپنے کو عاجز محسوس کرے۔

فقیہ کا اجتہاد معتبر ہے

اجتہاد کی پہلی شکل ہو یا دوسری۔ اس میں غور وفکر کی انتہائی طاقت درکار ہوتی ہو یا اس سے کم کی ضرورت ہو۔ دونوں صورتوں میں فقیہ (صاحب فن) کا غور وفکر معتبر ہوگا۔ غیر فقیہ سے اس رسائی اور فنی الہام کی توقع نہیں ہوتی۔ جو اجتہاد کے لیے مطلوب ہے۔

ومن الفقیه احتراز من بذل الطاقة من غیره فی ذالك فانه لیس باجتهاد اصطلاحی[2]

اجتہاد کی تعریف میں فقیہ کی قید سے غیر فقیہ کی محنت وجد وجہد سے احتراز مقصود ہے کیونکہ اجتہاد اصطلاحی میں اس کا شمار نہ ہوگا۔

فقیہ ہر عالم ومفتی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے خاص نظریہ وصلاحیت درکار ہے:

۱؎ ابن بدران دمشقی۔ المدخل الی مذہب الامام احمد بن حنبل۔ عقد نضید فی الاجتہاد والتقلید۔

۲؎ ابن امیر الحاج۔ التقریر والتحبیر ج ۳۔ المقالۃ الثالثۃ فی الاجتہاد۔

الفقیہ العالم الذی یشق الاحکام ویفتش عن حقائقھا ما استغلق منھا[1]	فقیہ وہ عالم ہے جو احکام کا تجزیہ کرتا ان کے حقائق کی تفتیش کرتا اور ان کے مشکل امور کو واضح کرتا ہے۔

فقیہ کے لیے معاملہ فہمی و دنیوی مصلحت شناسی ضروری ہے۔

فقیھا فی مصالح الخلق فی الدنیا[2]	دُنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں کا وہ رمز شناس ہو۔

اس فرق کو عطار و طبیب کے فرق سے سمجھا جا سکتا ہے۔ عطار کا کام زیادہ سے زیادہ اچھی دوائیں جمع کر کے تقسیم کر دینا ہے، جبکہ طبیب کا کام دوا کی جانچ پڑتال کرنا، مرض کا پتہ لگانا اور مرض و مریض کا مزاج معلوم کر کے اس کی مناسبت سے دوا تجویز کرنا ہے۔

قرآن حکیم سے اجتہاد کا ثبوت

اجتہاد کے ثبوت میں قرآن حکیم کی یہ آیتیں پیش کی جاتی ہیں:-

وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُمَا کُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوھَکُمْ شَطْرَہٗ[3]	اور جس جگہ بھی آپ نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیجیے اور جہاں کہیں تم رہو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو۔

مسجد حرام سے دوری کی صورت میں جبکہ وہ نظر کے سامنے نہ ہو اس کی طرف رخ اجتہاد (ظن و تخمین) ہی کی بنا پر ہوتا ہے۔ نماز جیسی اہم عبادت میں جب یہ حکم مسلم ہے تو زندگی و معاشرے کے دیگر مسائل میں بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ[4]	بس اعتبار کرو اے آنکھوں والے۔

فقہی لحاظ سے اعتبار کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے۔

ردّ الشیٔ الی نظیرہ[5]	کسی شے کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانا۔

---

[1] جار اللہ زمخشری۔ کتاب الفائق۔ جزء ثانی۔ فقہ۔ [2] الغزالی۔ احیاء العلوم ج ۱ اللفظ الاول الفقہ۔ [3] البقرہ ع ۱۷۔ [4] الحشر ع ۱۔ [5] ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی اصول السرخسی جزء ثانی باب القیاس۔

یعنی جو حکم اس کی نظیر کا ہے وہی حکم اس شے کا قرار دینا۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ [1]

ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) اتارا تاکہ جو چیز لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے آپ ان کے سامنے بیان کردیں تاکہ خود وہ غور و فکر کریں۔

فقہی بصیرت کا ثبوت

"لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ" کے ذریعہ ایسے تمام لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن اخذ و استنباط یا اجتہاد میں انہیں کا غور و فکر معتبر ہوگا۔ جو تحقیق و تدقیق کرنے والے ہوں اور جنہیں فقہی بصیرت حاصل ہو جیسا کہ ان آیتوں سے ظاہر ہے

وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ [2]

اگر اس کو اللہ کے رسول اور اہل علم تک پہنچا دیتے تو ان میں جو استنباط کرنے والے ہیں وہ اس کو سمجھ جاتے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَآئِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ [3]

کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی تو دین میں فہم و بصیرت حاصل کرتی۔

دنیوی مصلحت شناسی کا ثبوت

دنیوی مصلحت شناسی و معاملہ فہمی کی مزید صلاحیت کا ثبوت اس آیت میں ہے:

فَفَھَّمْنٰھَا سُلَیْمٰنَ وَکُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا [4]

(ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو وہ فیصلہ سمجھا دیا حالانکہ دونوں (داؤد و سلیمان علیہما السلام) کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

علم و فضل میں بحیثیت پیغبر حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ برابر تھے لیکن معاملہ فہمی و مصلحت شناسی کا وصف حضرت سلیمان میں زیادہ تھا اسی بنا پر آیت میں ان کی خاص فہم کا ذکر ہے۔ واقعہ اس طرح ہے

---

[1] النحل ع ۶۔ [2] النساء ع ۱۱۔ [3] التوبہ ع ۱۵۔ [4] الانبیاء ع ۵۔

کہ ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ مقدمہ پیش ہوا کہ رات کے وقت ایک شخص کی بکریوں نے دوسرے کی کھیتی کا نقصان کر ڈالا۔ حضرت داؤدؑ نے بکریوں کی قیمت اور کھیتی کے نقصان کا وازنہ کر کے یہ فیصلہ دیا کہ بکریاں کھیت والے کو دیدی جائیں۔ حضرت سلیمانؑ نے جب یہ فیصلہ سُنا تو فرمایا کہ میرے نزدیک بکریاں کھیت والے کے حوالے کر دی جائیں اور وہ اُن سے دودھ اُون وغیرہ کا فائدہ اٹھاتا رہے اور کھیت بکری والے کے سپرد کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ اس کی آبپاشی و دیکھ بھال وغیرہ کر کے پہلے جیسی حالت پہ لے آئے۔ پھر ہر ایک کو اس کا مال واپس کر دیا جائے۔ اس فیصلہ میں چونکہ دونوں کا فائدہ تھا اور نقصان کے تلافی کی شکل بھی تھی اس لیے حضرت داؤدؑ نے اس کو پسند فرما کر اپنے فیصلہ سے رجوع کر لیا۔[۵]

رسول اللہ کی حدیث اجتہاد کا ثبوت

اجتہاد کے ثبوت میں رسول اللہ صلعم کی یہ حدیثیں پیش کی جاتی ہیں :-

عن معاذ ان رسول اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذؓ کو جس
صلی اللہ علیہ وسلم حین بعثہ	وقت یمن کا حاکم بنا کر بھیج رہے تھے تو ان سے
الی الیمن قال کیف تصنع	سوال کیا کہ جب کوئی فیصلہ (مقدمہ) تمہارے
ان عرض لک قضاً قال اقضی	پاس آئے گا تو کیا کرو گے؟ جواب دیا کہ اللہ کی
بما فی کتاب اللہ قال فان لم	کتاب میں جو کچھ ہے اس کے مطابق فیصلہ
یکن فی کتاب اللہ قال فبسنۃ	کروں گا۔ فرمایا اگر اللہ کی کتاب میں نہ ہو تو؟
رسول اللہ قال فان لم یکن	کہا کہ رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق فیصلہ
فی سنۃ رسول اللہ قال	کروں گا۔ فرمایا اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ
اجتھد رائی ولا آلو قال فضرب	ہو تو کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کروں گا کہا کہ پیکر

۵ ابن عربی احکام القرآن ج ۳ - الانبیاء ع ۶ -

صدری ثم قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ[1]

رسول اللہ خوش ہوئے اور (اظہار خوشی کے لیے) میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو پسندیدہ ہے۔

اس حدیث پر بعض لوگوں نے "سند" کے لحاظ سے تنقید کی ہے جس کا جواب ابن قیمؒ وابن عربی وغیرہ نے دیا ہے[2]۔ اگر روایتی معیار سے اس کو ضعیف تسلیم ہی کر لیا جائے تو درایتی معیار سے اس کا ضعف نہیں باقی رہتا۔ قرآن حکیم کی مذکورہ آیتوں اور رسول اللہ صلعم کی دوسری حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً:

اذا حکم الحاکم فاجتھد ثم اصاب فلہ اجران واذا حکم فاجتھد ثم اخطأ فلہ اجر[3]

حاکم نے جب اجتہاد سے فیصلہ کیا اور درست کیا تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور اگر غلط فیصلہ کیا تو ایک اجر ملتا ہے۔

دوسری روایت میں ہے:

اذا قضی القاضی فاجتھد فاصاب فلہ عشرۃ اجور واذا اجتھد فاخطأ کان لہ اجرا واجران[4]

قاضی نے جب اجتہاد سے فیصلہ کیا اور درست کیا تو اس کو دس گنا اجر ملتا ہے اور اگر غلط فیصلہ کیا تو اکہرا یا دو گنا اجر ملتا ہے۔

اجر و ثواب کا یہ تفاوت غالباً اجتہاد میں خلوص و محنت کے تفاوت کے لحاظ سے ہے جس کا ذکر اجتہاد تام و ناقص میں ابھی ہو چکا ہے۔

---

[1] ابو داؤد۔ کتاب الاقضیہ باب اجتہاد الرائے فی القضاء۔ [2] ابن قیم۔ اعلام الموقعین ج ۱ حدیث معاذ ابن جبل فی الاجتہاد۔ وابوبکر ابن عربی۔ احکام القرآن ج ۱۔ نساء ع ۸ تفسیر یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللہَ الخ۔ [3] بخاری ج ۲ کتاب الاعتصام باب اجر الحاکم اذا اجتھد الخ ومسلم ج ۲ کتاب الاقضیہ باب اجر الحاکم الخ۔ [4] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۱۸۰۔

رسول اللہؐ نے بہ نفسِ نفیس اجتہاد کا دروازہ کھولا

اجتہاد قرآن وحدیث کے بعد اسلامی قانون کا سرچشمہ ہے نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرے کی رہنمائی کا واحد ذریعہ ہے اور ہدایت الٰہی کی تکمیل کا اہم باب ہے، اس بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بہ نفس نفیس اس کا دروازہ کھولا اور بیشمار مواقع پر اجتہاد کرکے اس کے نشیب و فراز سے واقف کردیا، تاکہ بعد کے لوگوں کے لیے اور باتوں کی طرح اس میں بھی آپ کی زندگی کا نمونہ ثابت ہو۔ لیکن "وحیِ الٰہی" سے آپ کا تعلق قائم ہونے اور براہ راست اس سے رہنمائی حاصل کرتے رہنے کی وجہ سے آپؐ کے اجتہاد میں خطا وصواب کا احتمال نہیں باقی رہتا بلکہ دین وشریعت کے متعلق جو کچھ آپ نے اجتہاد کے ذریعہ فرمایا، وہی اس آیت کے عموم میں داخل ہے۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ — جس کو رسولؐ تمھیں دیں اس کو لو، اور جس سے تم کو

وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[1] — منع کریں اس سے باز آجاؤ۔

اجتہادِ رسولؐ کی ایک مثال کے ذریعے وضاحت

رسول اللہؐ کے اجتہاد کو سمجھنے کے لیے طبیب حاذق کے کام میں غور کرنے کی ضرورت ہے جس کی نظر مرض کی قوت، اس کی نوعیت مریض کی عمر جائے رہائش اور موسم نیز دوا و غذا کی قوت ان کی خاصیت واثر اور پرہیز وعلاج سے متعلق تمام باتوں پر ہوتی ہے اور بحران کے لحاظ سے وہ بہت سی ان باتوں کی خبر دیتا جن کو لوگ نہیں جانتے ان باریکیوں کا احاطہ کرتا جن سے وہ لاعلم ہوتے کبھی وہ امور محسوسہ کو مخفی امور کے قائم مقام قرار دیتا ہے۔ مثلاً چہرے کی سرخی اور مسوڑھے سے خون جاری ہونے کو غلبۂ خون کی علامت قرار دیتا ہے۔ کبھی علامت کو بجائے سببِ مرض اور دوا کی مخصوص مقدار کو بجائے ازالۂ مرض قرار دے کر قاعدہ کلیہ وضع کرتا ہے مثلاً جو شخص فلاں دوا یا معجون کو اتنی مقدار میں استعمال کرے گا کہ وہ ہلاک ہوجائے۔ کبھی مرض ومریض کی نوعیت وکیفیت کے پیش نظر نئی دوائیں اور نئے مرکبات تیار کرکے ان کو مخصوص امراض کے لئے تیر بہدف ثابت کرتا ہے، وغیرہ۔

---

[1] الحشر ع ۱

ظاہر ہے ان کاموں کے لیے مجرد علم طب کافی نہیں ہے فنی حذاقت و مہارت درکار ہے کہ وہ مریض و مرض کے پیش نظر اخذ و استنباط اور ریسرچ و تحقیق کر سکے۔

انسان کی نفسی زندگی کا معاملہ جسمانی سے کہیں زیادہ باریک اور جذب و انجذاب کو قبول کرنے والا ہے اس بنا پر لازمی طور سے اس کے مرض و مریض دوا و غذا اور پرہیز و علاج کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے فنی حذاقت و مہارت کافی نہیں ہے بلکہ نورانی شعاعوں کی بھی ضرورت ہے جن کے ذریعے ان مخفی تاروں کا عکس لیا جا سکے جن کو چھیڑے بغیر زندگی کے "ساز" میں "سوز" نہیں پیدا ہوتا اور بہت سے نغمے خاموش رہتے ہیں۔ پھر زندگی خود زندگی سے گریزاں بنتی اور تمدن خود تمدن کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔

شعور نبوت کے ذریعے رسول اللہ کا اجتہاد

یہ نورانی شعاعیں صرف شعورِ نبوت کو حاصل ہیں جن کے ذریعے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے تھے۔ شعورِ نبوت سے مراد علم و حکمت کا نور اور فہم و ادراک کا وہ کمال ہے جو نبوت کے غلغنی و جدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور اس کے لیے لازم ہے۔ یہ "شعور" علم و ادراک کا نہایت اونچا و محفوظ اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ذریعہ سمجھا جاتا ہے، پھر اس کو یہ قوت بھی حاصل ہے کہ برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر خارجی و کسب فیض کرے اور "وحی الہٰی" کی شکل میں وہ علم و ادراک پیش کرے جس کا تعلق خارجی و ماورائی حقیقت سے ہے (شعورِ نبوت کی مزید بحث راقم کی کتاب "حدیث کا درایتی معیار" میں دیکھنا چاہیئے۔)

اس اجتہاد کی بلندی و برتری

ایسی حالت میں لازمی طور سے شعورِ نبوت کے ذریعہ اخذ و استنباط یا اجتہاد دوسروں کے اجتہاد سے بلند و محفوظ ہوتا ہے کیونکہ برتر شعور یا نور سے تعلق قائم ہونے کی وجہ سے اصلاح و وضاحت کا سلسلہ جاری رہتا ہے جو دوسروں کے اجتہاد کو میسر نہیں ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ایها الناس ان الرای انما — اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان مصیبًا ان اللہ کان یریہ وانما ھومنا الظن والتکلف[1]

رائے ما ثبا درست اس لیے ہوتی تھی کہ اللہ آپ کو دکھاتا تھا، ہماری رائے ظن اور تکلف ہے۔

اصلاح و اضافے کی صورت

اصلاح و وضاحت کی صورت مثلاً:

ایک مرتبہ حضرت خولہ بنت ثعلبہ نے "ظہار" کے بارے میں آپ سے سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

ما اراک الا قد حرمت علیہ[2] میری رائے ہے کہ تم اس پر حرام کردی گئی ہو۔

رسول اللہ کی یہ رائے عرب کے مروجہ قانون کے مطابق درست تھی کہ اس میں ظہار کے بعد ہمیشہ کے لیے حرمت ثابت ہوتی تھی۔ لیکن اس قانون میں اصلاح و اضافہ کی ضرورت تھی اس بنا پر قرآن حکیم کی آیتیں ظہار سے متعلق نازل ہوئیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ماں کے مشابہ قرار دے تو وہ اس کے لیے ہمیشہ نہیں بلکہ اس وقت تک حرام ہے جب تک کفارہ نہ دے اور کفارہ دو مہینہ کے لگاتار روزے رکھنا۔ یا طاقت نہ ہونے کی صورت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ عام طور پر مشابہت ماں کی پشت کے ساتھ دی جاتی تھی جیسے انت علی کظھر امی (تو مجھ پر ایسی ہی ہے جیسے ماں کی پیٹھ) اس بنا پر "ظہار" کے ساتھ مشہور ہے ورنہ پشت کے علاوہ کسی ایسے عضو کے ساتھ مشابہت دی گئی جس کا دیکھنا منع ہے تو وہ بھی ظہار کے حکم میں ہوگا۔

آیتیں یہ ہیں جن میں اصلاح و اضافہ ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ

تم میں سے جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کریں (ماں سے مشابہت دیں) تو وہ ان کی ماں

---

[1] ابوداؤد۔ کتاب الاقضیہ باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ۔

[2] قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ تفسیر مظہری پ ۲۸۔ ع ۱۔

اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔىْ وَلَدْنَهُمْ	نہ ہو جائیں گی ان کی مائیں وہی ہیں جنہوں نے
وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ	ان کو پیدا کیا وہ یہ کہہ کر نہایت بیہودہ اور
وَزُوْرًا وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ	جھوٹی بات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اللہ معاف
وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ	کرنے بخشنے والا ہے اور جو لوگ اپنی عورتوں
ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ	سے ظہار کریں۔ پھر اس سے رجوع کریں جو انھوں
رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ	نے کہا تھا تو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام
تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	آزاد کرنا ہے اس سے تم کو نصیحت ہوگی،
خَبِيْرٌ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ	اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے پھر جو
شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ	کوئی غلام نہ پائے تو ہاتھ لگانے سے پہلے
اَنْ يَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ	دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے جو یہ بھی
فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ذٰلِكَ	نہ کر سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا دے یہ
لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	حکم اس لیے ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ کے
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ	تابعدار ہو جاؤ۔ یہ اللہ کی مقررہ حدیں ہیں
عَذَابٌ اَلِيْمٌ [1]	اور کافروں کے واسطے دردناک عذاب ہے۔

ایک بے سود بحث اس موقع پر یہ بحث بے سود ہے کہ نزولِ وحی کے زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت کیا تھی؟ یا رسول اللہؐ ماموربالاجتہاد تھے بھی یا نہیں؟ اگر ماموربالاجتہاد تھے تو آپ سطح نبوت سے اجتہاد کرتے تھے یا سطح اجتہاد سے کرتے تھے؟ متقدمین کی کتابوں میں یہ بحثیں موجود ہیں لیکن ہمارے نزدیک امام سرخسیؒ کی رائے اس سلسلے میں زیادہ صائب ہے۔ وہ کہتے ہیں:

واصح الاقاویل عندنا انہ	ہمارے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول
علیہ السلام فیما کان یبتلی بہ	یہ ہے کہ رسول اللہؐ کو جب کوئی ابتلا پیش

---

[1] سورۂ مجادلہ ع ۱۔

من : نحوادث التی لیس	آتا جس میں وحی نہ نازل ہوتی تو آپ وحی کا
فیھا وحی منزل کان ینتظر	انتظار کرتے تھے جب انتظار کی مدت گزر
الوحی الی ان تمضی مدۃ الانتظار	جاتی تو رائے و اجتہاد سے حکم ظاہر فرماتے تھے
ثم کان یعمل بالرای والاجتہاد	اگر اس کے خلاف وحی نہ آتی تو یہ برقرار
ویبین الحکم بہ فاذا اقر علیہ	رکھنے کی دلیل ہوتی تھی۔
کان ذالک حجۃ قاطعۃ للحکم[1]	

رسول اللہ ؐ کی سطح نبوت و سطح اجتہاد میں حد فاصل قائم کرنا نہایت دشوار ہے اگر بالفرض قائم بھی ہو جائے تو نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہ ہوگا۔ عملی لحاظ سے دونوں سطحوں کے اجتہاد کا یکساں حکم ہوگا، پھر خواہ مخواہ کے لیے ذہن کو اس قسم کی بحثوں میں الجھانے سے فائدہ کیا ہے ؟

شعور اجتہاد کے ذریعے دوسروں کا اجتہاد

رسول اللہ ؐ کے علاوہ دوسرے لوگوں کا اجتہاد شعور اجتہاد کے ذریعہ ہوتا ہے جس کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے۔

ملکۃ یقتدر بھا علی استنباط	ایسا "ملکہ" کہ جس کے ذریعہ اصل سے فرع
الحکم الشرعی الفرعی من الاصل۔	کا شرعی حکم استنباط کرنے پر قدرت حاصل ہو۔

اس شعور کی تکوین شعور عقل اور شعور قلب دونوں کے "آمیزہ" سے ہوتی ہے۔ عقل کی طرح قلب بھی شعور رکھتا ہے جس کے کئی درجے ہیں مثلاً :

فراست : وہ درجہ جس کے ذریعہ انسان بعض ظاہری علامتوں کو دیکھ کر صحیح نتیجہ تک پہنچتا ہے۔

کشف : وہ درجہ جس میں حسب مراتب انسان کے احوال و دیگر حقائق منکشف ہوتے ہیں۔

الہام :۔ وہ درجہ جس میں غیبی ذریعہ سے خود بخود علم و ادراک کا القا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم نے کئی جگہ شعور قلب کو تعقل کے بجائے تفقہ سے تعبیر کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ

---

[1] ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل السرخسی۔ اصول السرخسی الجزء ثانی فصل فی بیان طریقۃ رسول اللہ فی اظہار الحکم۔

نفس کے اجتہادی مسائل کو اس کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ نیز ایک اجتہاد سے کام لینے کے لیے عقلی بصارت کے ساتھ قلبی بصیرت کو بھی بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

قرآنِ حکیم میں ہے:-

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا[1] — ان کے پاس دل ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔

فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ[2] — ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے کہ وہ نہیں سمجھتے ہیں۔

شعورِ نبوت کی قائم مقامی درِاصل شعورِ اجتہاد شعورِ نبوت کے قائم مقام ہے۔ ختمِ نبوت اور یہ سلسلہ اس وقت ختم کیا گیا جبکہ شعورِ اجتہاد اس کی قائمقامی کے قابل بن گیا۔ یعنی اُس میں اس درجہ پختگی، توانائی اور خود اعتمادی پیدا ہوگئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھاکر دیکھنے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختمِ نبوت سے قبل رسول اور نبی کے ذریعے آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود غور و فکر اور تلاش و جستجو سے یہ مسائل حل کرنے لگا۔

شعورِ اجتہاد کے فیصلے خالص و بے آمیز نہیں ہوتے لیکن زندگی و معاشرے کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شعورِ عقل و شعورِ قلب کے فیصلے و نتائج طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے خالص اور بے آمیز نہیں ہوتے ہیں بلکہ حسی تجربات، رسمی رجحانات اور وضعی حالات بھی ان دونوں میں اس قدر پیوست ہوتے ہیں کہ کلی طور پر ان کو کسی وقت جدا نہیں کیا جاسکتا[3]۔

ایسی حالت میں لازمی طور سے شعورِ اجتہاد (جس کی تکوین میں ان دونوں کی آمیزش ہے) کے فیصلے

---

[1] الاعراف ع ۲۲۔ [2] المنٰفقون ع ۱۔ [3] عقل، قلب اور ان کے حجابات وغیرہ پر تفصیلی بحث اور قدیم وجدید ماہرین ومفکرین کے اقوال کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر" اور "تہذیب کی تشکیل جدید" جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوچکی ہیں۔

نہ نتائج نہ بالکل خالص و بے آمیز ہوں گے اور نہ زندگی و معاشرے کے مسائل حل کرنے کے لیے اس کو آزاد خود مختار چھوڑنے کی اجازت ہوگی بلکہ ہر موڑ و ہر وقت پر اس کے لیے ایک بلند و برتر رہنما کی تلاش ضرورت ہوگی کہ جس کی رہنمائی میں حتی المقدور اپنے فیصلے و نتائج میں نکھار و جلا پیدا کر سکے ۔ اور جس کا دامنِ عصمت اس کی تر دامنی کے لیے ذریعۂ نجات بن سکے ۔

شعورِ نبوت کی رہنمائی

یہ "رہنما" شعورِ نبوت ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص و بے آمیز ہونے کی ضمانت نہیں ملتی ۔ اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہِ راست سلسلہ ختمِ نبوت کے ساتھ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ علم و ادراک کی دونوں قسمیں موجود و محفوظ ہیں ۔

(۱) وہ علم و ادراک جو برتر شعور یا نور سے تعلق جوڑ کر شعورِ نبوت نے حاصل کیا ہے جس کا تعلق خارجی و ماورائی حقیقت سے ہے اس کا اصطلاحی نام "قرآن" ہے ۔

(۲) وہ علم و ادراک جو نبوّت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ اور "قرآن" کی معنوی دلالت سے اخذ و استنباط کیا ہوا ہے اس کا اصطلاحی نام "حدیث" ہے ۔

اسلام کے قانونی نظام میں شعورِ اجتہاد کے اصل رہنما یہی دو ہیں جن کی رہنمائی میں وہ شعورِ نبوت کی قائمقامی کا شرف حاصل کرتا اور اپنی پاک دامنی کے لیے رفوگری کا سامان مہیا کر کے فائز المرام ہوتا ہے ۔

(باقی)

مقصودِ تخلیقِ کائنات

(۷)

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

غزوۂ تبوک کے واقعات پر پھر غور کیجئے اس میں تمام مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ جو زندگی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان سب میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ سب کے سب خلوص، جاں نثاری، جذبۂ جہاد، اللہ اور رسولؐ کی اطاعت، محبت اور نیکی میں مسابقت کے پتلے تھے، اور ہزارہا مومنین میں سے ایک بھی فرد ایسا نہ تھا، جس کے جذبۂ ایمانی اور خلوصِ نیت پر اللہ تعالیٰ نے مہر ثبت نہ کی ہو، اور جو اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کی جیتی جاگتی تصویر نہ ہو، وَذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ الْعَظِیْم۔

فرقِ مراتب ایمان لانے کے لحاظ سے تمام مسلمان برابر تھے، لیکن ان میں سے بعض کو ابتدا ہی سے ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور انھوں نے راہِ حق میں بعد کے اہلِ ایمان کے مقابلے میں زیادہ استقامت، ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے السابقون الاولون کا مقام دوسروں سے نمایاں تر ہے، پھر ان میں سے ہر ایک نے صبر و ثباتِ قدمی کا عمدہ نمونہ دکھایا۔ اور راہِ خدا میں جان تک قربان کرنے سے دریغ نہ کیا، تاہم ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا تھا، اور انھوں نے جان کے ساتھ مالی قربانی بھی پیش کی، اور اس طرح ان بھائیوں پر ایک

گونہ فضیلت حاصل کرلی، جو مالدار نہ تھے، قرآنِ حکیم نے کسی مقام پر اہلِ ایمان کی مالی قربانی کا ذکر کرکے ان کی تعریف فرمائی ہے، پھر ان ہی میں سے بعض نے فتح مکہ سے قبل مالی اور جانی ایثار دکھایا، اور بعض نے فتح مکہ کے بعد، اور خود قرآنِ پاک کی رو سے اول الذکر کو ثانی الذکر پر فضیلت دی گئی ہے:-

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ. مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

(الحدید: ۱۰-۱۲)

تم میں وہ برابر نہیں جس نے فتح مکہ سے پہلے مال خرچ کیا اور لڑائی کی (اور جس نے بعد میں خرچ کیا اور لڑائی) یہ مرتبہ میں ان سے بڑھ کر ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑائی کی اور (ان سب میں سے) ہر ایک کے ساتھ اللہ نے اچھے اجر کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو باخبر ہے، کون ہے جو اللہ کو قرض دے، تو وہ اسے اس کے لئے بڑھائے اور اس کے لئے عزت والا بدلہ ہے، جس دن تو مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے آگے دوڑ رہا ہوگا اور ان کے دائیں بھی، آج تمھارے لئے خوشخبری ہے، ایسے باغات کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انھیں میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

ان آیات میں ایک تو فتح مکہ سے قبل اور بعد میں راہِ خدا میں مالی اور جانی جہاد کرنے والوں کے متعلق بتلایا گیا ہے۔ کہ وہ آپس میں درجات میں برابر نہیں، بلکہ پہلوں کو بعد میں ایمان لانے والوں پر فضیلت حاصل ہے، لیکن اللہ کے ہاں دونوں گروہ اعلیٰ مقامات رکھتے ہیں۔

کیوں کہ فتح مکہ کے بعد بھی جنھیں خدا اور اس کے رسولؐ کی شناخت اور ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی، وہ قیامت تک بعد میں ہر آنے والے اور جانی و مالی قربانی دینے والے سے افضل ہیں۔ یہ خوش نصیب اہلِ ایمان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت سے مستفیض ہوئے۔ انھیں آپؐ کے ماتحت اور ارشاد پر جہاد فی سبیل اللہ کی سعادت ارزاں ہوئی۔ جو بعد میں آنے والے کسی شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی، پھر ان سب اولین و آخرین کو وَعَدَ اللّٰہُ الحُسْنیٰ کے الفاظ میں حسناتِ خداوندی کا وعدہ دیا گیا، اور یہ وعدہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں سب کے سب ایمان لانے والوں کے لئے ہے، پھر ان اولین و آخرین سب اصحابِ رسولؐ کے متعلق بشارت دی کہ ان سب کا نور قیامت کے دن ان کے آگے آگے روشنی کر رہا ہوگا، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جس پر اور جس وقت چاہے کرے چنانچہ فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے قریش مکہ نے آں حضرت صلعم کے علم کے نیچے جنگ حنین جنگ طائف، غزوۂ تبوک، اور لشکرِ اسامہ میں شرکت کی، جنگِ طائف میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی ایک آنکھ دشمن کا تیر لگنے سے بے کار ہوگئی۔ انھی قریش نو مسلموں نے فتنۂ ارتداد کا سر کچلا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات کے مطابق ایران، شام اور مصر کو فتح کیا، اور کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الحُسْنیٰ کے وعدہ الٰہی کا ثبوت پیش کیا، اللہ تعالیٰ کی ان بے اندازہ عنایات اور شہادات کے ہوتے ہوئے اگر کوئی بدقسمت بناوٹی قصوں کی آڑ میں ان اہلِ ایمان میں کسی ایک کے متعلق بھی بدگمانی سے کام لیتا ہے، تو وہ ایمان اور اسلام کی دولت سے محروم ہو گیا ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ، یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ وصالِ نبوی کے بعد نہ کوئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوا، اور نہ آپؐ پر ایمان لا کر کسی شخص کو آپؐ کے عَلَم کے نیچے جانی و مالی قربانی دینے کا شرف حاصل ہوا اور نہ ہی تا قیامت ایسا ہوگا، حیاتِ نبویؐ میں تمام ایمان لانے والوں سے اللہ تعالیٰ نے عمدہ وعدہ کر رکھا ہے، اور یہ اُس کا فضل و کرم ہے، اگر ان میں سے کوئی شخص ایمان لانے سے قبل مخالف تھا۔ تو ایمان لاتے ہی

اُس کے تمام گناہ دُھل گئے۔ اور بعد میں اسے خُدا اور رسول کی اتباع کا اجر ملا، بعد کا کوئی بھی شخص ان کی فضیلت کو نہیں پا سکتا، البتہ ان لوگوں کے نقش قدم پر چل کر راہِ حق میں قربانی دینے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہے، اور ان صحابہ کی طرح جو شخص بھی قیامت تک راہِ حق میں قربانی دیتا رہے گا، اللہ تعالیٰ اُس کے اجر میں اضافہ کرتا رہے گا، پھر ان کے ایمان پر یہ زبردست شہادت ہے کہ قیامت کے روز آں حضرت صلعم کی مبارک زندگی میں ایمان لانے والے مومن مردوں اور مستورات اور ان کے نقش قدم پر قیامت تک چلنے والے مومن مردوں اور خواتین کا نورِ ایمان ان کے آگے آگے دوڑتے گا، اور پھر اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت میں داخل کرے گا، اور یہ بشارت امتِ مسلمہ کے لئے تا قیامت قایم ہے۔

ان ہی میں سے ایک سابق الایمان اور سابقون الاولون کے گوہرِ تابندہ سیدنا ابوبکر صدیق رض کا ذکر بالخصوص رسول اللہ صلعم کی نصرت، رفاقت اور دائمی صحبت کے ضمن میں قرآنِ پاک نے بایں الفاظ فرمایا ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

(التوبہ : ۴۰)

"اگر تم اس رسول کی مدد نہیں کرتے تو یقیناً اللہ نے اس کی مدد کی جب کہ اس کو ان لوگوں نے جو کافر تھے نکال دیا، اس حال میں کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب اُس نے اپنے صاحب (رفیق، ساتھی) کو کہا، غم نہ کھا، اللہ ہمارے ساتھ ہے، سو اللہ نے اس پر اپنی تسکین اتاری اور اس کو ایسے لشکروں سے تقویت دی جن کو تم نہ دیکھتے تھے، اور ان لوگوں کی بات کو جو کافر تھے نیچا دکھایا اور اللہ کی بات ہی بلند ہے اور اللہ غالب

حکمت والا ہے۔"

اس آیۂ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو نصرتِ رسولؐ کی ترغیب دی ہے۔ اور اس کے لئے ہجرت نبویؐ کی مثال پیش کی ہے، جس میں نصرت و اعانت الٰہی آپؐ کے شاملِ حال ہوئی اور یہ نصرت زیادہ تر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی معرفت ہوئی، اس سفر کا تمام منصوبہ رفیق غار سیدنا ابو بکرؓ نے بنایا، جنھوں نے زادِ راہ اور سواری بہم پہنچائی، دولت خرچ کی، اور جاں نثاری کے لئے رفاقت اختیار کی، اور جب خطرہ قریب ہوا تو آں حضرتؐ کی خاطر مغموم و حزین ہوئے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین و تسلی کا وعدہ آیا کہ خدا کا رسولؐ ہی نہیں ہر دو رفیقانِ غار خدا کی پناہ میں ہیں۔ پھر عجیب بات ہے کہ جس عاشق رسولؐ کا ذکر کر کے غزوۂ تبوک کے لئے اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو جان و مال کی قربانی کی ترغیب دی، اس نے اس وقت بھی گھر کا تمام اثاثہ پیش کر کے نصرت کی نئی مثال قایم کی، اصحاب میں دوبارہ سبقت حاصل کی، اور فتح مکہ سے قبل اور بعد خرچ کرنے والوں پر دونوں بار سبقت لے گئے۔ اور یہ خدا کا فضل ہے، وہ جس پر چاہے کرے، اور اللہ ہی فضل و عنایات کے خزائن کا مالک ہے۔

محبوبانِ الٰہی اللہ تعالیٰ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی محبوب ہیں، آپؐ کی اطاعت، آپؐ کے مطیع اور متبع کو، خدا کا محبوب بنا دیتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران)

"اے نبی مومنوں سے کہہ دے کہ "اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔"

چنانچہ اصحابِ رسولؐ اللہ نے آں حضرتؐ کی کامل اتباع کا جو نمونہ دکھایا، اس کا کسی قدر ذکر سطورِ بالا میں ہو چکا ہے، اور کون سا لمحہ تھا۔ جس میں ان فدائیانِ نبیؐ کی گردنیں آپؐ کی اطاعت میں خم نہ تھیں اور اس کا عظیم ثبوت اس امر میں ہے کہ اگر اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ

يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (الاحزاب : ۵۶) کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتے اپنے نبیؐ پر درود و صلوٰۃ بھیجتے ہیں تو شانی الرسول اصحابِ رسولؐ کو بھی، اسی درود و صلوٰۃ کی لذت سے مالا مال کر دیا۔ اور الفاظ ذیل میں رسولِ خدا اور مومنین کو دامنِ رحمت میں یکجا کر دیا

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (الاحزاب : ۴۱)

"اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح کیا کرو، وہی ہے جو تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے، اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تمھیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالے اور وہ مومنوں پر بہت رحم کرنے والا ہے۔"

کیا قرآنِ کریم کی رُو سے اُمتِ مسلمہ، اصحابِ رسولؐ کی مقبولیت اور رسولِ پاک کی کامل پیروی کی اس سے بڑی شہادت ممکن ہے، اور کیا اس امت میں کسی دوسرے انسان کو یہ شرف حاصل ہوا۔ یا ہو سکتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کسی بندۂ حق کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے جانا چاہے تو کیا ایسے شخص کی نیک بختی سعادت مندی اور خدا کی رحمت سے بہرہ ور ہونے میں ذرہ بھر شک کیا جا سکتا ہے، اور کیا اس میں شک کرنے والا مسلمان رہ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے قیامت تک اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ اقدسؐ کے بعد اصحابِ رسولؐ کی محبت اور دوستی عینِ ایمان ہے، اور حزب اللہ (اللہ کی جماعت) میں داخلہ کی واحد کلید ہے:۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فَإِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ (المائدہ : ۵۵ - ۵۶)

"تمھارا دوست صرف اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اور وہ جو (اللہ اور رسول پر) ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کو اور اُن کو جو ایمان لائے دوست بناتا

ہے، تو اللہ کی جماعت ہی غالب ہے"

ہر اہلِ ایمان کی فطری خواہش و دلی آرزو ہے کہ وہ حزب اللہ، خدائی لشکر میں شامل ہو کر غلبہ و عروج حاصل کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں شامل ہو کر دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ ور ہو، لیکن اس کے لئے تینوں محبتوں کا ہونا شرط ہے۔ (۱) اللہ جل شانہٗ کی محبت (۲) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت (۳) اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ان اصحابِ رسولؐ کی محبت جنھوں نے خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کے بعد مال و جان کی قربانی پیش کر کے محبت کا ثبوت و نمونہ پیش کیا۔ مبارک ہیں وہ خوش نصیب اہلِ ایمان جنھیں ان تینوں کی محبت نصیب ہوئی، مبارک ہیں وہ جنھوں نے ان تینوں کی اطاعت اور اسوۂ حسنہ کی راہ اختیار کی، اور مبارک ہیں وہ جنھوں نے ان تینوں کے رستوں کے سوا باقی تمام رستوں سے کنارہ کشی کی، ان ہی کے لئے رضائے الٰہی اور دین و دنیا کے انعامات ہیں۔

اتمام نعمت | گذشتہ سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ کہ اس امتِ مسلمہ کے لئے دین و دنیا کی سرخروئی مقدر ہو چکی ہے۔ انہی کا دین دیگر دینوں پر غالب رہے گا، انہی پر نئی نئی فتوحات اور غنیمتوں کے دروازے کھول دیے گئے ہیں، اور انہی پر دنیا میں نیکی، انصاف اور انسانی احترام کی بجا آوری کا فریضہ ڈالا گیا ہے، اور یہی امت دنیا میں آسمانی بادشاہت قایم کرے گی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری سال حج کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ اہلِ توحید نے شرکت کی، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو بشارت سنائی

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ)	(اے امتِ مسلمہ) آج ہم نے تمھارے لئے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تمھارے لئے دینِ اسلام پسند کیا"

کیا ہی خوش نصیب تھے اصحابِ رسول، جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ
بہ میں ایمان کی دولت سے فیض یاب ہوئے، اور انھیں کامل دین دیا گیا، اور اس دین
لما حقہٗ اتباع سے جو نعمتیں وابستہ تھیں سب انھیں بخشی گئیں، اور ان کے لئے دینِ اسلام
ندر کرکے دنیا کی رہنمائی اور قیادت عطا کردی گئی۔

ابیت رسول اللہ کی تفویض | غزوۂ تبوک کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانی فریضہ تکمیل
ئچکا تھا، تمام ملکِ عرب آپؐ کے قدموں میں تھا، دینِ حق باطل پر غالب آچکا تھا اور
پؐ کا کام صرف اس قدر رہ گیا تھا کہ آپ دینِ الٰہی کے قیام کا فریضہ اُس اُمتِ مسلمہ کے
ہرد کردیں، جس کی تطہیر کا آسمانی کام، دُعائے خلیلؑ کے مطابق آپؐ کے ذمے تھا چنانچہ
پؐ نے چاروں طرف داعیانِ اسلام بھیجے تاکہ نومسلم قبائل کو احکامِ الٰہی سے آگاہ کریں،
پر آپ نے ۹ھ میں اولین فریضۂ حج کے لئے افضل الامت سیدنا ابوبکر صدیق کو
یر الحجاج بنا کر بھیجا، تاکہ آیندہ امت آزادانہ خدماتِ دین بجالاتے، اسی حج میں سیدنا علیؓ
ے حضرت صدیق اکبرؓ کی قیادت میں فریضۂ حج ادا کیا اور سورۂ توبہ کی ابتدائی چالیس آیات
حج کے موقع پر اعلان کیا، جس کی آخری چالیسویں آیت میں غارِ ثور میں آں حضرتؐ اور صدیق
برؓ کی رفاقت نصرت اور اللہ تعالیٰ کی ہر دو رفیقانِ غار سے معیت و اعانت کا ذکر ہے،
ر جس طرح غارِ ثور میں یہ رفاقت بلافصل تھی اسی طرح بعد میں بھی ہر میدان، ہر مقام اور
ہر مرحلہ پر بلافصل رہی حتیٰ کہ آں حضرتؐ کی نیابت، امت کی امامت، خلافت اور وفات
بعد بھی بلافصل رہی، چنانچہ اس آیۂ شریفہ کے نزول کے چند ماہ بعد، جب آں حضرتؐ
رحلت کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے پھر مسجدِ نبوی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کو امام
صلوٰۃ مقرر کیا، اور حضرت صدیق اکبرؓ آپ کی مسرت بھری نگاہوں کے سامنے امامت
ںت کا فریضہ ادا کرتے رہے حتیٰ کہ آپؐ خوش و خرم، اللہ تعالیٰ کو اپنے تکمیلِ مقصد پر گواہ
ہرا کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، آپ کی جانشین، امت مسلمہ نے دنیا میں شہادت علی الناس

کا فریضہ سنبھال لیا، اور امور سلطنت کی قیادت کے لئے تیس ہزار مجاہدوں اور دس ہزار اکابر مدینہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفۃ الرسول منتخب کیا، ان کی قیادت میں ایک طرف فتنوں کا سر کچلا تو دوسری طرف خدا اور رسولؐ اللہ کی بشارتوں کے مطابق نئے نئے علاقوں کی فتوحات کا سلسلہ بڑھایا۔ نیز تلاوتِ آیات، تطہیرِ آدم اور تعلیم کتاب و حکمت کا نبوی فریضہ سنبھال لیا، اور اس طرح اُس خلافت کا بوجھ اُٹھا لیا، جو مقصدِ تخلیقِ آدم تھا، اور جو اس امت کے لئے الفاظِ ذیل میں موعود تھی :—

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

(النور : ۵۵)

"اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا، جیسے انھیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے، اور وہ ان کے لئے ان کے دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مضبوطی سے قائم کر دے گا، اور وہ ان کے لئے ان کے خوف کو بدل کر امن کی حالت قائم کر دے گا، وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی عہد شکن نافرمان ہیں"

اس آیہ استخلاف سے چند باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، اول تو یہ کہ اللہ اور رسولؐ اور کتاب اللہ پر ایمان لانے اور اُن کے احکام کے مطابق کام کرنے والے مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خلافت عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے، اس خلافت کا قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور دین کی تکمیل سے وابستہ ہے امتِ مسلمہ کسی عظیم فتنے کی زد

سے خوف سے دوچار ہوگی، اور اس کے پسندیدہ دین کا استحکام خطرے میں پڑ جائے گا، قیامِ خلافت کے بعد امتِ مسلمہ اس فتنے کو کچل دے گی، ملک میں امن و انصاف کا دور دورہ ہو جائے گا، اور اس کا دین از سرِ نو استحکام و تسلط پائے گا، شرک ہمیشہ کے لئے ملک سے مٹ جائے گا۔ اہلِ ایمان آزادانہ احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کریں گے اور یہ حالت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک آیندہ نسلیں اُمتِ مسلمہ کے نقشِ قدم پر چل کر اوامر و نواہی کی پابندی اور ان کے قیام کا فریضہ ادا کرتی رہیں گی، اور جب احکامِ الٰہی اور ایمان کے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا جائے گا، تو پھر زوال کا سامنا ہوگا۔

اسلامی تاریخ کا طالبِ علم جانتا ہے کہ یہ تمام باتیں آں حضرتؐ کے وصال کے معاً بعد وقوع پذیر ہوئیں اور مسلمانوں نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں، اسلام کے مطابق خلافت قایم کی، اس وقت ملک میں ارتداد اور مرکز گریز قوتوں نے سر اٹھایا۔ مگر اہلِ ایمان نے ان فتنوں کا سر کچلا، ملک میں از سرِ نو نظامِ اسلام مستحکم ہو گیا، شر و فساد کے بادل چھٹ گئے، اور ہر طرف امن و انصاف کی ٹھنڈک ہوائیں چلنے لگیں، کفر و شرک کا استیصال ہو گیا، جھوٹے مدعیانِ نبوت کچلے گئے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توحید اور رسالتِ محمدی کا عَلَم لہرانے لگا، اور صدیوں تک اسلام کا غلبہ رہا، حتیٰ کہ خدا رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی بجائے اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کو آگے لایا گیا، نئے نئے ائمہ، فقہا، فلسفی، مجتہدین، مجددین، ملہمین، مفسرین، اولیاء اور علماء قوم کی توجہ عقیدت اور محبوبیت کا مرکز بن گئے۔ خانہ ساز واقعاتِ تاریخ کو قرآنی تصریحات کی جگہ دی گئی، قرآنی تعلیمات کو مسخ کر دیا گیا اور ایمان و عمل کے رشتہ کو منقطع کر کے دین کو محض اقرار باللسان تک محدود کر دیا گیا۔ خواہشات کو معبود اور اصل ایمان قرار دے لیا گیا، اور اس طرح اعمالِ حسنہ کے حقیقی سرچشموں سے کٹ کر احبار و رہبان کو خدا، رسولؐ اور امتِ مسلمہ کا مقام دے دیا گیا، اور خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کے مورد بن گئے۔

خدا، رسول اور دین کے مددگار

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ اگر تم اللہ کی نصرت و مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری نصرت فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ کسی انسان کی مدد کے کب محتاج ہیں، لیکن اس کی بے پایاں رحمت نے ان مقدس اہل حق کو نوازا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے عین مطابق جان و مال کی قربانی دی، اور اپنی ہر گونہ خواہشوں اور ارادوں کو اس کی رضا کے تابع کر دیا۔ جناب مسیحؑ کے حواریوں نے تو نحن انصار اللہ کا اعلان کیا تھا۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے نام لیواؤں نے عملاً اس کا مظاہرہ کیا، اور جس انداز سے نصرت کا فریضہ ادا کیا وہ ناقابل بیان اور توصیف سے بالاتر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں نے آپ کی قیادت میں دین کی جو خدمت انجام دی، اُس کا ذکر کرتے ہوئے سورہ الحشر میں ارشاد خداوندی ہے:

الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔

وہ اہل ایمان جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکال دیے گئے۔ وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے جویاں ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔

سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ

اے نبی! اللہ وہی ہے۔ جس نے اپنی اور مومنوں کی مدد سے تیری اعانت و نصرت کی اور اُس نے ان (مومنین) کے دلوں میں الفت ڈالی۔ اگر تو جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ خرچ کر دیتا تو بھی ان کے دلوں میں الفت

وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ — پیدا نہ کرسکتا، لیکن اللہ نے ان میں الفت ڈال دی، وہ غالب حکمت والا ہے، اے نبی! تیرے لئے اللہ اور وہ اہل ایمان ہیں جنھوں نے تیری اتباع کی۔"

اس آیہ کریمہ میں جہاں اللہ تعالیٰ کو اپنے نبیؐ کا ناصر و مددگار ظاہر کیا گیا ہے، وہاں مومنوں کو بھی رسول اللہؐ کا معاون و ناصر بتایا گیا ہے، اور اس ستائش پر آنحضرتؐ کے زمانے کے مومنین، اصحاب رسول اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بعد کے مسلمان تا قیامت جس قدر فخر کریں کم ہے، دوسری بات جو قابل توصیف و ستائش ہے، وہ مومنین کے قلوب میں باہمی محبت و الفت کا ڈالنا ہے، اور الفت ایک انتہائی جذبہ ہے جو انسانوں کے درمیان باہمی لگاؤ کے لئے ضروری و ممکن ہے، اور یہی الفت، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کے دلوں میں اپنے حبیب اور پیارے نبی اکرمؐ کے لئے پیدا ہوچکی تھی، پھر اس آیت میں اللہ اور اہل ایمان دونوں کو رسول اللہ کے لئے کافی بتایا گیا ہے۔ اس صورت میں ان اصحاب نبیؐ کی قدر و منزلت کا اندازہ کون انسان کرسکتا ہے؟

نیز یہاں اس کے ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا کہ جس امت مسلمہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے امداد کی تصدیق و اعلان کردیا ہو اُس کی دین و دنیا کی کامیابی میں کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے، اور یہ خصوصیت اصحابِ رسول ہی کو حاصل ہے۔

آنحضرت صلعم کے جانثاروں نے آپ کی جو نصرت و تائید کی، اور آپؐ کے ادنیٰ اشاروں پر جانی اور مالی قربانی کا جو بے نظیر مظاہرہ کیا، اس کا صلہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں سن لیجئے:-

فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْ أُنْزِلَ مَعَهٗ — "پس جو لوگ اس نبیؐ پر ایمان لائے۔ اور اس کو تقویت دی، اور اس کی نصرت کی اور اس

اولئك هـم المفلحون۔ نور کی پیروی کی جو اس نبیؐ کے ساتھ اتارا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اعراف : ۱۵۷)

قرآن پاک میں جہاں جہاں مومنوں کی تعریف ملتی ہے اس کے حقیقی مصداق اور مخاطب یہی عاشقانِ خدا و رسولؐ ہیں اور یہی کتاب وسنت کے کامل پیرو ہیں، یہاں بھی ان کی مدح وتعریف میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے پیارے آقا، سرکار دوعالم پر ایمان لاتے ہیں، آپ کو قولاً وفعلاً تقویت پہنچاتے ہیں۔ آپ کی نصرت وحمایت پر ہر لحظہ کمربستہ رہتے ہیں، اور قرآن حکیم کی صورت میں جو نورانی تعلیمات آنحضرتؐ کی وساطت سے ان تک پہنچیں، ان کی کماحقہ اتباع وپیروی کرتے ہیں اور ان خصائص کی بدولت وہ دنیا وعاقبت میں فلاح وکامیابی سے ہم آغوش وفیضیاب ہوگئے ہیں۔

وَ ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۔ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُونَ

اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور دورِ رسالت اور بعد کے اہل ایمان کو دوست ومحبوب رکھیں گے تا قیامت وہی غالب رہیں گے۔

باہمی تعلقاتِ محبت واخوت

گذشتہ اوراق میں امت مسلمہ کے جن متحدہ اور اجتماعی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا حصول اور تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک افراد امت کے درمیان باہمی محبت، یگانگت، ایثار، ہمدردی، یک جہتی اور جانثاری کا جذبہ کمال تک نہ پہنچا ہوا ہو، ان اوصاف کا مظاہرہ امت مسلمہ نے قدم قدم پر کیا، مکہ میں غلام مسلمانوں کو آزادی دلانا، ہجرت کے وقت انصار مدینہ کا مہاجرین مکہ کی خدمت میں اپنے اموال اور مکانات پیش کرنا، یہودیوں کے مدینہ سے اخراج کے بعد انصار مدینہ کا مہاجرین کے حق میں حقوق سے دستبردار ہوجانا، جنگ حنین میں آنحضرتؐ کے ارشاد پر مہاجرین وانصار کا مال غنیمت

نومسلم قریش کے حوالے کرکے رسولِ خدا کے ساتھ خوشی خوشی مدینہ لوٹ آنا اور پھر بالخصوص غزوۂ تبوک کے موقع پر خوشحال اہلِ ایمان کا نادار بھائیوں کے لئے زر و مال لٹانا، یہ چند مثالیں ایسی ہیں جو مسلمانوں کی باہمی محبت پر شاہد ہیں، جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ وَلَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ (انفال) اللہ نے مومنوں کے دلوں میں باہم محبت ڈال دی اور "اے نبی، اگر تم روئے زمین کی تمام دولت صرف کردیتے پھر بھی یہ محبت دلوں میں نہ ڈال سکتے"۔ پھر سورۂ آلِ عمران میں، اسی باہمی محبت کا ذکر کرکے مسلمانوں سے فرمایا فاذکروا نعمۃ اللہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا۔ اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پس اللہ نے تمھارے قلوب میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی جس کی وجہ سے تم باہم بھائی بھائی بن گئے" نیز باہمی اختلاف حتی کہ باہم مقاتلہ کی صورت میں بھی فرمایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ "مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لئے باہم قتال کی صورت میں ان میں صلح کرا دیا کرو۔" ان ہی دینی بھائیوں کا ذکر کرکے فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ "محمد اللہ کا رسول ہے، اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابل سخت اور ایک دوسرے کے ساتھ رحیم و کریم ہیں"۔ ان کی باہمی محبت، دوستی اور تعاون کے سلسلے میں فرمایا۔ والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض (توبہ) "مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوست و مددگار ہیں"، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وَعَدَ اللہُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ کے الفاظ میں جنت کا وعدہ کر رکھا ہے، انہی بلند پایہ اہلِ ایمان کا ذکر کرتے ہوئے دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِکَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (انفال)

کی، اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے انھیں اپنے ہاں پناہ دی اور ان کی نصرت کی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دوست و مددگار ہیں۔

سورہ حشر میں ان انصار و مہاجرین کے باہمی ایثار و اعلیٰ سلوک کے سلسلے میں فرمایا:

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

اور وہ جو ان مہاجرین سے پہلے دار الہجرت مدینہ میں رہتے اور ایمان رکھتے تھے وہ اس سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کی طرف آتا ہے، اور اپنے سینوں میں اس کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے، اور وہ اپنے آپ پر ان کو مقدم رکھتے ہیں، خواہ خود انھیں تنگی ہو۔

اس آیت میں آنحضرتؐ پر ایمان لانے والے فرزندانِ اسلام کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ اپنے مہاجرین بھائیوں سے محبت کرتے ہیں۔ اور جب انھیں نظر انداز کرکے غریب الدیار نادار مہاجرین کی مدد کی جاتی ہے، تو انھیں کوئی تنگی محسوس نہیں ہوتی اور اپنی مالی پریشانی کے باوجود اپنے بھائیوں کی ضرورت کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں، یہ تھا مسلم معاشرہ جو آنحضرتؐ نے قائم کیا، اور جو تا قیامت اقوام عالم کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا رہے گا۔

(باقی)

غَزَالی یا غَزّالی

(۲)

محمد عُزیر بہاری۔ مرکزی دارالعلوم ریوڑی تالاب بنارس

جہاں تک میں نے تمام دلائل پر غیر جانب داری کے ساتھ غور کیا ہے اس سے میرے نزدیک تخفیف ہی کا مسلک صحیح نظر آیا۔ ذیل میں اس کے وجوہ پیش کر رہا ہوں:

سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ خود امام غزالی سے متعدد حضرات (مثلاً صلاح الدین صفدی اور نووی — اور دونوں سے نقل کرتے ہوئے [علی الترتیب] طاش کبری زادہ اور محمد بن طاہر پٹنی) نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے غَزّالی بالتشدید کو ناپسند کیا ہے اور فرمایا کہ میں غَزَالی ہوں غَزَالہ کی طرف منسوب — بعض علماء نے تو اس سلسلہ میں یہاں لکھا ہے کہ امام موصوف نے فرمایا:

من قال لی الغزّالی فقد سبّنی [1] — جو شخص مجھے غَزّالی کہتا ہے وہ دراصل مجھے گالی دیتا ہے۔

ظاہر ہے خود امام صاحب سے منقول کسی روایت کا انکار ممکن نہیں۔ خصوصاً

---

[1] التصریح فی شرح التشریح ص ۴ [حاشیہ از مولانا حفیظ اللہ بندوی (م ۱۳۶۲ھ)] (طبع مکتبہ رحیمیہ دیوبند ۱۳۸۶ھ)۔

جب کہ یہ بھی تصریح ہو کہ انھوں نے اپنی کسی تصنیف میں بھی یہ بات لکھی ہے۔ جیسا کہ صلاح الدین صفدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔

بعض حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں ان کی کسی تصنیف میں یہ بات نہیں ملی، ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اولاً ان کی تمام تصانیف دستیاب ہی کہاں ہیں؟ ثانیاً جو موجود و مطبوع ہیں ان کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کس نے کرلیا ہے کہ اس کی بنیاد پر وہ قطعی انکار کا پہلو اختیار کرتا ہے۔ پھر جبکہ امام صاحب کے حوالہ سے اس کے خلاف تشدید کی روایت کسی نے نہیں بیان کی ہے۔ تو تخفیف والی روایت کی صحت میں شبہ کیوں؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ امام موصوف کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ مجد الدین بن محمد بن محی الدین ابو الطاہر شروان شاہ بن ابو الفضائل فخر آور بن عبید اللہ ابن ست النساء بنت امام غزالیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ لوگ غلطی سے ہمارے نانا کو غزّالی (بہ تشدید) کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ غَزَالی (بہ تخفیف) ہیں ــــــ ہم ابھی نقل کر آئے ہیں کہ علامہ فیّومی نے خود شیخ موصوف سے سن کر ان کا یہ بیان کتاب میں درج کیا ہے۔ پھر سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی نے بھی اسے قابل توجہ سمجھ کر اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ پس اس بیان کی صحت میں بھی ہمارے نزدیک کوئی شبہ نہیں۔ اس پر وارد کیے جانے والے اعتراض کو ہم بالکل پھسپھسا سمجھتے ہیں، غور کیجئے قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کیا لکھ رہے ہیں:

"ممکن ہے یہ روایت ان کے خاندان میں چلی آئی ہو، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ غزالہ کی نسبت خود امام صاحب کے خاندان والوں کو مدت دراز کے بعد معلوم ہوئی ہو؟ جبکہ اس قریہ کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ اور کیا یہ ہوسکتا ہے کہ سوائے بعض باخبر آدمیوں کے تمام خاندان والوں نے اس کو بھلا دیا ہو؟ اور پھر لوگ

اس کو مشدد بولنے اور پڑھنے لگے ہوں[1]؟"۔

ہم کہتے ہیں کہ یقیناً یہ روایت ان کے خاندان میں اس وقت تک برابر چلی آئی تھی۔ کیونکہ امام غزالی سے اس طرح کے متعدد اقوال ہم ابھی نقل کر آئے ہیں جن سے حقیقت حال کا پتہ چلتا ہے۔ پس امام صاحب کے نواسے کے اس بیان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ چونکہ عام طور پر تمام لوگ بالتشدید ہی پڑھا اور بولا کرتے تھے اس لئے وہی رائج ہوگیا اور تخفیف والی روایت اور امام صاحب کے خاندان والوں کے بیانات کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ انھوں نے تخفیف والی روایت بھلادی ہو۔ بلکہ "غلط العوام" کے آگے کسی کے صحیح بیان کا فائدہ ہی کیا ہوسکتا تھا؟

اس توضیح سے یہ شبہ دور ہوجاتا ہے کہ یہ روایت صرف چند آدمیوں کو مدت دراز کے بعد معلوم ہوئی تھی ــــ باقی رہا غزالہ کا نام ونشان مٹ جانا تو اس کی بابت چند سطور کے بعد ہم لکھیں گے۔

بہرحال جیسا کہ ناظرین ملاحظہ فرمارہے ہیں اس اعتراض سے نہ تو ہمارے موقف کی تردید ہوتی ہے اور نہ ہمارا استدلال ہی کمزور ہوتا ہے۔

ان دو بنیادی وجوہ کے بعد ہم قائلین تخفیف کی پیش کردہ تصریحات پر غور کریں گے۔ اور انھوں نے جن اسباب کی بنا پر غزالی (بہ تخفیف) کو صحیح قرار دیا ہے ان کی توضیح اور ان پر وارد کئے گئے اعتراضات کی حقیقت بیان کریں گے:

سبھی حضرات اس سلسلہ میں تقریباً یک زبان ہیں کہ غَزَالی "غَزَالہ" کی طرف منسوب ہے، یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ "غَزَال" کی طرف اس کی نسبت ہے ــــ البتہ "غَزَالہ" کیا

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) جون ۱۹۲۹ء ــــ ۲۳/۶/۱۴م ۱۴-۱۵م

ہے ؟ اس کے بارے میں تین رائیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) سب سے زیادہ مشہور یہ ہے کہ "غزالہ" طوس کا ایک گاؤں ہے۔ سمعانی، نووی، ابن دقیق العید اور دوسرے مورخین (جن کے اقوال کی تفصیل ہم پہلے دے چکے ہیں) نے یہی توجیہ کی ہے۔ خود امام موصوف اور ان کے نواسے سے بھی یہی منقول ہے۔ اس لئے اس کی صحت کا انکار ممکن نہیں۔

بعض حضرات نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ طوس کے اندر غزالہ نام کے کسی گاؤں کا ذکر جغرافیہ کی اکثر مشہور و متداول کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس لئے غزالی کو غزالہ گاؤں کی طرف منسوب سمجھنا درست نہیں ــــ متقدمین میں غالباً کسی سے بھی اس طرح کا انکار منقول نہیں[۱] البتہ دور حاضر کے بعض علما، مثلاً علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "غزالہ" طوس میں کسی گاؤں کا نام نہیں[۲]

میرے خیال میں غالباً ان حضرات نے یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ) کے اس بیان پر غور نہیں کیا :

(طوس کے) دونوں شہر (طابران اور نوقان) کے تحت ایک ہزار سے زیادہ گاؤں ہیں۔	ولهما أكثر من ألف قرية[۳]

---

[۱] ابن السمعانی کی طرف غلط طور پر جو کچھ منسوب ہے اس کی حقیقت ہم شروع میں واضح کر چکے ہیں۔

[۲] دیکھئے : الغزّالی ص ۲ (طبع اعظم گڈھ ۱۹۵۶ء)؛ تذکرہ حضرت امام غزالی ص ۴ (طبع دہلی ۱۹۶۲ء)؛ معارف (اعظم گڈھ) جون ۱۹۲۹ء

[۳] معجم البلدان ۶/۷ (مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۰۶ء)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ طوس میں مشہور گاؤں کے علاوہ بہت سے غیر معروف گاؤں بھی آباد تھے۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ان ہی میں سے کسی گاؤں کا نام "غزالہ" ہو ؟ کیونکہ بدیہی بات ہے کہ امام موصوف "طوس" کے شہر "طابران" کے کسی نہ کسی گاؤں سے ضرور تعلق رکھتے تھے۔ ہم قائلین تشدید سے پوچھتے ہیں کہ اگر وہ گاؤں غزالہ نہیں ہے (حالانکہ اس کے وجود کی شہادت متعدد علماء نے دی ہے) تو پھر اس کا نام کیا ہے ؟ کیا وہ طوس کے ہزاروں گاؤں کی فہرست مرتب کرسکتے ہیں ؟ — پس جب وہ دوسرے تمام گاؤں کی تفصیل نہیں پیش کرسکتے (اور اس کی وجہ سے — ان کا انکار بھی ممکن نہیں) تو صرف "غزالہ" (جس کا ذکر بھی بعض علماء کی زبانی ملتا ہے) سے لاعلمی کا اظہار کیوں ؟

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام غزالی جیسے مشہور مفکر اور عالم کی جائے پیدائش کو عام لوگ فراموش کردیں ؟ — میں کہوں گا کہ اس طرح کی ایک دو نہیں بہت سی مثالیں موجود ہیں، دور جانے کی ضرورت نہیں، جن لوگوں نے سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷ء) کے حالات پڑھے ہوں گے انھیں علم ہوگا کہ نہ صرف گاؤں بلکہ کس ملک میں وہ پیدا ہوئے ؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ ایرانی آج بھی مصر ہیں کہ سید صاحب اسدآباد (ایران) میں پیدا ہوئے، اور افغانی شد و مد کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا مولد اسعد آباد (افغانستان) ہے — بتائیے جب آج یہ حال ہے، تو گذشتہ صدیوں میں (جب کہ موجودہ وسائل بھی مہیا نہ تھے) ایسا ہونا کیوں مستبعد ہے ؟

بہرحال یہ متحقق ہے کہ امام غزالی غزالہ گاؤں کی طرف منسوب ہیں، منکرین کی کوئی دلیل اس کے خلاف نہیں ہے۔

(۲) دوسرا سبب بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ امام موصوف "غَزالہ بنت کعب الاحبار" کی اولاد سے ہیں اس لئے اس کی طرف منسوب ہوکر غزَالی کہلائے جیساکہ

گذر چکا۔ علامہ شہاب الدین خفاجی نے یہ قول نقل کیا ہے۔ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی نے بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وھذا ان صح فلا محید عنہ[1] اگر یہ صحیح ہو تو پھر اس کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول بھی بالکل رد کر دئے جانے کے قابل نہیں۔ بلکہ اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کے قائل اور ماخذ وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا، دوسر تذکرہ نگاروں نے بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ امام موصوف غزالہ بنت کعب الاحبار کی اولاد سے تھے لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر ان کا سلسلۂ نسب موصوفہ کے علاوہ کسی دوسری شخصیت تک منتہی ہوتا ہے تو اس کا بھی سرے سے علم نہیں —— پس بات تعارض کی یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ البتہ پہلا سبب (جو اصل کا درجہ رکھتا ہے) متحقق ہو جانے کے بعد اس دوسرے سبب کی حیثیت ضمنی اور تائیدی ہو جاتی ہے۔

(۳) تیسری وجہ زویمر (S. M. Zwemer) اور بعض دوسرے مستشرقین نے یہ بیان کی ہے کہ "غزالہ" دراصل ایک خاندان کا نام ہے —— ہم اس پر بحث کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، کیونکہ اگر "غزالہ" کو کسی گاؤں یا شخصیت کا نام قرار دینا صحیح ہے، تو پھر مزید غور و خوض کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ہم نے محض تائیداً اس توجیہ کا ذکر کیا ہے۔ بعض جدید تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے کہ دیگر وجوہ کی موجودگی میں اس کی کوئی ضرورت نہیں[2]۔

قائلینِ تخفیف کے موقف کی توضیح کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قائلینِ تشدید کے دلائل

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۱/۱۸

[2] ڈاکٹر زکی مبارک: الاخلاق عند الغزالی ص ۲۹ (مطبعہ رحمانیہ مصر)

کا بھی مختصر جائزہ لیں اور انھیں نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھیں، ورنہ بحث تشنہ رہ جائے گی:

(۱) ان کا مشہور استدلال یہ ہے کہ امام موصوف کے والد کا پیشہ "غَزْل" (رلیماں فروشی) تھا، جیسا کہ بعض کتب تذکرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، چنانچہ اس لفظ کی طرف منسوب ہو کر "غزّالی" کہلائے، اگرچہ عربی زبان میں کسی پیشے کی طرف نسبت کا جو قاعدہ ہے اس کی رو سے صرف "غَزَّال" کہنا چاہیے تھا جیسا کہ "تمّار" اور "جرّاح" وغیرہ ہیں لیکن خوارزم اور جرجان والے عموماً اس طرح کے الفاظ کے اخیر میں یار — بقول شہاب الدین خفاجی — تاکیداً بڑھا دیتے ہیں چنانچہ عطّار کو عطّاری، اور قصّار کو قصّاری کہتے ہیں، اس طرح غزّال کے بجائے غزّالی ہی زبان زدعام ہو گیا۔

ابن خلکان، ابن دقیق العید، ابوالفداء، ذہبی وغیرہم نے صرف اسی توجیہ کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے۔ ابن الاثیر نے دوسری وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ غزّالی غزّال کی طرف منسوب ہے جو "بائع الغزل" (رلیماں فروش) کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں "یار" کو زائد نہیں ماننا پڑے گا۔

ہمیں اس استدلال سے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں: پہلی بات تو یہ کہ اس طرح کی کوئی روایت خود امام صاحب یا ان کے خاندان والوں میں سے کسی سے منقول نہیں ہے، جبکہ اس کے برخلاف تخفیف کی روایت متعدد حضرات نے ان سے نقل کی ہے۔ پس اس ناحیہ سے تشدید کا قول اور اس کی یہ توجیہ اصولی طور پر کمزور پڑتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ ابن الاثیر کی تصریح "والتخفیف خلاف المشہور" سے ظاہر ہوتا ہے کہ تشدید والا قول چونکہ زیادہ مشہور اور رائج تھا اس لئے اسی کو مستند سمجھ لیا گیا، گویا غزالی (بہ تخفیف) کو غلط قرار دینے کی کوئی ٹھوس بنیاد نہ

تھی[1]۔ اس توضیح سے قائلینِ تشدید کے موقف کا ضعف صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے یہاں کوئی شخص کہہ پڑے کہ بات صرف اتنی سی نہیں ورنہ ابن دقیق العید قطعیت کے ساتھ تشدید ہی کو کیوں صحیح قرار دیتے؟ سیوطی تخفیف والے قول کی تضعیف کیوں کرتے؟ اور ابو الفداء، ذہبی اور ابن العماد صرف تشدید والا قول ہی کیوں ذکر کرتے؟ ــــ ہم کہیں گے کہ ان تینوں کو صرف یہی قول معلوم رہا ہوگا کیونکہ یہی عام طور پر مشہور تھا۔ رہی سیوطی کی تضعیف، تو معلوم ہونا چاہئے کہ ان سے متقدم اور ان سے زیادہ مستند عالم نووی نے تشدید کو عوام کا لحن قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ نووی کا پایہ لغت میں سیوطی اور ابن دقیق العید سے کہیں بلند ہے۔

تیسری بات یہ کہ خود امام صاحب کے زمانے میں جو لوگ غزّالی بالتشدید بولا کرتے تھے ان کے پیش نظر یہی تھا کہ موصوف غَزْل یا غزّال کی طرف منسوب ہیں، کیونکہ ان کے خاندان میں یہ پیشہ رائج رہا ہے ــــ مگر امام موصوف اور ان کے نواسے نے اس کی تردید اس لئے ضروری سمجھی کہ یہ سب لوگوں کی قیاسی باتیں ہیں، حقیقت میں وہ اس پیشہ کی طرف نہیں بلکہ غزالہ گاؤں کی طرف منسوب ہیں۔

چوتھی بات یہ کہ "غزالی" کی نسبت سے امام صاحب، ان کے بھائی، چچا اور ان کی نسل کے دوسرے لوگوں کے علاوہ بہت سے حضرات مشہور ہیں[2]، کیا ان سب کا خاندانی

---

[1] یہ صرف میں ہی نہیں کہتا۔ دورِ حاضر کے بعض علماء نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ دیکھئے: عبداللطیف الطیباوی کی "التصوف الاسلامی العربی" ص ۴۴۔

[2] طوالت کے خوف سے ہم یہاں ہر ایک کا نام نہیں لکھ رہے ہیں۔ دیکھئے: طبقات الشافعیہ للسبکی ۴/ ۹؛ ۴/ ۲۴۲؛ ۴/ ۲۸۴؛ طبقات الشافعیہ للاسنوی ص ۳۴۷ ترجمہ نمبر ۸۸۶ (مخطوطہ کتب خانہ خدابخش پٹنہ)؛ کشف الظنون ۲/ ۲۶۱ (مطبعۃ العالم ۱۳۱۰ھ)؛ المنجد فی الاعلام ص ۳۷۷ (طبع بیروت ۱۹۶۹ء) وغیرہ۔

پیشہ ریسماں فروشی تھا؟ اگر یہ ثابت نہیں تو ممکن ہے ان کے "غزالی" کہلانے کی کوئی دوسری وجہ ہو ــــ پس ضروری نہیں کہ غَزّالی (مشدد) کو صحیح قرار دیکر اسے پیشہ کی طرف منسوب مانا جائے

(۲) معارف (اعظم گڑھ) کے فاضل مضمون نگار قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے لکھا ہے: "سب سے بڑی اور زندہ شہادت جو تشدید کی مؤید ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت شہر طوس (طابران) کے باہر امام صاحب کے خاندان کے کسی بزرگ کی قبر موجود ہے جس پر "غــزالی" بالتشدید کندہ ہے...... گو تشدید کی علامت بجائے ـّ کے صرف ـ ملا ہے"[1]

ہمارے نزدیک اسے تشدید سمجھنا ہی اولاً صحیح نہیں، ممکن ہے یہ، لفظ کی خالی جگہوں کو پُر کرنے اور انھیں مزین کرنے والی علامتوں میں سے ایک ہو، جیسا کہ عموماً کاتب حضرات ، ، ، و جیسی شکلیں الفاظ کے اوپر نیچے بنا دیا کرتے ہیں ــ ثانیاً اگر اسے تشدید مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان غَزّالی بہ تشدید ہی مشہور تھا، اس لئے انھوں نے اسی طرح عبارت کندہ کرائی۔ اس سے اصل حقیقت پر تو پردہ نہیں پڑتا۔

پھر گارڈنر (W.R.W. Gardner) کی جس کتاب سے یہ شہادت نقل کی گئی ہے اس کا نام "Algazali" ایک ہی زیڈ (z) سے ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مؤلف کے نزدیک یہ "سب سے بڑی اور زندہ شہادت" قابل قبول نہیں۔

(۳) ایک "بہت بڑی دلیل" یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ "غزالہ" طوس میں کسی گاؤں کا نام نہیں اس لئے غزالی کے بجائے غَزّالی صحیح ہے ــــ اس مغالطہ کی حقیقت

---

[1] معارف (اعظم گڈھ) جون ۱۹۲۹ء ــــ ۲۳/۶/۱۶ ۴م

پہلے واضح کر آئے ہیں۔ لہذا دوبارہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۴) اردو کی بعض کتب لغت میں غزّالی (بہ تشدید) کو غزّالہ (بہ تشدید) کی طرف منسوب بتایا گیا ہے[۱]۔ میرے خیال میں غالبًا ان کے مؤلفین نے اس لفظ سے متعلق زیادہ چھان بین نہ کی، بلکہ جو کچھ غلط سلط معلوم تھا اسے غیر ذمہ دارانہ طور پر لکھ دیا۔ ان کی یہ تحقیق انیق "تمام مؤرخین اور محققین کی تصریحات کے خلاف ہے جیسا کہ ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔

(۵) اس سے زیادہ حیرت مجھے میکڈونلڈ (D. B. Mackdonald) پر ہے۔ وہ اس مسئلہ پر ایک طویل نوٹ کے اخیر میں لکھتا ہے: "یہ اقوال کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک رہنمائی نہیں کرتے اس لئے میں نے غزّالی کو مشدد ہی لکھنا شروع کیا ہے جسے مشرق میں عام طور پر سند قبول حاصل ہے[۲]۔"

گویا مشدد لکھنے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، البتہ چونکہ مشرق میں عام طور پر یہی رائج ہے اس لئے یہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے ــــــ مگر ناظرین کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، علامہ احمد تیمور پاشا (م ۱۹۳۰ء) نے صحیح صورت حال اس طرح بیان کی ہے:

المشهور الآن بين أهل العلم عندنا ہمارے یہاں مصر میں اہل علم کے درمیان

---

[۱] لغات کشوری ص ۳۲۵ (منشی نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء)؛ جامع اللغات ص ۴۹۴ (طبع دوم الہ آباد ۱۹۶۸ء)۔ غنیمت ہے کہ نور اللغات ۳/۵۸۲ (طبع لکھنؤ ۱۳۴۷ھ) میں غزالی یا غزالہ پر کوئی حرکت نہیں ہے۔

[۲] Fourn of the Royal As Soc, 1902, PP.22; معارف جون ۱۹۲۹ء۔

مصر التخفیف۔ ویندر فیہام من یشدد۔ تخفیف ہی مشہور ہے، شاذ و نادر ہی کوئی السا
اظنہ کذلک فی غیر مصر ایضاً[ا] ملے گا جو تشدید پڑھتا لکھتا ہو، میرا خیال ہے
کہ مصر سے باہر بھی یہی صورت حال ہوگی۔

ں بھی اگر ہم ایک نظر مشرقی زبانوں پر ڈالیں تو ہر ایک میں عام رجحان تخفیف ہی کی طرف
ر آئے گا۔ اردو کے اشعار ہم نقل کر آئے ہیں۔ تمام میں تخفیف ہی کا استعمال کیا گیا ہے
لنے میں بھی عام طور پر تشدید کو ثقیل سمجھا جاتا ہے، اسی لئے تخفیف ہی زبان زدِ خاص و
م ہے ـــــ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ شبلی (م ۱۹۱۴ء) کی تشدید والی روش
یادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ خود ان کے شاگرد رشید مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء)
فیف کے حامی نظر آتے ہیں[۲]۔

عربی ادبا، و مؤرخین بھی تخفیف ہی کی طرف مائل ہیں[۳]۔ جرجی زیدان (م ۱۹۱۴ء) جیسے
د ہی اشخاص ایسے ملیں گے جنھیں تشدید پر اصرار ہے[۴]۔

فارسی میں تخفیف اور تشدید دونوں رائج ہیں، البتہ ترکی زبان میں ایک کتاب
م غزّالی" تالیف کردہ رضا رالدین بن فخرالدین کا پتہ چلا ہے، اس پر تشدید کی علامت

[ا] ضبط الاعلام ص ۱۱۰۔
[۲] دیکھیے: حکمائے اسلام ۱/ ۳۸۶ - ۳۸۷ (طبع اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء)۔
[۳] دیکھیے ـــ زرکلی: الاعلام ۷/ ۲۴۸؛ ۱/ ۲۰۸ (طبع دوم)؛ ڈاکٹر زکی مبارک: الاخلاق
د الغزالی ص ۲۹؛ محمد لطفی جمعہ: تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب ص ۴۳ (طبع مصر ۱۹۲۷ء)
ـــ وغیرہ بہت سے حضرات جنھوں نے غزالی پر کوئی کتاب یا مقالہ لکھا ہے۔
[۴] دیکھیے: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۳/ ۹۷ (طبع مصر ۱۹۱۴ء)؛ الہلال (مصر): پندرھواں
ال ص ۳۲۳۔

سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں اسی کا رواج زیادہ ہے۔

رہی مغربی زبانیں، تو ہم بلاکسی تردد کے کہہ سکتے ہیں کہ انگریزی، فرنچ، جرمن ہر ایک میں شاذ و نادر ہی کوئی ڈبل زیڈ (ZZ) لکھتا ہو۔ ورنہ تمام اہل قلم مصنفین اور مقالہ نگار ایک ہی زیڈ (Z) کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی ایک لمبی چوڑی فہرست میرے پاس موجود ہے اسے یہاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

خاتمۂ کلام اوپر کی تفصیلات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ قائلینِ تشدید کا موقف دلائل کی روشنی میں کمزور ہے۔ اس کے برخلاف قائلینِ تخفیف بجا طور پر صحیح پہلو اختیار کئے ہوئے ہیں۔

میں نے متقدمین کے تمام اقوال و آرار بلاکسی نقص و تغییر کے نقل کئے ہیں، متاخرین نے چونکہ ان ہی سے التقاط کیا ہے اس لئے ان کی تصریحات ان ہی مواقع پر پیش کی ہیں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، ورنہ عام طور پر ان سے استشنا نہیں کیا ہے۔ قارئین میں سے بعض حضرات اگر میرے استنتاج سے متفق نہ ہوں تو وہ ضرور اپنی رائے دلیل کے ساتھ پیش کریں۔

گزارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ اس وقت بے حد دشواری ہوتی ہے جب ایسے موقع پر آپ صرف نام لکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اور بعض حضرات تو صرف دستخط ہی کو کافی خیال کرتے ہیں۔

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات وتاثرات

(۷)

سعید احمد اکبر آبادی

آج جمعہ کا دن تھا۔ اس لئے لنچ سے فارغ ہوکر ہم سب لوگ شیر باؤ پارک (جو پہلے پولو گراؤنڈ تھا) پہونچے، لاہور کی بادشاہی مسجد کی طرح یہاں بھی پندرہ سولہ لاکھ سے کم کا مجمع نہ ہوگا۔ امام حرم کعبہ شیخ عبدالله بن سبیل نے امامت کی، نماز کے بعد کچھ مقامی اور بیرونی حضرات نے وعظ کے رنگ میں تقریریں کیں، اس سے فراغت ہوگئی تو سب لوگ قائد اعظم میموریل گئے، یہاں سے مندوبین کونیشنل میوزیم لایا گیا۔ یہاں قرآن مجید کے مخطوطات کی نمائش تھی، اس کا افتتاح پاکستان کے وزیر تعلیم میاں عطاء الله نے کیا۔ نمائش میں قرآن مجید کے بعض نہایت نادر اور نایاب نسخے، کوفی، ریحان، بہار، ثلث اور خط غبار وغیرہ مختلف خطوں میں اور یاقوت مستعصمی اور عبدالباقی حداد اور ابن سہروردی وغیرہم ایسے نامور خطاطوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور نہایت مرصع اور مطلا موجود تھے۔ میں نے قرآن مجید

کے مخطوطات کا سب سے بڑا اور عجیب و غریب ذخیرہ مشہد (ایران) میں دیکھا ہے اُس کے بعد یہ ذخیرہ دیکھ کر طبیعت بہت محظوظ ہوئی لیکن یہ سب کچھ بہت رواروی میں دیکھا، کیونکہ ابھی ایک اور مصروفیت تھی۔ اسے بھی نمٹا دینا تھا۔ چنانچہ پانچ بجے شام کو اہالیان شہر کراچی کی طرف سے ایک عظیم الشان استقبالیہ ہوا جس میں حسب قاعدہ و معمول مندوبین کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جسے حاجی قاسم عباس پٹیل نے پڑھا اور مندوبین کی طرف سے لیبیا کے وزیر شیخ عبد السلام نے اس کا جواب دیا، اس موقع پر مولانا قاری محمد طیب صاحب نے بھی مختصر تقریر میں سیرت کانفرنس کی اہمیت و افادیت اور حکومت پاکستان کی اس سلسلہ میں جد و جہد اور اُس کی مساعی پر شکر گذار آنہ روشنی ڈالی۔ شب میں ڈنر سندھ کے گورنر کی طرف سے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوا جو حسب معمول نہایت پرتکلف اور شاندار تھا۔ ڈنر کے بعد انھوں نے ایک تقریر کی، اُس کا جواب ہماری طرف سے یمن کے شیخ الصباحی نے دیا، شیخ محمد عبداللہ بن سبیل نے عالم میں امن و امان کے قیام اور مسلمانوں کے لئے توفیق خیر و عمل کے لئے دعا کی۔

دوسرے دن یعنی ۱۲ر مارچ کو کوئٹہ جانے کا پروگرام تھا، لیکن جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ یہ پروگرام منسوخ ہوگیا تھا، اس بنا پر آج کا دن شام تک خالی تھا، اس لئے اس سے بہتر موقع اور کیا ہوسکتا تھا، میں ناشتہ کرکے ابھی فارغ ہوا ہی تھا کہ مونا اور مسعودہ آگئے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے، میرے اعزہ اور اقربا اور دوست احباب جو کراچی میں پھیلے ہوئے ہیں اُن کو شب میں ریڈیو سے اور صبح اخبارات کے ذریعہ کوئٹہ کے پروگرام کے منسوخ ہونے کا علم ہو ہی گیا تھا، اس لئے مونا کے مکان پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا اور میں شام تک یہیں رہا۔

وزیراعظم کا استقبالیہ اور اُن کی تقریر پہلے سے مطبوعہ پروگرام میں تو نہیں تھا لیکن جب کوئٹہ کا سفر ملتوی ہوگیا تو اچانک وزیراعظم مسٹر بھٹو کی طرف سے استقبالیہ کا پروگرام بن گیا اور اُس کے دعوت نامے وقت کے وقت ہم لوگوں میں تقسیم ہوگئے، یہ استقبالیہ وزیراعظم سندھ کی کوٹھی پر پانچ بجے شام کو دیا گیا، مہمانوں کی نشست کا انتظام شامیانوں کے نیچے وسیع وعریض لان پر تھا۔ ہم لوگ وقت سے کچھ پہلے ہی ایک دائرہ کی شکل میں اپنی اپنی نشستوں میں جاکر بیٹھ گئے ٹھیک پانچ بجے تھے کہ وزیراعظم، مولانا کوثر نیازی، بعض اور وزراء اور باڈی گارڈ کے ساتھ تشریف لے آئے، بوٹا سا قد، نہایت اعلیٰ سوٹ میں ملبوس، چہرہ پر بھولاپن اور سادگی مگر اولوالعزمی، فراست اور ذہانت پیشانی اور بشرہ سے عیاں، آئے، لوگوں کا سلام لیا اور ایک صوفہ پر جو اُن کے لئے مخصوص تھا مولانا کوثر نیازی کے ساتھ بیٹھ گئے، اب قرآن مجید کی تلاوت ہوئی اور اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں ایک خاصی طویل تقریر کی، مسٹر بھٹو انگریزی زبان کے مشہور مقرر اور خطیب ہیں، اس لئے ادبی حیثیت سے اس تقریر کا جو پایہ ہوسکتا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے البتہ معنوی حیثیت سے انھوں نے جو کچھ کہا وہ دلچسپ اور قابل غور ہے:

انھوں نے مندوبین کی زحمت فرمائی کا شکریہ ادا کیا اور موضوع ومقصد کے لحاظ سے کانفرنس کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "آج کی دنیا میں تین طاقتیں بڑی ہیں جنھوں نے انسانی افکار وخیالات کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے، اور وہ یہ ہیں: (۱) مذہب (۲) نیشنلزم اور (۳) تصوریت (Idealism)، ان تینوں میں جنگ بپا ہے، لیکن دنیا کا امن وامان اور انسانی فلاح وبہبود کا دارومدار اس پر ہے کہ ان تینوں میں تطبیق اور باہمدگر صلح صفائی پیدا کی جائے۔ فاضل مقرر

نے یہ بات زور دیکر اور مکرر کہی اور پھر علمائے اسلام کو خطاب کر کے فرمایا: وقت کا مطالبہ اور تقاضہ ہے کہ آپ حضرات بیدار ہوں اور مسلمانوں کو یہ بتائیں کہ اسلام کی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کی روشنی میں ان تینوں میں تطبیق کی راہ کیا ہے؟ اور وہ کیونکر ممکن ہے، یہ وقت ان تینوں میں تصادم و تزاحم (Confrontation) کا نہیں ہے، بلکہ مصالحت و مسالمت (Reconciliation) کا ہے، اس سلسلہ میں اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ لاہور کے اجلاس سیرت میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم کو ماڈرن مین (Modern Man) کی ضرورت نہیں بلکہ مورل مین (Moral Man) کی ہے اگر واقعی ایسا کہا گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ یہ نظریہ غلط ہے، بلکہ ہم کو ایسے انسان کی ضرورت ہے جو بیک وقت ماڈرن (جدید) بھی ہو اور مورل (اخلاقی) بھی۔"

انھوں نے مزید کہا: "اسلام ایک زندہ اور فعال اور متحرک (dynamic) مذہب ہے، وہ انسانی تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور سائنس ٹکنالوجی میں ترقی کا مخالف نہیں بلکہ اُس کا ممد و معاون ہے اور جو جدید افکار و نظریات پیدا ہوں ان کا کیمیاوی تجزیہ و تحلیل کر کے خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرنے کی تحریص و ترغیب کرتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وقت کے تقاضہ اور مطالبہ سے جب نئے حالات پیش آتے ہیں تو علمائے کرام بالغ نظری سے اُن کا جائزہ لے کر فوراً کوئی فیصلہ نہیں کرتے اور اُن کا رویہ مقاومت مجہول کا اور منفی ہوتا ہے مگر وقت کے دھارے پر بند باندھنا تو کسی کے اختیار میں نہیں ہے، اس لئے جب پانی سر سے گذر جاتا ہے تو اب علما بیدار ہوتے ہیں، مگر وقت کا کارواں بہت آگے جا چکا ہوتا ہے اس لئے مسلمان ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان خرابیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے جو علما

کے منفی انداز فکر اور حالات زمانہ سے بے تعلقی کے باعث وقت کی جدید تحریکوں میں پیدا ہو گئی تھیں، اس سلسلہ میں انھوں نے زور دیکر کہا کہ کل جب عالم اسلام برطانوی اور فرانسیسی استعمار و شہنشاہیت کے پنجہ میں جکڑا ہوا تھا اُس وقت اسلامی ملکوں کے علمار نے استخلاص وطن کے لئے کیا جد وجہد کی، قوم کو کیا رہنمائی دی، اس ضمن میں انھوں نے پردہ کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ ہمارے قدیم طرز کے گھرانوں میں جس قسم کے پردہ کا چلن ہے وہ صرف خوشحال اور امیر گھروں میں نبھ سکتا ہے، غریب مزدوروں اور کسانوں کی عورتوں کو محنت مزدوری یا کھیتی باڑی کے کام کرنے ہوتے ہیں، وہ کسب معاش کے لئے اس پر مجبور ہیں، وہ کس طرح اس پردہ کو اختیار کر سکتی ہیں؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جن کو عہد حاضر کے معاشی اور سماجی حالات وظروف نے پیدا کر دیا ہے، علمائے کرام کو اسلام کی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں ان کا حل پیدا کرنا چاہئے۔" انھوں نے یہ بھی فرمایا:
"پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، میں نے اور میری گورنمنٹ نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ جس طرح بھی ہوگا ہم اسلام کی حفاظت اور اپنے تمام معاملات اور امور و مسائل میں اسلامی تعلیمات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کی پیروی کریں گے۔"

تقریر ختم ہوئی اور وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو ابھی اپنی نشست پر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ کویت کے وزیر اوقاف شیخ رفاعی ادبدا کے کھڑے ہو گئے اور بولنا شروع کر دیا، انھوں نے وزیراعظم کے لئے عزت واحترام کے جذبات کا اظہار اور اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور امور ذیل سے متعلق اپنا اختلاف بیان کیا۔

(۱) انھوں نے کہا کہ "اسلام خود ایک مکمل Idealogy اور مکمل دستور زندگی ہے، اس بنا پر اُس کو عہد حاضر کے کسی مدرسۂ فکر یا Idealogy سے مصالحت کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

(۲) یہ کہنا درست نہیں ہے کہ برطانوی یا فرانسیسی استعمار کے زمانہ میں علمائے اسلام خاموش رہے اور انھوں نے قوم کو کوئی روشنی نہیں دی، ہندوستان اور مصر میں ایسے علماء پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے استخلاص وطن کے لئے عظیم جدوجہد کی، قربانیاں دیں اور آخر کار وہ کامیاب ہوئے۔

(۳) پردہ کی نسبت انھوں نے کہا کہ یہ شریعت کا حکم ہے، اس میں ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

وزیراعظم مسٹر بھٹو نے اپنی تقریر میں افغانستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات میں یک گونہ بدمزگی اور ناخوش گواری کا ذکر بھی رنج اور افسوس کے ساتھ کیا تھا اس لئے شیخ رفاعی کے بعد افغانستانی مندوب ڈاکٹر روفی اللہ نائب وزیر تعلیم افغانستان نے ایک مختصر مگر نہایت معقول اور مصالحانہ تقریر کی، انھوں نے وزیراعظم کے ادب و احترام کی مکمل رعایت کے ساتھ اپنی اور افغانستان گورنمنٹ کی طرف سے پاکستان گورنمنٹ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کے بھائی اور پڑوسی ہیں، اس بنا پر اگر کچھ بدگمانیاں اور رنجشیں ہیں تو اُن کو باہمی گفت وشنید کے ذریعہ دور کرنا چاہیئے اور اس کے لئے افغانستان گورنمنٹ صدق دل اور خلوص کے ساتھ ہر وقت آمادہ ہے، میں گورنمنٹ کی طرف سے اس کا یقین دلاتا ہوں[1]

---

[1] ڈاکٹر روفی اللہ سمیعی نہایت خلیق و متواضع اور وسیع المطالعہ عالم و فاضل شخص ہیں، فارسی تو ان کی مادری زبان ہے ہی، انگریزی اور عربی زبان میں بھی اچھے مقرر ہیں، چند ملاقاتوں میں ان سے گہرا دوستانہ ہوگیا، میں فارسی شعراء میں عرفی اور نظیری کی طرح کلام بیدل کا عاشق ہوں، جناب موصوف نے میرے اس ذوق کی رعایت سے چار بڑے بڑے بنڈل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابھی یہ تقریر ختم ہوئی تھی کہ مغرب کا وقت ہوگیا، وہیں لان پر موذن نے اذان دی، نماز باجماعت کا پہلے سے انتظام تھا۔ وزیراعظم مسٹر بھٹو بھی اپنے عملہ کے ساتھ نماز میں شریک تھے، نماز سے فراغت کے بعد سب حضرات پنڈال میں جمع ہونے کے لئے آرہے تھے تو اس وقت مولانا کوثر نیازی میرے ساتھ تھے، میں نے ان سے کہا: "آخر وزیراعظم کی تقریر میں ایسی کونسی بات تھی جس کی تردید کرنا شیخ رفاعی کے لئے ضروری تھا؟ علاوہ ازیں میں نے کہا، میرے نزدیک یہ بھی نامناسب بات تھی کہ وزیراعظم کی استقبالیہ تقریر کے بعد کوئی شخص اس کی تردید میں تقریر کرے، افسوس ہے کہ اچھے اچھے لوگ بعض اوقات مجلسی آداب سے اس درجہ بیگانہ ہو جاتے ہیں۔" مولانا نے یہ سن کر فرمایا: "تو کیا آپ اس وقت تقریر کرنا پسند کریں گے؟" میں نے عرض کیا: "مجھے کوئی عذر نہیں ہے، لیکن پھر اگر میری تقریر کے جواب میں شیخ رفاعی یا کوئی اور عرب کھڑے ہوگئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مطبوعات افغانستان کے از راہ کرم مجھے افغانستان سے بھیجے ہیں جن میں بیدل کے کلام کی چار نہایت ضخیم جلدیں اور ایک جلد صلاح الدین سلجوقی کی کلام بیدل پر نقد و تبصرہ کی بھی ہیں، ان کے علاوہ امیر خسرو پر ایک کتاب، بعض شعراء کے دواوین اور تاریخ افغانستان پر ایک کتاب بھی ان بنڈلوں میں شامل ہیں، مراجعتِ وطن کے بعد سے اب تک موصوف سے خط و کتابت جاری ہے۔ انھوں نے مجھ سے یہ وعدہ بھی لیا ہے کہ کسی موقع سے اسلامیات پر چند لکچروں کے لئے وہ مجکو افغانستان آنے کی دعوت دیں گے تو میں اس دعوت کو منظور کرلوں گا۔ اس موقع پر یہ جتادینا بھی ضروری ہے کہ سیرت کانفرنس کی طرف سے مندوبین کا جو تعارف نامہ شائع ہوا ہے اس میں موصوف کا نام "وصی اللہ" لکھا ہوا ہے، لیکن اُن کے خطوط سے معلوم ہوا کہ ان کا نام وصی اللہ نہیں بلکہ ولی اللہ ہے۔

تو بہت برا ہوگا اور استقبالیہ کا میدان بحث و مناظرہ کا میدان بن جائے گا اور یہ سخت نامناسب بات ہوگی"

بہرحال بات رفت و گزشت ہوگئی، ہم سب لوگ جب پنڈال میں داخل ہوکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو مولانا کوثر نیازی نے مسٹر بھٹو سے پوچھا کہ وہ کیا شیخ رفاعی کے جواب میں تقریر فرمائیں گے، لیکن مسٹر بھٹو نے انکار کر دیا اور خاموش بیٹھ گئے، اب چائے کا دور شروع ہوا جو حسب معمول نہایت پرتکلف تھی، اس کے بعد مسٹر بھٹو اٹھے اور پورے پنڈال کا چکر لگا کر ہر ہر مندوب سے ملاقات کی اور مصافحہ کیا، مولانا کوثر نیازی اُن کے ساتھ تھے، وہ فرداً فرداً ہر شخص کا تعارف کراتے جاتے تھے، میں اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایک ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے، جب مسٹر بھٹو نے مسکرا کر گرمجوشی سے ہم سے مصافحہ کیا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کچھ فرمانا چاہتے تھے مگر کچھ دیر رُکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔

اس کے بعد انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں موتمر عالم اسلامی جس کے سکرٹری جناب انعام اللہ خاں صاحب بڑے سنجیدہ اور مخلص مسلمان ہیں اس کی طرف سے ایک استقبالیہ تھا۔ اس کی صدارت انڈونیشیا کے ڈاکٹر محمد ناصر نے کی، اس موقع پر اسلام کے تحفے" (Message of Islam) کے نام سے ایک فلم دکھائی گئی، اور موتمر عالم اسلامی (پاکستان) کی بعض مطبوعہ کتابیں مندوبین کو ہدیہ کی گئیں، لیکن میں اس پروگرام میں شریک نہ ہو سکا کیونکہ وزیراعظم کے استقبالیہ کے بعد سیدھا مسعودہ کے پاس چلا گیا۔ اور وہاں بچوں اور عزیزوں میں وقت گذاری کرتا رہا۔

رائٹرز فورم کا ڈنر

رائٹرز فورم آف پاکستان کا دفتر "حاجی کیمپ" میں ہے جو ایک نہایت وسیع اور شاندار بلڈنگ ہے، اس کے مالک مسٹر ولیکا ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کروڑپتی ہیں اور اُن بائیس خاندانوں میں سے ایک خاندان کے فرد

ہیں جن کے متعلق ایوب خاں مرحوم کے زمانہ میں مشہور تھا کہ پاکستان پر اقتصادی اعتبار سے قبضہ انھیں کا ہے۔ مسٹر ولیکا اس فورم کے صدر یا سکریٹری ہیں، ڈنر کا وقت ۸ ½ بجے تھا۔ میں مسعودہ اور مونا کے ساتھ حاجی بلڈنگ پہونچا تو منتظمین نے کار کو گیٹ پر ہی روک لیا، مونا جو خود کار چلا رہے تھے انھوں نے منتظمین سے حجت کرنی چاہی۔ لیکن میں نے روک دیا اور مسعودہ اور مونا کو واپس کر کے میں پاپیادہ بلڈنگ میں داخل ہوا۔ ابھی دو چار قدم چلا تھا کہ جناب قاری محمد زاہر قاسمی مل گئے جو پاکستان کے نہایت مشہور قاری، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بھتیجے اور سرکاری حلقوں میں رسوخ و اثر رکھتے ہیں، وہ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے اور پوچھا: "آپ پیدل کیسے؟ کار کہاں ہے؟" میں نے داستان سنائی تو سنتے ہی آگ بگولہ ہوگئے، نہایت درشت لہجہ میں گیٹ کے انچارج کو بلایا اور اس سے بازپرس کی کہ تم نے ایک معزز مہمان کے ساتھ ایسی بدتمیزی کیوں کی؟ قاری صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر بہت سے لوگ وہاں جمع ہوگئے، ان میں مسٹر ولیکا، میزبان خصوصی بھی تھے، انھوں نے مجھ سے معافی مانگی اور بات آئی گئی ہوگئی، اب قاری محمد زاہر قاسمی اور مسٹر ولیکا دونوں کا اصرار ہوا کہ مسعودہ اور مونا کو بھی بلوائیے، ہم کار بھیجے دیتے ہیں، اُن کے گھر کا پتہ آپ بتا دیجئے، مگر میں نے سختی سے منع کیا اور کہا کہ جب وہ مدعو نہیں ہیں تو اب اُن کو بلانا نہ آپ کے لئے مناسب ہے اور نہ اُن کے لئے۔

میرے آنے پر یہ ہنگامہ ہوا لیکن درحقیقت قصور میرا ہی تھا، اصل بات یہ ہے کہ مندوبین کو جو بیج (Badge) ملے تھے اسے ہر مندوب اپنے سینہ پر آویزاں کئے ہوئے تھا، لیکن میری عادت یہ ہے کہ میں کانفرنس میں تو اسے لگا لیتا ہوں پبلک میں نہیں لگاتا، اس بنا پر گیٹ کا انچارج یہ سمجھا کہ میں مندوب نہیں، بلکہ کوئی مقامی

آدمی ہوں، اور گیٹ کے اندر صرف مندوبین کی کاروں کے جانے کا انتظام تھا، اندر داخل ہوا تو زیبائش و آرائش اور نکہت و نزہت کا عجیب عالم تھا۔ تمام بلڈنگ اندر اور باہر سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی، کھانے کا انتظام شامیانوں کے نیچے تھا لیکن کھانے سے قبل نشست کا انتظام کھلے میدان میں اس طرح تھا کہ ایک وسیع چبوترہ پر صوفوں اور کرسیوں کو مندوبین کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور چبوترہ کے نیچے کرسیوں کی طولانی قطاریں تھیں وہ مقامی لوگوں کے لئے تھیں جو بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، ان میں پہلی تین قطاروں پر خواتین رونق افروز تھیں جو زرق برق پوشاکوں اور فیشن کے ساز و سامان کے باعث زینتِ بزم تھیں، کانفرنس کے دنوں میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ خواتین کا اتنا بڑا مجمع اور وہ بھی اس درجہ شوخ ملبوسات میں ایک مجلس میں نظر آیا تھا۔ میرا اُسی وقت ماتھا ٹھنکا کہ سعودی عربیہ کے علماء مردوں کی مجلس میں عورتوں کی شرکت کو اور وہ بھی اس شان خود نمائی و نگہ طلبی کے ساتھ سخت ناپسند کرتے ہیں خدا خیر ہی کرے۔

امام کعبہ کی برہمی

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ڈنر کا وقت ½۸ بجے تھا، وقت کی پابندی میری فطرت ہے۔ ٹھیک اس وقت میں پہونچ گیا تھا، آگے پیچھے مندوبین اور دوسرے مہمان سب آچکے تھے، لیکن نو بجے، ساڑھے نو اور دس ہوئے، اور کھانا شروع ہونے کا کوئی سان گمان نہیں، طبیعت سخت پریشان اور متوحش کہ الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر میں نے حکیم محمد سعید صاحب سے اس تاخیر خطیر کی وجہ پوچھی، انھوں نے بتایا کہ شیخ محمد عبداللہ بن سبیل ناراض ہو گئے ہیں، لوگ انھیں منانے گئے ہیں، وہ آجائیں تو کارروائی شروع ہو، آخر ساڑھے دس پونے گیارہ کا عمل ہوگا کہ امام صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے، فوراً کارروائی شروع ہوگئی، تلاوت کلام مجید اور استقبالیہ اڈریس کے بعد امام حرم کعبہ کھڑے ہوئے تو انھوں نے امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کا حق ادا کر دیا، انھوں نے فرمایا: "قرآن مجید میں صاف حکم ہے:
ولا یتبرجن تبرج الجاھلیۃ اور وَلَا یُبْدِینَ زِینَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا یعنی عورتیں
جب باہر نکلیں تو جاہلیت کے طور طریقوں کے مطابق نہ شوخ چشمی دکھائیں اور نہ اپنے
اعضا اور بناؤ سنگار کی نمائش کریں، مگر ہاں وہ اعضا اور وہ زیور جس کا ظاہر ہونا
ناگزیر ہو" علاوہ ازیں انھوں نے متعدد احادیث پڑھیں جو عورتوں کے لئے شرم و حیا،
حجاب اور مردوں کے ساتھ مخلوط نہ ہونے اور نماز میں مردوں اور لڑکوں کی
صفوں سے پیچھے ان کی صف بندی کے احکام کے بارہ میں تھیں۔

اس کے بعد انھوں نے نہایت افسوس اور دردمندی کے ساتھ کہا کہ اس وقت
مجھے یہ دیکھ کر سخت رنج اور ملال ہوا ہے کہ خواتین کو اگلی صفوں میں بٹھایا گیا ہے اور
مردوں کو اُن کے رُوبرو یا اُن کے پیچھے جگہ دی گئی ہے، امام صاحب نے زور دے کر
کہا کہ یہ قطعی طور پر شریعت کے احکام کی خلاف ورزی ہے اور خاص طور پر سیرت کانفرنس
ایسے مقدس اور متبرک موقع پر اس کا وقوع پذیر ہونا بیحد افسوسناک ہے، معمول کے
مطابق امام صاحب کی اس عربی تقریر کا ترجمہ انگریزی یا اردو میں ہونا چاہیئے،
لیکن اس شعر

دور اندیش مریضوں کی یہ عادت دیکھی
ہر طرف دیکھ لیا جب تری صورت دیکھی

کی مصلحت آموزی کی بدولت ارباب استقبالیہ نے اس تقریر کا ترجمہ اڑا دیا اس بنا پر بہت
سے لوگوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ امام صاحب کیا شرر باری کر گئے ہیں، تقریر کے بعد جب سب
نے تالیاں بجائیں تو لطف یہ ہے کہ عورتوں نے بھی تالیاں بجا کر امام صاحب
کی اُن پر نوازش کی داد دی، یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جن میں انگریزی کی ایک
کہاوت کے مطابق لاعلمی کی برکت کی بات (Ignorance is bliss) کہا گیا

ہے۔ کھانے بہت لذیذ اور متنوع تھے مگر مجھ بندۂ سود و زیاں کی قسمت میں کہاں؟ وقت نکل جاتا ہے تو کھا نہیں سکتا، ایک مرغ کی ٹانگ اٹھالی اور اُس سے شغل کرتا رہا۔

اخبارات میں وزیراعظم کی تقریر کی رپورٹ دوسرے دن یعنی ۱۴ مارچ کی صبح کو اخبارات پر نظر پڑی تو دیکھا کہ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے استقبالیہ اور اُن کی تقریر کی رپورٹ کے سلسلہ میں کویت اور افغانستان کے نمائندوں کی تقریروں کا تو کہیں ذکر تھا ہی نہیں، مسٹر بھٹو کی تقریر کا جو متن شائع ہوا تھا اُس میں بھی تقریر کے بعض اجزا حذف کر دیے گئے تھے۔ یہ دیکھکر معاً خیال آیا کہ ملک تقسیم ہو گیا، ایک کے تین بن گئے، دو سیکولر قرار پائے اور ایک ملک اسلامی کہلایا مگر حالات میں کس درجہ یکسانیت ہے، وہاں امرجنسی ہے تو یہاں بھی امرجنسی، پریس پر سنسر ہر ایک ملک میں، مخالف پارٹیوں نے یہاں اُودھم مچا رکھا تھا جس کے باعث امرجنسی لگی تو مخالف پارٹیوں نے وہاں بھی طوفان اٹھا رکھے ہیں جس کی وجہ سے حکومت کا رویہ سخت تر ہوتا چلا جا رہا ہے، جو قوانین ہندوستان میں بنے وہی پاکستان میں بن رہے ہیں، اقتصادی اور معاشی خوشحالی و ترقی کا پروگرام دونوں ملکوں میں یکساں ہے۔

لنچ آج دوپہر کو لنچ سندھ کے وزیر اوقاف کی طرف سے ایک ہوٹل میں ہوا۔ جس کا نام تو یاد نہیں رہا لیکن یہ ہوٹل سمندر کے کنارے ہے اور اسی مناسبت سے اس کا نام ہے، اعلیٰ قسم کے کھانوں کے ساتھ جگہ بہت پر لطف اور نزہت آفریں تھی اس لئے طبیعت بہت محظوظ اور منکیف ہوئی۔

ہمدرد نیشنل فاونڈیشن کا الوداعی ڈنر شب میں ہمدرد نیشنل فاونڈیشن کی طرف سے الوداعی ڈنر ہوا، اس کی تقریب یہ ہوئی کہ ڈاکٹر محمد الیاس

صاحب جو ہمدرد نیشنل فاونڈیشن کے منیجر ہیں اور حکیم محمد سعید صاحب کے قریبی رشتہ دار بھی اس وقت ان کی دختر نیک اختر کا نکاح تھا اور کثرت سے مرد اور خواتین مدعو تھے، حکیم محمد سعید صاحب نے اس دعوت کو ہی مندوبین کا الوداعی ڈنر قرار دے دیا، اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ممالک غیر کے حضرات کو پاکستان کے ایک مسلم گھرانہ میں شادی کی تقریبات کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر محمد الیاس میرے سینٹ اسٹیفنس کالج کے زمانہ کے شاگرد ہیں اور اُس وقت سے اُن کو میرے ساتھ محبت اور تعلق خاطر ہے اس لئے انھوں نے میرے ساتھ مسعودہ اور مونا کو بھی مدعو کر دیا تھا، میں لنچ کے بعد ہوٹل آنے کے بجائے سیدھا بچوں کے پاس چلا گیا اور نکاح اور ڈنر میں شرکت کے لئے مسعودہ اور مونا کے ساتھ یہاں پہونچا تو ایک جم غفیر دیکھا، مردوں اور خواتین کا انتظام الگ الگ تھا، یہاں کراچی کے بہت سے احباب سے بھی ملاقات ہوگئی، نکاح امام حرم شیخ محمد عبداللہ بن سبیل نے پڑھا، پوری تقریب بڑی سادگی سے اور خالص اسلامی طریقہ پر منائی گئی، نہ دھوم دھڑکا، نہ بینڈ باجا، نہ زیبائش و آرائش، نہ دکھاوا اور نہ نمائش، اس سادگی کو دیکھکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

بنگلہ دیش کے وفد سے ملاقات یہاں بنگلہ دیش کے وفد سے بھی ملاقات ہوئی، میں نے ان کو کانفرنس میں نہیں دیکھا، شاید ابھی دو ایک دن پہلے آئے تھے، یہ وفد دو حضرات پر مشتمل تھا ایک مولانا ایوب علی جو آج کل مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل ہیں اور دوسرے پروفیسر سراج الحق! حکیم محمد سعید صاحب نے تعارف کرایا تو مولانا ایوب علی صاحب نے میرا نام سنتے ہی لپک کر مجھ سے مصافحہ کیا اور حکیم صاحب کو خطاب کر کے فرمایا کہ "مولانا اکبر آبادی کو ہمارے ہاں کون نہیں جانتا، کیونکہ جس زمانہ میں یہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل تھے اس زمانہ میں ہمارے ہاں کے مدارس میں بھی ان کی شہرت تھی اور طلبا و اساتذہ میں ان کا چرچا رہتا تھا۔" پھر مجھ سے مخاطب

فرمایا کہ اسی زمانہ میں ایک مرتبہ میں آپ سے مدرسۂ عالیہ، کلکتہ میں ملا بھی ہوں، آپ کو یاد نہیں ہوگا۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا: "جشن امام بخاری کے موقع پر ہمارا جو وفد روس گیا تھا اس نے بنگلہ دیش واپس ہو کر آپ کی بڑی تعریف کی تھی کہ بے تکلف عربی بولتے ہیں اور سمرقند، بخارا اور تاشقند کے عظیم اجتماعاتِ مساجد میں عربی میں خوب تقریریں کیں جن کا ترجمہ روسی زبان میں روس کے مفتی ضیاء الدین بابا خان کرتے تھے۔" میں نے عرض کیا: اس قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ! اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ روس کے دورانِ قیام میں ہر جگہ ہمارے ہندوستانی وفد اور بنگلہ دیش کے وفد کا قیام پاس پاس ہی رہا، اس لئے ہر وقت اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سیر و تفریح ساتھ ساتھ ہی رہتا تھا، اس لئے ان سے بڑا دوستانہ ہو گیا اور متعدد مواقع پر میں نے بنگلہ دیش وفد کی عربی میں ترجمانی کا فرض بھی انجام دیا جس سے وہ حضرات میرے بڑے شکر گذار ہوئے، مونا بہت اچھی بنگلہ بول لیتے ہیں، میں نے مولانا سے اُن کا تعارف کرایا اور مونا نے ان سے بنگلہ میں بات چیت کی تو مولانا نہایت خوش ہوئے اور بولے: "اکبر آبادی صاحب! آپ کے داماد تو بہت اچھی بنگلہ بولتے ہیں۔" میں نے ہنسکر کہا: "جی ہاں! مگر پھر بھی آپ نے اِن کو وہاں رہنے نہیں دیا۔" مولانا جیسے کھسیانے ہو کر خاموش ہو گئے۔

(باقی)

تبصرے

الرشید، لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر مرتبہ: مولانا عبدالرشید ارشد، تقطیع کلاں، ضخامت آٹھ سو صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ اعلیٰ، پتہ: جامعہ رشیدیہ ساہیوال، پاکستان۔

الرشید پاکستان کا مشہور علمی اور دینی ماہنامہ ہے اُس کا یہ خاص نمبر دارالعلوم دیوبند پر ہے۔ پاکستانی رسائل نے اپنے خاص نمبروں کے معاملہ میں جو روایت قائم کی ہے الرشید کا یہ خاص نمبر اس روایت کا بہمہ وجوہ حامل ہے، چنانچہ بڑی تقطیع پر باریک کتابت کے دو کالمی صفحات اور کاغذ وغیرہ کی سخت گرانی کے باوجود یہ نمبر بیحد ضخیم ہے اور مضامین و مقالات بھی ایک سے ایک اعلیٰ، معلومات انگیز اور بصیرت افروز ہیں، دارالعلوم دیوبند جس کی عمر اب ایک سو پندرہ برس ہوگئی اس نے اس مدت میں علوم و فنون دینیہ واسلامیہ اور دین قیم کی علم و عمل کے مختلف شعبوں میں کیا اور کیسی خدمات انجام دی ہیں، یہاں کیسے کیسے ارباب فن اساتذہ، ارباب صلاح و تقویٰ علماء اور اصحاب معرفت و طریقت مشائخ پیدا ہوئے کس نے کس فن میں نمایاں شہرت اور کامیابی حاصل کی، اُن کے علمی کارنامے کتنے اور کس نوعیت کے ہیں اور مدارس عربیہ انڈو پاک میں اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ اور ان سے متعلق دوسرے عنوانات و مباحث پر اس مجموعہ میں جو مقالات ہیں وہ جذباتی اور دعوتی رنگ کے نہیں، بلکہ علمی اور تاریخی اسلوب کے حامل ہیں اور یہ جس محنت و کاوش، تحقیق و جستجو اور مستند معلومات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں ان کی وجہ سے کوئی شبہ نہیں کہ یہ خاص نمبر دارالعلوم دیوبند گزیٹر اور ایک تاریخی دستاویز کی

حیثیت رکھتا ہے، اس بنا پر برصغیر ہند و پاک میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کا جو نظام تعلیم رہا ہے اُس کا کوئی طالب علم اس نمبر سے مستغنی نہیں ہو سکتا، یوں تو سب ہی مضامین نثر و نظم لائق مطالعہ ہیں تاہم مقالات ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں: "پیش لفظ" ڈاکٹر خالد محمود، "طبقاتِ مشاہیر" مولانا فاضل حبیب اللہ، دارالعلوم دیوبند پر علمی و تحقیقی مقالہ پیرزادہ احمد حسن جامی، دارالعلوم دیوبند کا ماضی و حال ندیم الواجدی علمائے دیوبند سرحد کی تصنیفی خدمات قاری فیوض الرحمٰن، اکابرِ دیوبند تحقیق و تدقیق کے آئینہ میں مولانا مقبول احمد۔ امید ہے ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔ (س۔ ا)

مسعود عالم ندوی (سوانح و مکتوبات) از اختر راہی ایم اے، کتابت طباعت عمدہ، کاغذ رف، صفحات ۱۰۳۔ تقطیع خورد۔ قیمت چھ روپے۔ پتہ: مکتبہ ظفر ناشر: قرآنی قطعات۔ گجرات، محلہ فیض آباد۔ سرگودھا روڈ۔

مولانا مسعود عالم ندوی ہند و پاک کے ان ممتاز علماء میں تھے جن کے علم و فضل اور عربیت کا اعتراف ممالک عرب میں بھی کیا گیا۔ افسوس ہے عمر بھر نہ صحت نے ساتھ دیا نہ زندگی نے وفا کی پھر بھی آٹھ تالیفات وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ جناب اختر راہی صاحب نے اس کتاب میں مولانا مرحوم کی زندگی کے اہم گوشے مختصر مگر جامع انداز میں واضح کئے ہیں، جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے یہ سوانح بھی ہے اور مجموعۂ مکتوبات بھی چنانچہ ۲۹ صفحات سوانح کے ہیں باقی مکتوبات کے۔ ان میں دو خطوں کا فوٹو بھی دیا گیا ہے، خطوط پر جا بجا توضیحی نوٹ بھی ہیں، یہ خطوط بجائے خود ایک سوانح ہیں۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا علم و فضل کے باوجود ندوی عصبیت سے خالی نہیں تھے چنانچہ انھوں نے ایک خط میں ایک ندوی عالم کے مقابلہ میں مولانا

حفظ الرحمن صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب (جن کو غلطی سے سعید احمد لکھا ہے) کا جس لب و لہجہ میں تذکرہ کیا ہے وہ ان کے مرتبۂ علم سے فروتر ہے، بہرحال علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت سے یہ مجموعہ دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔ لائق مرتب نے مکتوب الیہم کا تعارف کرا کر کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

(طارق)

حج و مقامات حج از مولانا محمد رابع حسنی ندوی، کتابت و طباعت معیاری، صفحات ۱۷۶۔ قیمت پانچ روپے پتہ: دار عرفات، رائے بریلی

حج کے موضوع پر اردو زبان میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حج کے مختصر آداب و فضائل کے بعد حج و زیارت سے متعلق اہم مقامات کا تعارف ان کے باہمی فاصلوں کی تعیین اور ان کی جغرافی تشریح کی گئی ہے، اندازِ بیان سلجھا ہوا اور ماہرانہ ہے۔ فاضل مؤلف جغرافیائی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک عرصہ تک دیارِ عرب میں قیام کر کے بار بار ان تمام مقامات کو دیکھ چکے ہیں اس لئے یہ کتاب اہل ذوق کے لئے ایک اچھے رہنما کا کام دے سکتی ہے۔

فضائل کے سلسلے میں یا آگے امکنۂ زیارت کا تعارف کراتے ہوئے جو روایاتِ حدیث ذکر کی گئی ہیں ان میں حوالوں کی کمی کھٹکی، جحفہ جہاں بھی آیا ہے ہر جگہ اس طرح لکھا ہے کہ یہ پتہ چلنا مشکل ہوتا ہے کہ پہلے جیم ہے یا حاء ایسے الفاظ میں عربی کا جدید طریقہ اس طرح "جُحْفَہ" گوارا کر لینا چاہئے۔ شروع کتاب میں بعض الفاظ پر اعراب لگانے کی ضرورت تھی جیسے سعی، ملتزم، مسفلہ، جبل ابو قبیس وغیرہ، شروع میں ایک جگہ حج سے متعلق چند مقامات کے باہمی فاصلوں کی فہرست دی گئی ہے اس کا عنوان "حج کے تعلق سے۔۔۔" قائم کیا گیا ہے یہ ترکیب خالص دکنی ترکیب ہے۔

کتاب میں متعدد نقشے بھی شامل ہیں جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔

لیکن یہ سب جناب مؤلف نے خود اپنے قلم سے تیار کئے ہیں اس لئے صاف نہیں آئے اگر خوشنویس ہی سے اپنی خصوصی نگرانی میں تیار کرائے جاتے تو خوبصورت بھی ہوتے اور قارئین کے لئے ان کا پڑھنا بھی آسان ہوتا۔ شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا تعارفی مقدمہ ہے۔

کتاب ہر لحاظ سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو حج کا ارادہ رکھتے ہوں۔

(طارق)

مسلمانانِ ہند سے کچھ صاف صاف باتیں از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کتابت و طباعت بہتر۔ صفحات ۳۰۔ سائز خورد۔ قیمت ۷۵/-

پتہ: مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ۔

یہ کتابچہ مولانا موصوف کا ایک مضمون ہے جو پہلے اخبار "ندائے ملت" میں پھر کتابی شکل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے اور اب مجلس مذکور کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں ہندوستانی مسلمانوں کو شرک و بدعت اور اعتقادی و عملی خرابیوں سے بچکر صحیح اسلامی طرزِ زندگی اپنانے اور دوسروں کے سامنے اپنی زندگی کو قابل نمونہ بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ مضمون کا انداز بیان اثرانگیز اور دلچسپ ہے۔

(طارق)

عرس کی حقیقت از محمد اشفاق حسین صاحب کتابت و طباعت گوارا

صفحات ۱۵۰ سائز خورد پتہ: مکتبہ مرکزی جماعت اہل حدیث دکن۔ (ا ے پی)

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ مشائخ حقہ اور رہنمایانِ طریقت جو ایک تو اپنا

تعلق ان کے معتقدین کو ہوتا ہے وہ عموماً نہ کوشش و تدبیر سے پیدا ہوتا ہے نہ اس میں کسی دنیوی غرض اور کسی سیاسی مفاد کو دخل ہوتا ہے، یہ شخصیت جب دنیا سے چلی جاتی ہے تو یہ معتقدین کی جماعت ان کے مزار سے بھی وہی عقیدت رکھنا چاہتی ہے اور یہاں سے ان خرابیوں کی ابتدا ہوتی ہے جو اس وقت بعض مقامات پر تو ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔

عرس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس معاملے میں زیادہ خدمات جماعت اہل حدیث ہی کی ہیں مگر عموماً انداز تحریر غیر علمی اور جذباتی ہو جانے کی وجہ سے افادیت کی توقع ختم ہو جاتی ہے، حالانکہ ضرورت ان کے معایب کی فہرست سنا دینے یا ان کی حرکتوں پر جو غصہ دوسرے لوگوں کو آتا ہے اس کا ٹھنڈا کرنا یا جھنجھلاہٹ اتارنا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ ہر خادم شریعت کا اصل منشار اصلاح ہے اور وہی اس ترش کلامی سے ختم ہو جاتا ہے مگر خوشی کی بات ہے کہ فاضل مؤلف نے جو انداز نگارش اختیار کیا ہے وہ سنجیدہ علمی اور معقولیت پسندانہ ہے۔ اگرچہ سفر زیارت نبوی کے سلسلے میں اس میں اسی مسلک کی ترجمانی کی گئی ہے جو امام ابن تیمیہ کا بدنام زمانہ مسلک ہے۔

بہر حال اس کتاب کی جزوی چیزوں سے قطع نظر جہاں تک مقصد کا تعلق ہے اس میں یہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ امید ہے کہ عام مسلمان اور اہل عرس میں سے بھی اعتدال پسند حضرات اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے اور مفید پائیں گے۔

(طارق)

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہمِ قرآن ۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبیِ عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحیِ الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظامِ حکومت ۔ سیریز ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی اُمیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی ؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر ۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن ۔ اسلام کا نظامِ مساجد ۔
اشاعتِ اسلام ، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا ۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابتِ حدیث ۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت ۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

جلد ۷۷ | بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۶ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

معاصر معارف سے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ مطبوعاتِ دار المصنفین اعظم گڈھ کی پاکستان میں ناجائز اشاعت اور ان کی فروختگی کا جو معاملہ کم وبیش ایک برس سے چل رہا تھا وہ بحمد اللہ بخیر وخوبی اس طرح ختم ہو گیا کہ مولانا کوثر نیازی صاحب نے ذاتی طور پر اس سے دلچسپی لی اور اُن کی تجویز کے مطابق نیشنل بک فاونڈیشن نے جو پاکستان کا سرکاری ادارہ ہے پاکستانی روپیہ کے حساب سے دار المصنفین کی ایک سو پندرہ کتابوں کا پاکستان کے لئے حقِ اشاعت پندرہ لاکھ روپیہ میں خرید لیا ہے، اس طرح اب کسی کو ان کتابوں میں سے کسی کتاب کو ناجائز طور پر چھاپنے کی جرأت نہ ہوگی۔

ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات میں جو خوشگواری پیدا ہو رہی ہے اس معاملہ کو بھی اس کا ایک ثمرِ خوش اثر باور کرنا چاہیئے، ورنہ ۶۹ء میں جب خاکسار راقم الحروف پہلی مرتبہ پاکستان گیا تھا تو اُس زمانہ میں وہاں کی گورنمنٹ کے ایک سرکلر کے ماتحت کسی ہندوستانی کی کتاب نہ کوئی لائبریری خرید سکتی تھی اور نہ وہ پاکستان میں کہیں نصاب میں داخل ہو سکتی تھی، علامہ علاء الدین صدیقی جو میرے نہایت مخلص دوست ہیں اُس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے وائس چانسلر تھے، انھوں نے خود بیان کیا کہ اس سرکلر کی وجہ سے ہم سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں، کیونکہ اردو

زبان میں اسلامیات پر جس پایہ کی کتابیں ہندوستان میں لکھی گئی اور چھپی ہیں پاکستان میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں، اگر ہماری لائبریریاں اور ہمارے ہاں اسلامیات کا نصاب ان کتابوں سے خالی رہے تو پھر ہمارے پاس رہے گا ہی کیا؟ علامہ موصوف نے یہ بھی فرمایا: آپ کی دو کتابیں "صدیق اکبرؓ" اور "مسلمانوں کا عروج و زوال" پنجاب یونیورسٹی، لاہور، کراچی یونیورسٹی اور ڈھاکہ یونیورسٹی تینوں جگہ اسلامی تاریخ کے نصاب میں شامل چلی آرہی تھیں، لیکن اس سرکلر کے ماتحت اب خارج کردی گئی ہیں جس کا ہم لوگوں کو بے حد افسوس ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی تعلقات کی طرف یہ ایک مستحسن قدم ہے اور آئندہ ان میں اور ترقی ہوگی، یہاں تک کہ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے مصنفین کی کتابوں اور تحریروں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ دونوں ملکوں میں باہم طلبا اور اساتذہ کا تبادلہ ہوگا اور ایک ملک کے اسکالر اور دانشور بے تکلف دوسرے ملک کے سیمیناروں، کانفرنسوں اور علمی و ادبی اجتماعات میں شریک ہوسکیں گے۔

دار المصنفین کے اس معاملہ کے لئے حکومت ہند اور حکومت پاکستان دونوں اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، حکومت پاکستان اس لئے کہ اس نے اپنے عمل سے ہندوستان کے ایک علمی اور اسلامی ادارہ کی بروقت امداد کرکے اس کو موت و حیات کی کشمکش اور عظیم خسارہ اور نقصان سے بچالیا اور حکومت ہند اس لئے کہ اس نے فراخدلی سے ایک ہندوستانی ادارہ کو پاکستان سے یہ لین دین کرنے کی اجازت دی، لیکن اس پورے ڈرامہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے جو رول ادا کیا ہے وہ بھی بڑا سزاوار تحسین و آفرین ہے، انھوں نے معارف میں بڑا شور و غل مچایا، پاکستان کے متعدد سفر کئے، کئی کئی مہینے وہاں

پٹے رہے، کراچی کے ارباب علم اور مشاہیر کی ہمدردی حاصل کی، ان سے اخبارات میں اپیلیں اور بیانات شائع کرائے، پھر جب دفتری کارروائی شروع ہوئی تو اس کی نگرانی کرتے اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر کی طرف دوڑتے اور بھاگتے رہے، جن لوگوں کو اس طرح کے معاملات میں حکومت کے دفتری کاموں کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس راہ میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، لیکن موصوف نے صبر و استقلال اور ہمت و پامردی سے یہ سب کچھ برداشت کیا اور آخر جو تحریک انھوں نے شروع کی تھی اسے بحسن و خوبی انجام پذیر کرکے وہ اپنے وطن واپس آگئے، دارالمصنفین ان کا جتنا شکرگذار ہو کم ہے، ہم اس کامیابی پر دارالمصنفین اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اب عرب ملکوں کے موجودہ انداز و طرزِ تحریر و تقریر کے مطابق عربی میں لکھنے اور بولنے والے طلبہ کی نسل برابر بڑھ رہی اور ترقی کر رہی ہے، چنانچہ گذشتہ چند ماہ سے دارالعلوم دیوبند سے ایک پندرہ روزہ مجلہ الداعی کے نام سے عربی میں مولوی بدرالحسن القاسمی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے جو نوعمر ہیں اور ابھی چند ہی برس ہوئے کہ دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں، یہ جریدہ اخباری سائز کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور خبروں کی ترتیب اور تعنون، مضامین و مقالات، ادارتی ملاحظات، ٹائپ یا کتابت، طباعت اور کاغذ، غرض کہ ظاہری اور معنوی حسن و جمال کے اعتبار سے وہ بہمہ وجوہ دارالعلوم دیوبند کے شایانِ شان ہے، اس

میں جو مضامین ہوتے ہیں وہ خواہ اوریجنل ہوں یا اردو سے عربی میں ترجمہ اکثر و بیشتر طلبار کے قلم سے ہوتے ہیں، اللھم کثر امثالھم وبارک فی اعمالھم

یہ دیکھ کر بھی بڑی مسرت ہوتی ہے کہ اب ہمارے مدارسِ عربیہ کے طلبا میں بھی ذوقِ علمی وتحقیقی ترقی کر رہا ہے وہ بیش پا افتادہ مسائل وعظ وتذکیر اور فقہ، تفسیر اور حدیث کے چند مخصوص مسائل ومباحثِ درسیہ کے دائرہ سے نکل کر اسلامی علوم وفنون کے مختلف پہلوؤں کا محنت اور شوق سے مطالعہ کرتے ہیں اور اپنا حاصلِ مطالعہ مقالہ کی شکل میں منضبط کر دیتے ہیں، ہمیں اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ گذشتہ مہینوں میں برہان میں جو اعلیٰ قسم کے اعلیٰ مضامین شائع ہوئے ہیں اُن کے مصنفوں سے جب ملاقات ہوئی تو یہ دیکھکر سخت مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ یہ بیس بائیس سال کے نوجوان ہیں اور کسی مدرسۂ عربیہ سے ابھی فارغ ہوئے ہیں، ایسے نوجوان قوم کی امانت ہیں، قوم کا فرض اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ یہ نوجوان فکرِ معاش میں مبتلا ہو کر ضائع نہ ہوں اور ان کی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ اس سلسلہ میں مدارسِ عربیہ اور ان کے چندہ دہندگان کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ہاں کی تنخواہوں اور مدرسہ کی زندگی کا معیار اونچا کریں تاکہ لائق و قابل فارغ التحصیل طلبار کے لئے ان میں کشش ہو اور وہ مدارس کی ملازمت سے بددل ہو کر کسی اور راہ کے اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

اجتہاد کا تاریخی پس منظر

جناب مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

قرآن حکیم

قرآن حکیم اللہ کی کتاب اور زندگی و معاشرہ کے قانون کا اصل سرچشمہ ہے۔ اس میں قانون کے مقاصد۔ بندوں کے مصالح اور دستوری حیثیت کے اصول و کلیات بیان ہوئے ہیں جن پر قانون اور اجتہاد کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ قانونی جزئیات کا ذکر بہت کم ہے لیکن جس قدر بھی ہے وہ بطور "نمونہ" بنیاد کی تشریح و توضیح کے لیے ہے تاکہ ان کی روشنی میں نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لیے اخذ و استنباط یا اجتہاد کا سلسلہ جاری رہے۔

یہ طریقِ کار دوامی اور عالمگیر حیثیت رکھنے والی کتاب کے لیے ناگزیر ہے کیوں کہ بیک وقت اگر زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق قانون کی تفصیل بیان کر دی جاتی اور ہر ایک کے عملی شکل کا خاکہ تیار کر دیا جاتا تو اس کی رہنمائی میں وہ جامعیت و جاذبیت نہ پیدا ہوتی دور روزمانہ میں زندگی و معاشرہ کے نئے مسائل حل کرنے یا موجود مسائل کو نئے حالات پر منطبق کرنے کے لئے شعوری اجتہاد کو درکار ہے۔

القرآن علی اختصارہ جامع ولا یکون جامعا الا والمجموع فیہ امور کلیات[1]	قرآن مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے جس کی شکل یہ ہے کہ وہ امور کلیہ کا مجموعہ ہے۔

(۱) حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

دوسری جگہ ہے:۔

تعریف القرآن بالاحکام الشرعیۃ اکثرہ کلی لاجزئی وحیث جاء جزئیاً فمأخذہ علی الکلیۃ[1]

شرعی احکام قرآن میں کلی طور پر بیان ہوئے ہیں جہاں جزئی تفصیل ہے وہ کسی حکم کلی کے تحت ہے۔

رسول اللہ کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرآن حکیم کی تشریح و توضیح اور اسی کی معنوی دلالت سے اخذ واستنباط کی ہوئی ہے اس بنا پر بلاشبہ وہ اس درجہ میں ہے کہ قرآن کے بعد قانون کا سرچشمہ قرار پائے اور شعور اجتہاد اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ نبوت کا خاصہ حقیقت کا کلی ادراک ہے جس کے بعد شعور نبوت کو غیر معمولی اخذ واستنباط کی صلاحیت پیدا ہو جاتی اور زندگی و معاشرہ کے بہت سے ان گوشوں تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے جن تک دوسروں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

ایسی حالت میں اگر شعور اجتہاد نے اس سے رہنمائی نہ حاصل کی تو نہ صرف یہ کہ زندگی و معاشرہ اور اجتہاد کے بہت سے گوشے نظروں سے مخفی رہ جائیں گے بلکہ اجتہاد نبوت کی قائم مقامی کے شرف سے بھی محروم ہو جائے گا پھر اس کی حیثیت آزادانہ رائے کی ہوگی جس کی اسلام کے قانونی نظام میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اجتہاد کی مناسبت سے چند مثالیں ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و توضیح اور آپ کے اخذ واستنباط کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اجتہاد و شعور کو رہنمائی ملتی ہے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ حکیم میں مذکور اصول و کلیات کی روشنی میں بہت سے مروجہ موجودہ مسائل کا حکم بیان کیا جس کی حیثیت تشریح و توضیح کی تھی۔ مثلاً یہ آیت ہے:۔

---

[1] شاطبی۔ الموافقات ج ۳ الطرف الثانی الادلۃ علی التفصیل الدلیل الاول کتاب العزیز المسألۃ الخامسۃ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔

اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی رضا مندی سے تو اجازت ہے

اس میں دو اصول بیان کئے گئے ہیں ایک سلبی اور دوسرا ایجابی پہلے میں ناحق کسی کا مال کھانے کی ممانعت ہے اور دوسرے میں حق کے ساتھ باہمی رضامندی سے اجازت ہے ان دونوں کی روشنی میں رسول اللہ نے مروّجہ معاملات کا جائزہ لیا اور ان سب کو ناجائز قرار دیا جن میں دھوکہ پایا جاتا تھا اور بالآخر ناحق مال کھانے کی شکل نکلتی تھی۔ عرب میں خرید و فروخت کی مروّجہ بہت سی شکلیں ان دونوں اصول کے تحت جائز یا ناجائز قرار پائیں مثلاً خریدار و بائع (بیچنے والا) کسی چیز کا بھاؤ کرتے تھے اور دیکھنے و طے ہونے سے پہلے خریدار اس کو چھو لیتا یا بیچنے والا خریدار کی طرف پھینک دیتا یا خریدار اس پر کنکری رکھدیتا تو ان سب صورتوں میں بیع مکمل ہو جاتی تھی۔ ان معاملات میں چوں کہ فریقین کی رضامندی موجود تھی۔ اس بار ان کو ایجابی اصول کے تحت آنا چاہیے تھا۔ لیکن رسول اللہ کی تشریح و توضیح نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ جس رضامندی میں دھوکہ فریب کا خطرہ ہو اور خطرہ ظاہر ہونے کے بعد اس رضامندی کا نتیجہ ناحق مال کھانے کی شکل میں ظاہر ہو تو وہ بھی سلبی اصول کے تحت آئے گا۔

(۲) اصل کو فرع پر منطبق کر کے دکھایا جس سے دوسری فرع کا حکم نکالنے میں سہولت ہوئی اوپر کی آیت اصل ہے اور موجودہ مروّجہ معاملات فرع ہیں اصل میں حرمت و ممانعت کی علت ناحق مال کھانا ہے یہ علت جتنے معاملات میں پائی جائے گی وہ سب حرام و ناجائز ہوں گے خواہ اس وقت موجود ہوں یا بعد میں ہوں۔ ابتدا میں علت پائی جاتی ہو یا آخر میں، جب کہ دھوکہ و فریب ظاہر ہو۔

(۳) جزئی قوانین جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں ان کے موقع و محل متعین کیے جیسے تیمم و نماز

قصر کے مواقع بیان کئے اور شرعی رخصتوں کے محل متعین کئے کہ کس جگہ ان رخصتوں پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور کس جگہ نہیں ہے۔

(۴) قانون کی شرطیں رکاوٹیں اور قیدیں وغیرہ بیان کی جن کے بغیر ان پر صحیح عمل درآمد دشوار تھا۔ مثلاً نکاح۔ طلاق۔ خرید و فروخت وغیرہ کی تفصیل جس سے صحیح و غلط اور حلال وحرام کے درمیان امتیاز قائم ہوا۔

(۵) نئے قوانین بیان کیے جن کا صریح ذکر اگرچہ قرآن میں نہیں ہے لیکن وہ اس کی معنوی دلالت میں موجود ہیں مثلاً پھوپھی کی موجودگی میں بھتیجی سے نکاح یا خالہ کی موجودگی میں بھانجی سے نکاح حرام قرار دیا وغیرہ

(۶) مطلق آیتوں کی تفصیل کی اور مواقع و محل کے لحاظ سے ان کو مقید کیا جیسے معروف منکر۔ طیبات اور خبائث کے تحت بہت سی مروجہ چیزوں کا حکم بیان کیا یا جرائم کی سزاؤں سے متعلق آیتوں کو موقع و محل کے لحاظ سے مقید کر کے ان پر عمل درآمد واضح کیا۔

(۷) مجمل آیتوں کی تشریح کی جس کے بغیر صحیح مفہوم سے واقفیت اور ان پر عمل درآمد دشوار تھا۔ مثلاً صلوٰۃ۔ زکوٰۃ اور صوم وغیرہ سے متعلق آیتوں کی تشریح کی ان کی عملی کیفیت بیان کی۔

(۸) جزئی واقعات اور کلی قواعد سے مدد حاصل کر کے نئے قواعد وضع کیے اور ان سے جزئیات مستنبط کر کے دکھایا مثلاً۔

لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام	اسلام میں نہ نقصان پہونچانا ہے اور نہ نقصان اٹھانا ہے۔
الضرر یزال۔	نقصان دور کیا جائے۔
المشقۃ تجلب التیسیر۔	مشقت آسانی کھینچتی ہے۔

(۹) قرآنی احکام کے وجوہ و اسباب اور حکمت و مصلحت کی نشاندہی فرمائی جس سے

نئے اصول وکلیات وضع کرنے اور اجتہاد کا دائرہ وسیع کرنے کی سہولت ہوئی۔

(۱۰) آیتوں کے شانِ نزول بیان کیے جس سے زندگی و معاشرہ کے درپیش مسائل کی نشاندہی ہوئی اور ان پر قیاس و استنباط کے لئے مواد فراہم ہوا۔

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کا دائرہ وسیع کرنے اور اس کو نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے قابل بنانے کے لیے رسول اللہ کی تشریح و توضیح اور آپ کے اخذ و استنباط سے استفادہ کی کس قدر ضرورت ہے؟۔

اجتہاد کی تین شکلوں کا وجود تشریح و توضیح اور اخذ و استنباط پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنے سے اجتہاد کی تین شکلیں وجود میں آتی ہیں۔

(۱) وہ جس میں متعلقہ آیت و حدیث کے معنی و مفہوم متعین کرکے مسائل کو حل کیا جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ نے پہلی صورت میں کیا۔ اس میں الفاظ معانی اور موقع و محل تینوں میں نظر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) وہ جس میں مزید غور و فکر کرکے حکم کی علت (علت کی بحث آگے آئے گی) نکالی جائے اور پھر اس کی بنیاد پر مسائل کا حل تلاش کیا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری صورت میں کیا۔

(۳) وہ جس میں شریعت کی روح اور بندوں کی مصلحت پر مشتمل قاعدہ کلیہ وضع کیا جائے۔ اور اس سے مسائل کا حل نکالا جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ نے "لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ" جیسے نئے قواعد وضع کرکے اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔

ان تینوں کے بالترتیب نام اس طرح تجویز کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) اجتہاد توضیحی

(۲) اجتہاد استنباطی۔ اور

(۳) اجتہاد استصلاحی۔

حدیثِ رسول پر گہری نظر کی ضرورت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فقہ کو جس قدر ترقی ہوئی اور اجتہاد نے نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لیے جس قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ سب انہیں تین شکلوں کے مرہونِ منت ہیں لیکن ان تینوں پر قابو پانے کے لیے حدیثِ رسول پر نہایت گہری نظر کی ضرورت ہے صرف اس کا سطحی علم کافی نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:۔

ولہ قشور داخلھا لب	حدیث کے لیے پوست ہے جس کے
واصداف وسطھا	اندر مغز ہے صدف ہے جس کے وسط
دُرّ[۱]	میں موتی ہے۔

پھر مغز اور موتی کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ثم یتلوہ فن معانیہ	پھر اس کے بعد حدیث کے شرعی معانی
الشرعیۃ واستنباط	فرعی احکام کے استنباط حکم منصوص کے
الاحکام الفرعیۃ والقیاس علی الحکم	ظاہر پر قیاس اور اشارہ سے استدلال
المنصوص فی العبارۃ والاستدلال	کا فن ہے نیز منسوخ۔ محکم۔ مرجوح اور
بالایماء والاشارۃ ومعرفۃ المنسوخ	مُبرم کی معرفت کا فن ہے یہ سب بمنزلہ
والمحکم والمرجوح والمبرم وھذا	موتی اور مغز کے ہے۔
بمنزلۃ اللب والدر[۲]	

"اجتہاد" کے ذریعہ چونکہ نبوت کی قائم مقامی کا شرف حاصل ہوتا جو علمی و فکری بلندی کا نہایت اونچا مقام ہے اس بنا پر عمیق نظر اور فنی قابلیت کے بغیر اجتہاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

[۱،۲] ولی اللہ حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱۔ مقدمہ ص ۲۔

اجتہاد کا تدریجی ارتقاء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں چوں کہ قانون کا تمام تر تعلق آپ کی ذاتِ مبارک سے وابستہ تھا اس لئے اجتہاد کی ذمہ داری بھی اصلاً آپ ہی کے سپرد تھی اور نبوت کے ایک شعبہ کی حیثیت سے آپ اس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ رسول اللہ دنیا سے اس وقت تشریف لے گئے جب کہ دین کی تکمیل ہو گئی۔ اور اجتہاد کے ذریعہ ترقی پذیر معاشرہ اور نمو پذیر زندگی کی رہنمائی کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ نیز صحابہ کرام کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جو قانون کے اتار چڑھاؤ اور نوک پلک سے بخوبی واقف تھی۔ اور آپ کے بعد تمدنی ضرورت کے پیشِ نظر اجتہاد کے ذریعہ قانون کو ترقی دینے اور منضبط کرنے کی ہر طرح صلاحیت رکھتی تھی۔ جس طرح طبیبِ حاذق کے ذہین و فہیم شاگرد مدتوں اس کے پاس رہتے اور تجربہ حاصل کرنے کے بعد ان دواؤں اور غذاؤں کے خواص و اثرات اور طریقِ استعمال سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں جن کو وہ استعمال کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح صحابۂ کرامؓ میں جو ذہین و فہیم اور قانون کا ذوق رکھنے والے تھے انھوں نے عرصہ تک نبوی تعلیم اور فیضِ صحبت سے قانون کی حکمت ان کے مقاصد اور طریقِ نفاذ سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ ان حضرات نے قانون کے مواقع و محل کو دیکھا تھا۔ ان کے بنیادی اصول اور کلی پالیسی کو سمجھا تھا۔ اور نبوت کے فیضان سے براہ راست استفادہ کیا تھا اس بنا پر رسول اللہ کے بعد مختلف تمدنی ضرورت کے پیشِ نظر ان کو بجا طور پر ——— اجتہاد کرنے کا حق تھا اور انھوں نے بحسن خوبی اس حق کو استعمال کر کے ترقی پذیر معاشرہ اور نمو پذیر زندگی کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے۔

اجتہاد کے تین اہم دور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بتدریج ترقی کے لحاظ سے اجتہاد کے تین اہم دور ہیں۔

(۱) دورِ اول صحابہ کا اجتہاد

(۲) دورِ ثانی تابعین کا اجتہاد

(۳) دورِ ثالث ائمۂ مجتہدین کا اجتہاد

ان تینوں کی وضاحت سے نہ صرف اجتہاد کے خدوخال نمایاں ہوں گے بلکہ موجودہ دور میں اجتہاد کی وہ دشواریاں بھی دور ہوں گی جن کی بنا پر اس کو ناقابل عمل قرار دیا گیا ہے۔

دورِ اول صحابہ کا اجتہاد

دورِ اول صحابہ کا اجتہاد صحابۂ کرام کے زمانہ میں جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور مختلف تمدنی زندگی سے سابقہ پڑا تو نئے نئے اجتماعی و سیاسی مسائل ابھر گئے جن کو حل کئے بغیر معاشرہ کی رہنمائی کی کوئی شکل نہ تھی حقِ اجتہاد کے باوجود صحابہ کرام نے مسائل حل کرنے میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا چنانچہ حضرت ابوبکر کا یہ طرزِ عمل منقول ہے۔

کان ابوبکر الصدیق اذا ورد علیہ	حضرت ابوبکر صدیق کو جب تصفیہ طلب
حکم نظر فی کتاب اللہ تعالیٰ فان	کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو پہلے وہ اللہ
وجد فیہ ما یقضی بہ قضی بہ	کی کتاب میں دیکھتے اگر اس میں مل جاتا تو
وان لم یجد فی کتاب اللہ نظر	اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر کتاب اللہ
فی سنۃ رسول اللہ فان وجد	میں نہ ملتا تو رسول اللہ کی سنت میں تلاش کرتے
فیہا ما یقضی بہ قضی بہ فان	اس میں مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے
اعیاہ ذالک سأل الناس ھل	تھے۔ اگر خود نہ تلاش کر پاتے تو لوگوں سے
علمتم ان رسول اللہ	سوال کرتے کہ کیا تم جانتے ہو
صلی اللہ علیہ وسلم قضی	کہ رسول اللہ نے اس میں ایسا ایسا
فیہ بکذا وکذا فان لم یجد	فیصلہ فرمایا ہے اگر کسی طرح ان کو

سنة سنها النبی صلی اللہ … جمع رؤوساء الناس فاستشارھم فاذا اجتمع رایھم علی شئ قضی بہ[1]

رسول اللہ کی سنت نہ ملتی تو اہل علم کے رؤساء کو جمع کرکے ان سے مشورہ چاہتے جب وہ کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر کتاب و سنت میں کوئی حکم نہ ملتا تو ابو بکر کے فیصلوں کی طرف رجوع فرماتے پھر مشورہ و اجتہاد کرتے تھے ۔۔۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود و عبد اللہ بن عباس اور دیگر جلیل القدر اصحاب کا بھی یہی طرز عمل منقول ہے۔ کہ پہلے وہ کتاب و سنت میں حکم تلاش کرتے پھر اپنے پیشروؤں کے فیصلوں میں دیکھتے اگر کہیں نہ ملتا تو اجتہاد کرتے تھے[2]

روح شریعت اور مقاصد دین کے پیش نظر اجتہاد

اجتہاد کے موجودہ اصول و قواعد بعد میں منضبط ہوئے ہیں یہ حضرات روح شریعت اور مقاصد دین کے پیش نظر اجتہاد کرتے تھے۔ جن سے اصول و قواعد وضع کئے گئے ہیں۔

(۱) الصحابة رضوان اللہ علیھم عملوا امور المطلق المصلحة لا لتقدم شاھد بالاعتبار[3]

صحابہ کرامؓ نے پیش آمدہ امور میں مطلق مصلحت کا اعتبار کیا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان میں اعتبار کے لیے پہلے سے کوئی شاہد موجود ہو۔

---

[1] ابو عبید کتاب القضاء وابن قیم۔ اعلام الموقعین ج ۱۔ القضاء بکتاب اللہ ثم بالسنة الخ [2] ابن قیم اعلام الموقعین ج ۱ القضاء بکتاب اللہ ثم بالسنة الخ [3] ابن فرحون تبصرة الحکام فی القضایا بالسیاسة الشرعیة۔

فکان عمر یجتهد فی تصرف الحکمۃ التی نزلت فیہا الآیۃ ویحاول معرفۃ المصلحۃ التی جاء من اجلہا الحدیث ویاخذ بالروح لا بالحرف۔[1]

حضرت عمرؓ اس حکمت کی تلاش میں انتہائی کوشش کرتے جس میں آیت نازل ہوئی ہے اور اس مصلحت کی معرفت حاصل کرنا چاہتے جس کی وجہ سے حدیث وارد ہوئی ہے اور روح و مغز کو لیتے ظاہری الفاظ پر اکتفا نہ کرتے تھے۔

روحِ شریعت اور مقاصدِ دین تک رسائی کبھی الفاظ و معنی اور ان کے موقع و محل کی تعیین سے حاصل ہو جاتی اور کبھی مزید گہرائی میں جاکر "علت" تلاش کرنے اور اشیاء و نظائر پر قیاس کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے اجتہادات میں بکثرت مثالیں دونوں کی موجود ہیں۔

(باقی)

---

[1] القضاء فی الاسلام قضاء عمر ص ۱۰۴۔

آثارِ عمرؓ پر ایک نظر

(آثار ابوبکرؓ)

جناب محمد اجمل اصلاحی صاحب

استاذ ادب عربی مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ

(۱)

ماہنامہ برہان کے جولائی ۱۹۶۳ء کے شمارے میں ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی پروفیسر شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا ایک مقالہ "ادبی مصادر میں آثار عمرؓ۔ ایک تجویز مع مثال" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں فاضل مقالہ نگار نے عربی ادب کے مختلف ماٰخذ میں بکھرے ہوئے "عمرؓ" کے اقوال و ارشادات، مواعظ و حکم، حالات و واقعات اور ان سے متعلق جملہ آثار و اخبار کو مرتب کرنے پر زور دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ خود مثال کے طور پر "عمرؓ" سے قریب العہد عربی زبان کے ایک بے نظیر اور شہرۂ آفاق ادیب جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی تصنیفات سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آثار کا ترجمہ مع ضروری تشریح پیش کیا تھا۔ پھر ایک طویل وقفہ کے بعد مارچ ۱۹۶۵ء کے شمارے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آثار کا سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل نو قسطوں میں شائع ہوا اور اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارے پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مضمون کے مطالعہ سے ڈاکٹر خالدی صاحب کے خلوصِ نیت، دیانت داری اور عالمانہ تواضع اور خاکساری کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن مقامات پر موصوف کو زحمت پیش آئی ہے اور صحیح مفہوم واضح نہیں ہو سکا وہاں انھوں نے بے تکلف پوری صفائی کے ساتھ اپنے عجز کا

اعتراف کیا ہے، اور اہلِ علم سے رہنمائی کی درخواست کی ہے۔ مثلاً حضرت سہیل بن عمرو کے خطبہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"سہیل کے اس قول کا مطلب راقم الحروف پر اچھی طرح واضح نہیں ہو سکا۔۔۔۔ اِنی اسأل الخیر ولہ الجزاء[1]"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بڑے ہی مفید، مبارک اور مہتم بالشان کام کا آغاز کیا ہے۔ اس سے شیخین کی زندگی کے مختلف گوشے سامنے آئیں گے جن کے بارے میں عام طور پر سیرت و تاریخ کی معروف کتابیں خاموش ہیں، اور تاریخ اسلام کی ان مایۂ ناز اور یگانۂ روزگار ہستیوں کی غیر معمولی شخصیت کو سمجھنے میں مورخ اور سیرت نگار کو بڑی مدد ملے گی۔

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مرتب و مترجم کو عربی اور اردو دونوں زبان پر یکساں عبور حاصل ہو۔ وہ دونوں کے مزاج، اسالیب اور نزاکتوں سے آشنا ہو، کلام کے تیور کو پہچانتا ہو اور الفاظ کی تہ میں اتر کر معنی کا ادراک کر سکتا ہو۔ اس کے بغیر ترجمہ کے نازک فریضہ سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے، اس فریضہ کی دشواریوں میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب مترجم کے پیشِ نظر جاہلی دور، صدرِ اسلام یا اموی دور کے آثار کا ترجمہ ہو اور وہ خود اس دور کے مخصوص اسالیب سے مانوس نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالہ میں ڈاکٹر خالدی صاحب کو اکثر مقامات پر ناکامی ہوئی۔ راقم السطور کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ان آثار کے ترجمہ میں جس احتیاط اور وقتِ نظر کی ضرورت تھی اس سے کام نہیں لیا گیا ورنہ بہت سی غلطیوں کی اصلاح معمولی توجہ سے باآسانی ممکن تھی۔

ترجمہ کی دو قسمیں ہیں: لفظی اور بامحاورہ۔ لفظی کے لیے مطلب خیز ہونا ضروری ہے۔ اور بامحاورہ کے لیے زبان و بیان کے اسالیب پر قدرت اور ان کا استحضار۔ ڈاکٹر صاحب نے کہیں بالکل لفظی ترجمہ کیا ہے جو رکاکت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور کہیں بالکل خیالی جس کا اصل

---

[1] [illegible]

سے کوئی تعلق نہیں نمونے آگے آئیں گے۔

اصل عربی عبارت کی بجائے بُرہان میں ترجمہ پر اکتفا غالباً اس خیال سے کیا گیا ہے کہ اُردو داں حضرات کے لیے عربی عبارتوں کی ضرورت نہیں۔ نیز ان کی تصحیح نہیں ہو پاتی۔ لیکن اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات اصل عربی عبارت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے عربی داں حضرات بھی ترجمہ کی غلطیاں محسوس نہیں کر پاتے۔

اگر ان آثار کے ترجمہ و تشریح کے دوران دوسرے مآخذ سے بھی رجوع کر لیا گیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ بہت سی تقریریں، اقوال اور واقعات مختلف مراجع میں موجود ہیں اور ان میں روایتوں کے اختلافات بھی ہیں۔ اسی طرح کہیں اجمال ہے اور کہیں تفصیل۔ اگر ایک جگہ جہاں وہ اثر وارد ہوا ہے دوسرے مراجع سے رجوع کر کے روایت کے اختلافات کی نشاندہی کر دی جائے تو ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ بار بار ان کے ترجمہ کی ضرورت نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اگرچہ یہ کام زحمت طلب تھا اور محنت چاہتا تھا مگر موضوع کو سمیٹنے میں اس سے آسانی ہوتی۔

افسوس ہے کسی وجہ سے بُرہان جولائی ۱۹۵۸ء کا شمارہ میری نظر سے نہیں گزر سکا۔ اور جب مارچ ۱۹۵۸ء کے شمارے سے آثار عمر کا سلسلہ شروع ہوا جس میں اول الذکر کا حوالہ تھا تو توجہ ہوئی، اور خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اپنی ناچیز معروضات پیش کروں، مگر اس اندیشے سے کہ یہ مفید سلسلہ رک نہ جائے قطع کلام سے گریز کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مقالہ مکمل ہوا تو بعض ناگزیر ضرورتیں حائل ہو گئیں۔ بہرحال راقم السطور نے عربی ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے بڑے ذوق و شوق اور دلچسپی سے ڈاکٹر صاحب کے مقالہ کا مطالعہ کیا۔ جہاں جہاں اسے ترجمہ میں غلطی معلوم ہوئی ٹھہر کر اپنی ناقص فہم کے مطابق غور کیا، دوسرے مآخذ سے رجوع کیا اور اب آثار ابوبکر پر استدراک کی شکل میں یہ طالب علمانہ کاوش آپ کے سامنے ہے جس میں ڈاکٹر ابوالنصر خالدی صاحب کی اہم غلطیوں کی تصحیح کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ان آثار کی صحیح ترجمانی ہو سکے اور اُردو داں حضرات کو اگر ان آثار سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ترجمہ کی غلطیوں کا شکار نہ ہوں۔

میرے سامنے البیان والتبیین کے دو نسخے ہیں۔ (۱) ایک دو حصوں میں احسن غا کہلانی کے

حواشی کے ساتھ مطبعہ علمیہ سے ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ یہ اس کا پہلا ایڈیشن ہے۔ یہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ کا ذاتی نسخہ ہے جو اب مدرستہ الاصلاح کے کتب خانہ کی زینت ہے اور جس پر مولانا کی بعض قیمتی تعلیقات بھی ہیں۔ (۲) دوسرا نسخہ حسن السندوبی کی تحقیق و شرح کے ساتھ تین حصوں میں مطبعتہ الاستقامہ قاہرہ ۱۳۵۲ھ کا شائع شدہ ہے اور تیسرا ایڈیشن ہے۔ یہ دونوں نسخے خالدی صاحب کے نسخہ سے مختلف ہیں۔ اس مقالہ میں حوالہ موخر الذکر نسخہ کا ہوگا۔ رسائل الجاحظ کا کوئی مکمل نسخہ نہ ملنے کی وجہ سے ان سے ماخوذ آثار کی تحقیق نہ ہو سکی۔ میں خالدی صاحب کا بے حد مشکور ہوں کہ ان کی حق جوئی و حق پسندی نے میرے لیے مہمیز کا کام کیا۔

اس مقالہ میں آثار کا نمبر ڈاکٹر صاحب کی ترتیب کے مطابق ہوگا۔ برہان جولائی ۱۹۷۳ء کے صفحات کا حوالہ ہوگا، اصل عربی عبارت کے بعد ڈاکٹر صاحب کا ترجمہ ہوگا اور اس کے بعد تبصرہ۔ وباللہ التوفیق۔

---

(۲) ص ۱۲ (جولائی ۱۹۷۳ء):

ایک شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قریب سے گذرا اس کے پاس کوئی کپڑا تھا۔۔

حضرت ابوبکر نے پوچھا۔ کیا تم یہ کپڑا بیچتے ہو؟ اس نے کہا:

لا عافاك الله — (خالدی صاحب کا ترجمہ:) نہیں تمہیں اللہ مال دار بنائے۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا:

لقد علمتم لو كنتم تعلمون، قل: لا و عافاك الله[1] — (خالدی صاحب کا ترجمہ) اگر تم تعلیم پاتے تو تم جانتے کہ جواب کس طرح دیا جاتا ہے۔ یوں کہو: نہیں اور اللہ آپ کو معاف کرے۔

دونوں جگہوں پر عافاك الله ہے مگر خالدی صاحب نے پہلی جگہ مال دار بنانے کا ترجمہ کیا ہے اور دوسری جگہ معاف کرنے کا۔ دونوں ترجمے غلط ہیں۔ دوسرے ترجمہ کی تو یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ

[1] البیان ۱، ص ۲۶۹۔

انھوں نے "عافاك" کو غلطی سے بجائے "عافیت" کے "عفو" سے سمجھ لیا مگر پہلے ترجمہ کی کوئی توجیہ ممکن نہیں۔

"عافاك" کا ترجمہ ہوگا: اللہ آپ کو بخیر و عافیت رکھے۔ جواب دینے والے نے یہ غلطی کی تھی کہ عربی قواعد کے مطابق "لا" کے نفی اور "عافاك" کے درمیان "حرف واؤ" نہیں استعمال کیا تھا جس سے اس کے پہلے جواب کا مطلب الٹ گیا۔ وہ تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں یہ کپڑا فروخت نہیں کرتا ہوں۔ اللہ آپ کو بخیر و عافیت رکھے مگر زبان کی غلطی کی وجہ سے اس کے جملے کا یہ مطلب ہو گیا:
اللہ آپ کو بعافیت نہ رکھے[1]

(۳) ص ۳۴۳ اور ۳۴۴:

حضرت ابوبکرؓ نے ایک موقع پر دنیا دار بادشاہ کی خصوصیات و نفسیات، دورِ فتن میں اسلام کی حالت اور اس دور میں مومنین کے طرزِ عمل پر ایک موثر خطبہ دیا۔ ترجمہ کی بعض غلطیوں کی وضاحت میں چونکہ سیاق و سباق کا پیش نظر رہنا ضروری ہے اس لیے ہم پورا خطبہ نقل کرتے ہیں۔

ألا، إن أشقى الناس في الدنيا والآخرة الملوك! فرفع الناس رؤوسهم فقال: ما لكم أيها الناس! إنكم لطعانون عجلون: إن من الملوك من إذا ملك زهده الله فيما في يده، ورغبه فيما في يدي غيره، وانتقصه شطر أجله، وأشرب قلبه الإشفاق. فهو يحسد على القليل، ويتسخط الكثير، ويسأم الرخاء، وتنقطع عنه لذة البهاء، لا يستعمل العبرة، ولا يسكن إلى الثقة.

---

[1] علمائے معانی کے الفاظ میں جب ایک جملہ خبریہ ہو اور دوسرا انشائیہ اور فصل کرنے سے مفہوم قائل کی مراد کے برعکس ہو جائے تو "وصل" ضروری ہے۔

فهو كالدرهم القسي، والسراب الخادع، جذل الظاهر، حزين الباطن فاذا وجبت نفسه، ونضب عمره، وضحا ظله، حاسبه الله فأشد حسابه، وأقل عفوه.
ألا إن الفقراء هم المرحومون - وخيرا لملوك من آمن بالله، وحكم بكتابه، وسنة نبيه صلى الله عليه وسلم -

ألا وإنكم اليوم على خلافة النبوة، ومفرق المحجة وإنكم سترون بعدي مُلكا عضوضا، ومَلكا عنودا، وأمة شعاعا، ودما مفاحا - فإن كانت للباطل نزوة، ولأهل الحق جولة، يعفو بها الأثر، ويموت لها البشر، وتحيا بها الفتن وتموت لها السنن، فالزموا المساجد، واستشيروا القرآن، واعتصموا بالطاعة ولا تفارقوا الجماعة "..... [1]

(خطبہ کے آخری چند جملے چھوڑ دیے گئے ہیں اس لیے کہ تشریح میں ان کی ضرورت نہیں)

ڈاکٹر خالدی صاحب کا ترجمہ:

"کتنے ہی خداوند ایسے ہیں کہ حکمراں ہو جائیں تو جو مال ان کے قبضے میں ہے اس کے خرچ کرنے میں اللہ ان کو بخیل بنا دے اور جو دوسروں کے قبضے میں ہے اس کے لینے کی طرف راغب کر دے اور ان کے جینے کے وقت میں کچھ کمی کر دے اور ان کے دلوں میں زندہ رہنے کی ہوس ڈال دے - یہ ایسے ہیں کہ کسی کے یہاں تھوڑا بھی ہو تو اس پر بھی حسد کریں اور اگر کسی کے یہاں وافر ہو تو اس سے ناخوش ہو جائیں - یہ لوگ آسودگی سے تنگ آجاتے ہیں - نکاح میں ان کو کوئی لذت نہیں ملتی، یہ بہی خواہوں سے کام نہیں لیتے اور بھروسہ کے لوگوں سے خوش نہیں رہتے - یہ تو ایسے ہیں جیسے کھوٹے سکے یا نظر فریب سراب - دیکھنے میں خوش و خرم

---

[1] البیان ج ۲ ص ۴۳ و ۴۴ -

گھا اندر اداس و غمگین۔ جب ایسے شخص کا جی بیٹھ گیا۔ اس کے عمر کی شادابی ٹھٹھر گئی اور اس کا سایہ سکڑ گیا تو اللہ نے اس سے حساب لیا۔ حساب میں سختی کی اور مہربانی میں کمی کر دی اور یہ کہ جو اللہ پر ایمان لائے اس کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے مطابق حکومت کرے۔ اس کا دارو مدار رحم تہی دستوں اور ناداروں ہی پر ہوتا ہے۔

خبردار رہو آج تم نبوت کی خلافت میں ہو بیچ سڑک پر ہو۔ تم دیکھو گے کہ میرے بعد اقتدار میں درشتی اور خلاف راستے سے ہٹا ہوا، امت بکھری ہوئی اور خون بہا ہوا۔ دیکھو اگر باطل کی طرف چھلانگ لگائی جا رہی ہے اہل حق کے خلاف ہوار دوڑ رہے ہیں خلافت کے آثار مٹائے جا رہے ہیں، حق کے خلاف انسان اپنی جانیں دے رہے ہیں، اس کے لیے فتنے برپا کیے جا رہے ہیں اور سیدھے چلے ہوئے طور طریق مٹائے جا رہے ہیں تو ایسی صورتوں میں تم مسجدوں سے الگ رہو، قرآن سے رہنمائی حاصل کرو۔ اطاعت بہر حال کیے جاؤ۔ جماعت سے علاحدگی ہرگز نہ ہونے پائے اور اس سے وابستگی میں فرق نہ آئے۔"

اس ترجمہ میں متعدد مقامات پر غلطیاں ہیں...

(۱) "إن من الملوك ..... الكتيا" کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے:

"بہت سے بادشاہ جب حکمراں ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں اپنے مال کے سلسلے میں بخیل اور دوسروں کے مال کا حریص بنا دیتا ہے، ان کی مدتِ حیات کم کر دیتا ہے اور ان کے دل میں خوف اور گھبراہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کے تھوڑے مال پر بھی حسد کرتے ہیں اور اپنا زیادہ مال بھی انھیں کم محسوس ہوتا ہے۔"

"تسخّطا" کے معنی کم محسوس کرنے کے ہیں۔ اگرچہ بعض روایتوں میں[1] "یحسد علی القلیل و یسخط علی الکثیر" کے الفاظ ہیں مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے موزوں تر روایت وہی ہے جو کہ البیان والتبیین اور عیون الاخبار[2] میں ہے۔ احمد زکی صفوت نے بھی "جمهرة خطب العرب" میں اسی

---

[1] ملاحظہ ہو العقد الفرید طبع ۱۳۱۶ھ ج ۲ ص ۱۱۱۔ اور زہر الآداب للحصری تحقیق محی الدین عبدالحمید اکتوبر ۱۹۵۳ء ج ۱ ص ۳۸۔ [2] عیون الاخبار ۱۹۶۴ء وزارۃ الثقافہ مصر ج ۲ ص ۲۳۳۔

روایت کو ترجیح دی ہے[1]

(ب) "لا یستعمل العبرۃ" کا ترجمہ خالدی صاحب نے کیا ہے: "یہ بھی خواہوں سے کام نہیں لیتے۔"

خدا معلوم ڈاکٹر صاحب نے "عبرۃ" کے معنی بھی خواہ کے کس طرح لیے۔ "عبرۃ" اسی معنی میں ہے جس معنی میں ہم اُردو میں عبرت بولتے ہیں۔ ترجمہ ہوگا: "یہ عبرت نہیں حاصل کرتے۔"

(ج) فإذا وجبت نفسہ ... ان جملوں کا ترجمہ ماضی کی بجائے مضارع کا ہونا چاہیے یعنی:

"جب ان کا آخری وقت آجاتا ہے، ان کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے اور ان کا سایہ اٹھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان سے سخت حساب لیتا ہے اور عفو و درگزر میں کمی کر دیتا ہے سنو! فقراء و مساکین ہی خدا کی رحمتوں کے مستحق ہوں گے۔ بہترین حکمراں وہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق حکمرانی کرے۔

(د) دنیادار اور خدا ترس بادشاہوں کے درمیان فرق واضح کرنے کے بعد مستقبل کے فتنوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو نصیحت کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:-

"فان کانت للباطل نزوۃ ولأهل الحق جولۃ"

خالدی صاحب ترجمہ کرتے ہیں:

"اگر باطل کی طرف چھلانگ لگائی جارہی ہے اور اہل حق کے خلاف سوار دوڑ رہے ہیں۔" دونوں ٹکڑوں کا ترجمہ قابل غور ہے۔ پہلے ٹکڑے میں خود باطل کا چھلانگ لگانا مراد ہے دوسرے ٹکڑے میں لفظ "جولۃ" کے معنی ہیں: پریشانی کے عالم میں گھومنا اور قدم جمانے کی جگہ نہ پانا۔ ایک حدیث میں آتا ہے: للباطل جولۃ ثم یضمحل۔ اس کی تشریح میں ابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں۔

یعنی أن أھلہ لا یستقرون علی أمر یعرفونہ ویطمئنون — یعنی اہل باطل کو قدم جمانے کے لیے کوئی قابل اطمینان جگہ نصیب نہ ہوگی اور آخرکار

[1] جمہرۃ خطب العرب ۱۳۵۲ھ ج ۱ ص ۷۔

إليه - زوال طاری ہو جائے گا۔

اس حدیث کی تشریح کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے اس ارشاد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

أما حديث الصديق: إن للباطل نزوة ولأهل الحق جولة" فانه يريد غلبة، من جال في الحرب على قرنه يجول، ويجوز أن يكون من الأول، لأنه قال بعده: يعفو بها الأثر وتموت السنن[1]	حضرت ابوبکرؓ کے قول: ان للباطل نزوة ولاهل الحق جولة میں جولة سے مراد غلبہ ہے۔ جال فی الحرب علی قرنہ کے معنی غالب آنے کے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں جولہ کے وہی معنی مراد ہوں جو حدیث میں لیے گئے ہیں اس لیے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں: اس کی وجہ سے آثار وسنن کا خاتمہ ہو رہا ہو۔

حضرت ابوبکرؓ کے قول کی پہلی تشریح تو بدیہی طور پر صحیح نہیں: یہاں اس کا کوئی موقع نہیں۔ جیسا کہ خود علامہ ابن اثیر کا اعتراف ہے سیاق اس کے برخلاف اس تشریح کا مقتضی ہے جس کو انھوں نے دوسرے نمبر پر کمزور لہجہ میں ذکر کیا ہے۔ وانکم ..... المساجد کا صحیح ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے۔

"عنقریب تم میرے بعد ظالم حکومت، سرکش حکمراں، انتشار امت اور زبردست خونریزی دیکھو گے۔ اگر باطل دندناتا پھر رہا ہو، اہل حق کے پائے ثبات میں لغزش آ جائے۔ آثار مٹ رہے ہوں، جانیں ضائع ہو رہی ہوں، فتنے جاگ رہے ہوں اور سنتوں کا خاتمہ ہو رہا ہو تو مسجدوں سے چمٹ جانا الخ"

(۴) ص ۱۵:

وفات کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو وصیت کی تھی اس کے

---

[1] مجمع بحار الانوار نول کشور ص ۲۲۲۔

چند جملے یہ ہیں :۔ "فانما ثقلت موازین

" من ثقلت موازینه یوم القیامة باتباعهم الحق فی الدنیا و ثقله علیهم، وحق لمیزان لا یوضع فیه إلا الحق أن یکون ثقیلا، و إنما خفت موازین من خفت موازینه یوم القیامة باتباعهم الباطل وخفته علیهم فی الدنیا، وحق لمیزان لا یوضع فیه إلا الباطل أن یکون خفیفا،"[1]

ڈاکٹر خالدی کا ترجمہ ہے :

"قیامت میں انھیں لوگوں کے وزن بھاری ہوں گے جن کے وزن دنیا میں حق کی پیروی کے اعتبار سے بھاری رہے ہوں۔ حق کا بھاری پن انھیں کے لیے ہوگا (جو دنیا میں اس کو بھاری سمجھتے تھے) میزان اسی لیے ضروری ہے کہ اس میں سوائے حق اور کچھ نہ رکھا جائے اگر وہ بھاری ہو۔ قیامت میں انھیں لوگوں کے وزن ہلکے ہوں گے جن کے وزن دنیا میں باطل کی پیروی کے اعتبار سے ہلکے رہے ہوں۔ باطل کا ہلکا پن انھیں کے لیے ہوگا جو دنیا میں اس کو ہلکا سمجھتے تھے۔ میزان اس لیے ضروری ہے کہ اس میں سوائے باطل اور کچھ نہ رکھا جائے اور اگر وہ ہلکا ہو۔"

اس ترجمہ میں ڈاکٹر صاحب کو کئی جگہ دشواری ہوئی جس کی وجہ سے بعض جملے بے معنی ہوگئے ایک غلطی تو یہ ہوئی کہ "انما" کا "مقصور علیہ" "باتباعهم الحق" کی بجائے "من ثقلت" قرار دیا گیا، حالانکہ "انما" کا مقصور علیہ ہمیشہ جملے کا آخری جزء ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ "ثقله علیهم" کو "باتباعهم" پر عطف کرنے کی بجائے علاحدہ جملہ سمجھ لیا گیا۔ تیسرے یہ کہ "حق" کا ترجمہ غلط کیا گیا۔ چوتھے یہ کہ "ان مصدریہ" کو "ان شرطیہ" قرار دیا گیا۔ یہی غلطیاں بعد والے جملے میں بھی ہیں۔ صحیح ترجمہ ملاحظہ فرمائیے :

---

[1] البیان ج ۲ ص ۴۴۴ و ۴۵۵۔

جن لوگوں کی ترازو قیامت کے روز بھاری ہوگی وہ صرف اس لیے بھاری ہوگی کہ انھوں نے دنیا میں حق کی پیروی کی اور اس سے گرانبار تھے، اور جس ترازو میں حق ہی حق ہو اسے بھاری ہونا ہی چاہیے۔ جن لوگوں کی ترازو قیامت کے روز ہلکی ہوگی وہ صرف اس وجہ سے ہلکی ہوگی کہ انھوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی اور اس کا ان پر کوئی وزن نہ تھا جس ترازو میں باطل ہی باطل ہو اسے بے وزن اور ہلکا ہونا ہی چاہیے۔"

(۹) ص ۱۷:

حضرت خنساؓ کا ایک شعر اس طرح درج ہے:

هَيِّنِ النفوس وهون النفو س يوم الكريهة أبقى لها؟

پہلے مصرعے میں "هَيِّنِ" کو کتابت کی غلطی گمان کیا جا سکتا ہے مگر باقاعدہ اعراب لگایا گیا ہے اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار ہی سے چوک ہوئی "هَيِّنِ" امر کے صیغہ کی بجائے یہاں "نُهِينُ" جمع متکلم کا صیغہ ہونا چاہیے[1]

(۱۱) ص ۱۸ او ۱۹:

(۱) سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت حباب بن المنذر انصاری کی تقریر کا مشہور جملہ ہے:

أنا جذيلها المحكك وعذيقها المرجب۔[2]

یہ جملہ ایک عربی ضرب المثل ہے۔ خالدی صاحب اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

"میں وہ سالار ہوں جس کی رائے تشفی بخش ہوتی ہے۔ میدان قتال میں میری حیثیت جھنڈے کی سی ہے۔ اسی کی وجہ سے نبرد آزما میدان میں ڈٹے رہتے ہیں"۔

جملے کے پہلے جزء کا مطلب تو درست ہے مگر دوسرے جزء کا صحیح نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں جھنڈے کا لفظ کیسے آگیا بڑے غور و فکر کے بعد بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔

---

[1] دیوان الخنساء دار صادر بیروت، ص ۱۲۱۔ [2] البیان ج ۳ ص ۱۷۲۔

"عذیق" کے معنے کھجور کے درخت کے ہیں لغت کی کسی کتاب سے بھی بآسانی معلوم ہو سکتا تھا جب درخت پھلوں سے لد جاتا ہے اور اس کی شاخوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو لکڑی یا کسی دوسری چیز کا سہارا دے دیتے ہیں۔ اسی کو "ترجیب" کہتے ہیں۔ "العذیق المرجب" کھجور کے اس درخت کو کہیں گے جسے سہارا دیا گیا ہو۔

ابن السکیت (متوفی ۲۴۴ھ) مثل کے اس جز کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"قائل کہہ رہا ہے کہ میرا خاندان میری پشت پناہی کرے گا"[1]

لیکن ابن اثیر اور علامہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کے نزدیک حباب بن المنذر کی مراد یہ ہے کہ تجربات کے تنوع اور معلومات کی وسعت میں اس درخت کی مانند ہوں جو پھلوں سے اتنا لد گیا ہو کہ اسے سہارا دینے کی ضرورت پیش آگئی ہو۔[2] یہی مفہوم راجح ہے۔

(ب) سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جو تقریر کی تھی اس کا ایک جملہ ہے۔

"وانتم محقوقون أن لا تنفسوا إخوانكم من المهاجرين ما ساق الله إليهم"

(خالدی صاحب کا ترجمہ)

"آپ کا حق پر اتنا یقین ہے کہ اللہ نے مہاجرین کو جو کچھ دیا ہے اس پر آپ رشک نہیں کریں گے۔"

اس جملے میں حضرت ابو بکر رضؓ نے انصار کو مخاطب کیا ہے۔ لفظ "محقوقون" کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا۔

صحیح ترجمہ یہ ہے:۔

"آپ کے لیے یہی موزوں اور سزاوار ہے کہ اللہ نے ....."

(ج) اسی تقریر کا ایک جملہ عیسیٰ بن ارزق کی روایت میں یوں ہے:۔ "إن هذا الأمر إن تطاولت إليه الخزرج لم تقصر عنه الأوس وان تطاولت إليه الأوس لم تقصر عنه الخزرج"

خالدی صاحب ترجمہ کرتے ہیں: "اگر یہ امر (حکومت) اوس تک بڑھا اور پھیلا تو خزرج

---

[1] لسان العرب (رجب)۔ [2] ملاحظہ ہو مجمع بحار الانوار ص ۱۸۲ اور الفائق ص ۹۴

اس سے ٹھہر کر سکڑ نہیں جائیں گے" (وہ بھی حکومت کا دعویٰ کریں گے)

یہ ترجمہ بظاہر لفظی معلوم ہوتا ہے مگر لفظی بھی نہیں ہے اور نحوی بھی نہیں۔ سلیس اور بامحاورہ ہونا تو درکنار اس عبارت کا صحیح اور واضح ترجمہ یہ ہے۔

"اگر قبیلہ خزرج نے آگے بڑھ کر زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی تو قبیلہ اوس اس سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اور اگر اوس نے دست درازی کی تو خزرج پیچھے نہیں رہے گا۔

(۱۲) ص ۱۹ و ۲۰:

(۱) "من حديث ابن أبي سفيان بن حويطب عن أبيه عن جده"

ڈاکٹر خالدی صاحب نے اسناد کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

"ابن ابی سفیان بن حویطب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں"

گویا تین راوی ہوئے (۱) ابن ابی سفیان (۲) ابو سفیان (۳) ابو سفیان کے دادا (حویطب کے والد)

ڈاکٹر صاحب نے "ابیہ" کی ضمیر کا مرجع ابن ابی سفیان اور "جدہ" کی ضمیر کا مرجع ابو سفیان سمجھا اسی وجہ سے غلطی ہوئی۔ "ابیہ" اور "جدہ" دونوں کی ضمیر کا مرجع ابن ابی سفیان (عبدالرحمٰن) ہیں عبدالرحمان نے ابو سفیان سے روایت کی اور ابو سفیان نے حویطب سے۔ ابو سفیان اور حویطب بن عبدالعزیٰ دونوں فتح مکہ کے روز اسلام لائے تھے۔ یہاں عبدالعزیٰ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ———— (باقی)

بقیہ صفحہ ۲۷۲

اور دشمن کو بھی اُن کی شاعرانہ جلالت، برتری اور انفرادیت کا اعتراف ہی کرنا پڑا۔

بہار صرف غیر معمولی شخصیت و شہرت کے مالک نہیں تھے بلکہ وہ ایران کے بہت بڑے شاعر، ادیب اور تاریخ داں بھی تھے۔ وہ وطن پرست سیاسی مجاہدوں کی صف میں بلند مقام پر فائز تھے۔ بہار جیسی عہد ساز تاریخ ساز اور دلنواز شخصیتیں کبھی کبھی ہی وجود میں آتی ہیں جنھوں نے پیغامبری ہی نہیں سچائی کا مقدس فریضہ بھی ادا کیا ہو۔

○○○○

مقصود تخلیق کائنات

(۸)

جناب غلام نبی صاحب مسلم لاہور

رضوان من اللہ اکبر

امت مسلمہ کی قربانی اور ایثار سے قرآن حکیم کے اوراق بھرے پڑے ہیں، قرآن حکیم میں مومنین کی صفات کا جس قدر ذکر پایا جاتا ہے، اس کا اولین بلکہ حقیقی اطلاق اصحاب رسول کے اوصاف پر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے ایمان اور اعمال صالح کی غرض وغایت اللہ تعالیٰ کی رضا، فضل اور رحمت کا حصول تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (البقرۃ)

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہ لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

کیا ہی پیارے الفاظ میں فرمایا ہے کہ مومنوں کے ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا مقصود دنیا کا حصول نہیں، بلکہ دنیا کو تو وہ قربان کر رہے ہیں، اس کے بدلے میں محض اللہ کی رحمت کے آرزومند ہیں۔ پھر سورۃ الفتح کے آخر میں فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

محمد رسول اللہ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کفار کے مقابل سخت ہیں، آپس میں رحیم ہیں، تو انھیں رکوع سجود کرتے دیکھتا ہے۔ اور ان تمام اعمال کا مقصد وحید اللہ کے فضل اور اس کی رضا کا حصول ہے۔

ان کا یہی مقصد سورہ حشر میں بھی بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

جو لوگ اپنے گھروں اور مالوں سے نکال دئے گئے، وہ اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش کرتے ہیں، اور خدا اور اس کے رسولؐ کی نصرت و اعانت کرتے ہیں۔

رضوان و خوشنودی الٰہی کی بشارت جب امت مسلمہ کی طرف سے مالی اور جانی قربانی ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی غرض وغایت اللہ تعالیٰ کے فضل، رحم اور رضا کا حصول تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ہر میدان میں ان کے ایمان کی آزمائش کرکے اسے بے لوث و کامل پایا تو پھر مختلف مواقع پر نزول برکات ورحمت اور حصول رضا کی خوشخبری بھی سنا دی۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا

یہ نور ان گھروں (بالخصوص مسجد نبویؐ) میں ہے جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ بلند کئے جائے، اور اس کا نام یاد کیا جائے، ان میں اس کی تسبیح صبح اور شام کے وقتوں میں کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم

وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ
(النور: ۳۶-۳۸)

کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن — دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی تاکہ اللہ اس عمل کا انھیں بہترین بدلہ دے جو وہ کرتے ہیں اور اپنے فضل سے انھیں مزید دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

ان آیات کے اولین مصداق مدینہ کے ساکن اصحاب رسول ہیں کہ ان کے سینے اس نور سے منوّر ہیں جو مسجد نبوی میں صبح و شام ذکر الٰہی اور حمد و تسبیح سے انھیں حاصل ہوتا تھا، اور ان کے کاروبار انھیں یاد الٰہی، نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے نہیں روکتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کی جزائے خیر دے گا، اور ان پر زیادہ سے زیادہ فضل کرتا رہے گا۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نوازشات کا ذکر کر کے اصحاب نبی کو بشارت دی ہے:

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔
(التوبہ ۲۰-۲۲)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں، ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور رضا اور باغوں کی خوشخبری دیتا ہے۔ ان کے لئے ان میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہوں گی، انہی میں ہمیشہ رہیں گے، بیشک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

اسی سورۂ مبارکہ میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنی بشارت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ أُولٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

(التوبہ: ۷۱ - ۷۲)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں وہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ ان پر رحم کرے گا، اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اللہ نے مومن مردوں اور عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے اور ہمیشگی کے باغوں میں پاکیزہ رہنے کی جگہ کا وعدہ، اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر نعمت ہے، یہی بڑی بھاری کامیابی ہے۔

تکمیلِ وعدہ کی اطلاع

اللہ تعالیٰ کا وعدہ بذاتِ خود اس امر کی دلیل ہے کہ وہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت میں تربیت پانے والی امتِ مسلمہ کا شرف یہ بھی ہے کہ اسے تکمیلِ وعدہ کی اطلاع خود اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی زبانِ اقدس سے دے دی، اور اس کا اظہار آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف مراحل میں ہوا، چنانچہ مکی زندگی میں ایمان لانے والے مؤمنین کے متعلق فرمایا گیا:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ أُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ○ جَزَاؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے، یہی لوگ مخلوق میں بہتر ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ
(البینہ : ۸-۹)

ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشگی کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ انہی میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ اور یہ مدحہ اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔

سورہ المجادلہ (نزول ۳ھ) میں اللہ تعالیٰ نے السابقون الاولون مہاجرین انصار کا ذکر کرتے ہوئے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ان میں وہ مسلمان دوبارہ شامل ہیں، جنھیں اس سے پہلے بھی مکی زندگی میں یہ سند عطا ہو چکی تھی، گویا کہ چند ہی سال بعد پہلی نوازش کا پھر اعادہ کیا گیا، اور ان سب کی ایمانی استقامت پر مہر ثبت کر دی۔

اولئك كتب فی قلوبهم الایمان وایدهم بروح منه ویدخلهم جنت تجری من تحتها الانهار خالدین فیها رضی الله عنهم ورضوا عنه اولئك حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون۔
(مجادلہ : ۲۲)

انہی کے دلوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایمان لکھ دیا ہے، اور اپنی روح سے اس کی تائید کی ہے اور وہ انہیں باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ یہ اللہ کی جماعت ہے، سنو! اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہوگی۔

ان الفاظ میں کس قدر عظمت اور وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے قلوب میں ایمان لکھ دیا ہے، اور جو ایمان سینوں میں خدا نے تحریر کر دیا۔ اسے کون مٹا سکتا ہے، اور جو شخص یہ گمان کرے کہ خدا کا لکھا ہوا مٹایا جا سکتا ہے وہ بے ایمان اور بدقسمت ہے۔

سورۂ حجرات میں اسی ایمان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَحَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ کہ اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنا دیا، اور اسے تمھارے

دلوں کی زینت بنا دیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی روح سے ان اہل ایمان کی تائید فرمائی جس کی بدولت ایمان مضبوط سے مضبوط تر اور حسین سے حسین تر ہوتا گیا، پھر انھیں جنت کی بشارت دی، اور اپنی رضا اور خوشنودی کی سند عطا کر کے خدا کی منتخب، برگزیدہ اور چہیتی جماعت میں شامل کر دیا، اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

تین سال بعد، ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے محب، جاں نثار مہاجرین و انصار کی معیت میں حج کے ارادے سے عازم بیت اللہ ہوئے، حدیبیہ کے مقام پر حالات نے اچانک پلٹا کھایا، مومنوں سے جان کی قربانی طلب کی گئی، یہاں کیا عذر تھا ان ڈیڑھ ہزار اہل ایمان نے بلا حیل وحجت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر قصاص عثمان ذوالنورین رضؓ لینے کے لئے بیعت کی، اس بے نظیر مظاہرہ ایثار و عشق سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم و اثابھم فتحا قریبا ومغانم کثیرۃ یاخذونھا وکان اللہ عزیزاً حکیماً (الفتح : ۱۸)

یقیناً اللہ مومنوں سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے تو اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، پس ان پر تسکین نازل کی، اور انھیں ایک قریبی فتح بھی دی اور بہت سے اموالِ غنیمت بھی جنھیں وہ لیں گے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے ارادوں اور نیتوں کو پیش نظر رکھ کر پھر اپنی عنایات کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیعت کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی رضا اور خوشنودی کی سند عطا کی، انھیں تسکین کی دولت بخشی، انھیں جلد ہی ایک دشمن پر فتح دی، اور بہت سا مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا، اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی صداقت پر امت مسلمہ کی تاریخ گواہ ہے۔

چوتھی بار اعادہ

ان بشارات کا چوتھی بار اعادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے چند ماہ بیشتر، غزوۂ تبوک کے بعد کیا گیا، غزوۂ تبوک سے قبل ان عاشقان رسول، فدائیان اسلام نے طاقتور عظیم رومی سلطنت کے مقابلے کے لئے، آنحضرتؐ کے ارشاد عالیہ پر اپنے اموال اور جانیں پیش کر دیں، موسم گرما کی شدت کو نظر انداز کر دیا، اور اہل و عیال، کاروبار اور پکی ہوئی فصل کو موسم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر عرب کے تپتے ہوئے صحرا میں عاشق وار بڑھتے گئے۔ ان کی اس ادائے مستانہ سے خوش ہو کر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فرمایا:

السابقون الاولون من المهاجرين	اور پہلے سبقت لے جانے والے مہاجرین
والانصار والذين اتبعوهم باحسان	اور انصار میں سے، اور وہ جنھوں نے
رضي الله عنهم ورضوا عنه واعد لهم	ان کی پیروی کی اللہ ان سے راضی ہو گیا
جنت تجري تحتها الانهار خالدين	اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اس نے
فيها ابدا ذالك الفوز العظيم	ان کے لئے باغات تیار کئے ہیں جن کے
(التوبہ)	نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ انھی میں ہمیشہ رہیں
	گے، یہ بڑی عظیم الشان کامیابی ہے۔

امت مسلمہ، اصحاب رسولؐ کے مقدس گروہ کے مدارج کس قدر بلند ہیں، جن کے لئے متواتر تیئیس سال تک اللہ تعالیٰ کے فضل، رحم، رضوان، مغفرت، فتوحات، غلبہ، فلاح، فوز عظیم اور خلافت کی بشارات ملتی رہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایفائے عہد بھی ہوتا رہا، حتیٰ کہ ـــ ان کی اتباع کو تا قیامت رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ قرار دیا گیا اور ان کی اتباع سے روگردانی کرنے والے کو نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ کے الفاظ میں جہنمی بتایا گیا۔

قیامت کے روز مقام عالی

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لئے تمام نعمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں مومنین اور مومنات

کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے اولین اور حقیقی مصداق وہی مبارک انسان تھے جو آنحضرتؐ کی دعوت پر آپ کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور آپ کی کامل اتباع میں دنیا کی ہر شے قربان کردی اور یہ ذکر کسی ایک دن یا واقعہ تک محدود نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں بیسیوں آزمائشیں آئیں، اور ان سب میں یہ اہل ایمان عشاق آپ کے ہم رکاب رہے، دائیں بائیں، آگے پیچھے سینہ سپر رہے، اور اس ایثار و ایمان پر آسمان نے بھی مہر تصدیق ثبت کردی، اور آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد جو لوگ ایمان لائیں گے، ان کی نجات کے لئے ضروری ہوگیا کہ قرآن حکیم کی روشنی میں اصحاب رسول کی اتباع کو حرزِ جان بنائیں۔

اصحاب نبیؐ کو جو بشارات دی گئیں، ان کا کچھ حصہ دنیا سے وابستہ تھا، وہ ان اہل ایمان کی دنیوی زندگی میں کماحقہٗ پورا ہوگیا اور کچھ کا تعلق حیات بعد الممات اور قیامت سے ہے، ذیل میں چند ایسی آیات پیش قارئین ہیں جن میں آئندہ زندگی میں بھی اصحاب رسولؐ کی مغفرت اور نورانیت کا ذکر ہے۔

(۱) سورہ الفتح کی آخری آیہ مبارک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کے بلند مقامات کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۔

ایمان لانے والے اور اعمال صالح کرنے والے ساتھیوں سے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

(۲) قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کے ایک انعام اور رحمت کا الفاظ ذیل میں بھی ذکر فرمایا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرہ)

اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے وہ ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

(۳) گو مذکورہ آیات میں مومنوں سے مراد بالخصوص عہدِ رسالت کے مسلمان ہیں، تاہم آیت ذیل میں عہدِ نبوی کے مومنوں کو تاریکی سے روشنی میں لانا اللہ تعالیٰ نے اپنا فریضہ بتایا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (الاحزاب : ۴۱)

(اے ایمان والو!) اللہ اور اس کے فرشتے تم پر درود و سلام بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں تاریکی سے روشنی میں لائیں۔

قیامت کے روز نورِ ایمان کی رہنمائی

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا (التحریم)

قیامت کے دن اللہ اپنے نبی اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کرے گا، ان کا نورِ ایمان آگے آگے اور دائیں چلے گا، وہ کہیں گے۔ اے ہمارے رب ہمارا نور کامل تر بنا۔

نور اور مغفرت

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا۔ (الحدید)

قیامت کے دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے آگے اور دائیں دوڑتا ہے، آج کے دن اہلِ ایمان کو باغات کی بشارت ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے ان واضح ارشادات کی روشنی میں دنیا اور آخرت میں امتِ مسلمہ کے بلند مقامات پر کسی دوسرے شخص کے تبصرہ کی کہاں گنجائش ہے، اور پھر دنیا و آخرت کی کونسی نعمت ہے جس سے امتِ محمدیہ کے اولین فرزند، "اصحابِ رسولِ مقبول" بہرہ مند نہ تھے؟ ان کے بعد نہ کوئی ان کا ہم پایہ ہو سکتا ہے، اور نہ ہی ان کے نقشِ قدم سے

ہٹ کر ایمان کی منزل طے کرسکتا ہے۔

خوفناک غفلت

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کے وقت اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت میں دو اہم دعائیں مانگیں۔

۱۔ اے خدا ہم نے اپنی اولاد کو تیرے عزت والے گھر کے قریب آباد کیا ہے۔ خدایا! تو ان میں سے اپنے لئے ایک امت مسلمہ بنا۔

۲۔ اے ہمارے رب! تو ہماری اس اولاد میں سے ایک نبی مبعوث فرما جو تیری آیات انھیں پڑھ کر سنائے۔ ان آیات کے مطابق ان کا تزکیہ کرکا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عظیم اور برگزیدہ بندہ کی دعا قبول کی اور ذریت ابراہیم میں سے عین مکہ مکرمہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جن کے متعلق قرآن حکیم کی شہادت ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ)	اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے ام القریٰ مکہ میں اولاد ابراہیم میں سے ایک عظیم رسول مبعوث کیا، جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کی روحانی نشو ونما فرماتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے مصداق ہیں۔ اور یقیناً ہیں تو پھر وہ امت مسلمہ کہاں ہے جو دونوں دعاؤں کا مقصود و مطلوب ہے۔ اور اگر حضرت ابراہیم کی دعا کا مقصود ہی جماعت مسلمین تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائی اور جس کا آپ نے کماحقہ تزکیہ کیا، تو پھر آج امت محمدیہ میں اس کا کیا

مقام ہے ؟

جیسا کہ اس مختصر سی کتاب میں واضح کیا جاچکا ہے کہ موعود و مبشر امت مسلمہ اسی جماعت سے عبارت ہے۔ جس کی تربیت آنحضرتؐ نے اپنی نگرانی میں، متواتر ۲۲ سال تک ساتھ رہ کر کی، ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے جدا نہ ہوئے اور نہ کسی مرحلے پر اس کی تعلیم و تربیت سے غافل ہوئے۔ حتی کہ اسے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً (المائدہ) کا مژدہ سناکر اور اپنا فریضۂ تبلیغِ دین اس کے سپرد کرکے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

یہی مزکیٰ و مطہر امت تھی، جسے رضی اللہ عنہم کا تاج پہنایا گیا، یہی وہ امت تھی جو آنحضرتؐ کی کامل متبع ہونے کی بدولت شہداء علی الناس اور وارث و نائب رسولؐ ٹھہری، یہی بلند مرتبت امت محمدیہ، اُمتِ وَسَط قرار پائی، اسی کو بارگاہ ایزدی سے خیر امت کا خطاب ملا، یہی امت بلغوا عنی ولو آیۃً کے آخری ارشاد نبوی کی مخاطب تھی، مختلف نسلوں، علاقوں اور مدارج کے افراد پر مشتمل اسی جمعیت کو فاصبحتم بنعمتہ اخوانا کے الفاظ میں وحدتِ آدم کی اساس ٹھہرایا گیا۔ یہی وہ امت تھی جسے رضی اللہ عن المومنین اور ہو اجتبٰکم کے اوصاف نے مرتضیٰ و مجتبیٰ کا ارفع و اعلیٰ مقام بخشا۔ یہی محمد رسول اللہؐ کی فدائی جماعت تھی جس کی صفت اشداء علی الکفار رحماء بینھم بیان کی گئی، جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا و خوشنودی کی جنت کے عوض جان و مال، گھربار، اہل و عیال، خویش و اقربا، شہر و وطن خرید لئے تھے جو اشدّ حبًّا للہ کا عملی نمونہ تھے۔ یہی خوش بخت گروہ ہے جس کا نور قیامت کے روز آگے آگے روشنی بکھیر رہا ہوگا، اور جس سے فضل، رحم اور مغفرت کا خدائی وعدہ ہے، یہی وہ امت محمدیہ ہے جس کے نقشِ قدم پر چلنے والے جنت میں داخل ہوں گے اور جس کے حاسد و منکر جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

لیکن انسان کے ابدی دشمن ابلیس کو یہ کب گوارہ تھا کہ یہ امت دنیا میں پنپے۔ چنانچہ اس نے وسوسہ اندازی سے دشمنانِ دین اور بدخواہانِ امت میں سے ایک بدقسمت گروہ تیار کیا، جس نے کمال چالاکی، فریب اور دسیسہ کاری سے قرآن پاک کی اس ممدوح امت مسلمہ کو اسلام ہی کا دشمن، کافر اور مرتد ٹھہرایا، اور اس طرح نہ صرف دعائے خلیل کی تکذیب کی، بلکہ افضل الرسل، خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) ناکام ٹھہرایا۔

قرآن حکیم اسی امت مسلمہ کی ذکر و تشکیل سے عبارت ہے، اور اس میں جو تعلیمات پائی جاتی ہیں، ان کی غرض و غایت امت مسلمہ کی تربیت، تطہیر، تزکیہ، ہدایت، حفاظت اور تکمیل ہے، پھر اس کی تعلیمات کا اولین اور بہترین پھل یہی فدائیان خدا اور جاں نثارانِ نبیؐ تھے، اس لئے دشمنانِ اسلام اور بدخواہانِ امت مسلمہ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ بعد میں آنے والے مسلمانوں کی زندگیوں سے قرآن کو خارج کر دیا جائے، کبھی اس کتابِ ہدایت کو غائب قرار دیا، تو کبھی محرّف، مبدّل اور نامکمل ٹھہرا کر اس کی افادیت، اہمیت اور مندرجات کو مجروح کیا، انھیں احساس تھا کہ قرآن حکیم کو مسلمانوں کی زندگیوں میں اولیت کا مقام حاصل رہا تو پھر عالمِ اسلام قرآن سے وابستہ رہے گا اور اس طرح مسلمانانِ عالم کی زندگیوں سے اصحاب رسولؐ کی محبت اور سیرت جھلکتی رہے گی، پس انھوں نے ہر ممکن طریق سے قرآن حکیم کو امت مسلمہ سے نکالنے کی سعی کی، فہم قرآن کو ائمہ مجتہدین کا محتاج ٹھہرایا، حتیٰ کہ ائمہ، فقہاء اور علماء کی ذاتی کاوشوں کو قرآن کا قائم مقام قرار دیا گیا۔

اس کے علاوہ امت مسلمہ کے دشمنوں، بالخصوص مجوسیوں اور یہودیوں کو نسلی اور تہذیبی برتری کے احساس کے ماتحت مسلمان عرب فاتحین سے سخت نفرت و حقارت تھی کیونکہ فرزندانِ توحید نے ان کے اقتدار کی مسند الٹ کر مقہور و غریب انسانوں کو ان کے چنگل سے نجات

دلائی تھی، اور یہودیت و مجوسیت کے توہمات اور استبداد کی زنجیریں کاٹ کر ان کی صف لپیٹ دی تھی۔ ان میں سے عوام تو خلوص سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے لیکن رؤسا اور دینی رہنما صحرا نشین عربوں کے ہاتھوں اپنی سیاسی شکست و تذلیل اور مذہبی رسوائی برداشت نہ کر سکے، اور انھوں نے فاتح مسلمانوں کو اپنا ہدف بنایا۔ عرب کا سیدھا سادا مسلمان ان سیاسی سازشوں اور چالبازیوں کا حریف نہیں ہو سکتا تھا، جس کے صدیوں پر پھیلی ہوئی ملوکیت کے زیر اثر عراقی، ایرانی، یمنی، مصری اور رومی ماہر تھے۔ پس انھوں نے نسلی، گروہی اور علاقائی تعصبات کو ہوا دی، اور مسلمانوں کی تاریخ و سیرت کو اس طرح مسخ کیا کہ ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات مشتعل ہوں، پس لوگوں کی توجہ قرآن حکیم میں بیان کردہ ان کے سنہری کارناموں سے ہٹا کر ان روایات اور واقعات کی طرف مبذول کرا دی جو انھوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے تراشے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ امت محمدیہ اپنے بزرگوں کے قرآنی مقام سے بے خبر ہو گئی اور قرآن کے خلاف ان روایات سے چمٹ گئی، جو دشمنانِ ملت نے وضع کی تھیں، ان جنھیں کثرت مزاولت نے تاریخ سے دین میں بدل دیا، اور یہ واقعات اور قصص میں شامل کر دیے گئے، اس کے ساتھ ہی احادیث و سیرت کے نام سے لاکھوں اقوال اور واقعات وضع کیے، جو بالبداہت قرآن حکیم کے خلاف تھے اور انھیں بلا سند کسی بزرگ سے منسوب کر کے پیش کر دیا اور انہی اقوال نے مسلسل تشہیر سے تعلیمات دین کی صورت اختیار کر لی۔

پھر امت مسلمہ کے ان السابقون الاولون کی عظمت و اثرات کو ختم کرنے کے لئے ان راشدین امت، اصحاب رسول کو اکثر مسائل دین سے الگ کر دیا گیا، گویا کہ فہم اور اس کی نشر و اشاعت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اور ان کی بجائے بعد میں آنے والوں کو ائمہ، فقہاء، محدثین، مجتہدین، متکلمین، مجددین، اہل اللہ اور فقرا کو مسند

پر بٹھا دیا گیا، چنانچہ بعد میں آنے والے مسلمان آج تک انہی جدید قائدین شریعت کی تحریرات کی طرف رجوع کرتے آ رہے ہیں، اور ہدایت کے ان چراغوں کو نظر انداز کر چکے ہیں۔ جنھوں نے آفتابِ نبوت سے براہ راست کسبِ نور کیا اور اقصائے عالم میں پھیلایا، مگر مسلمانوں کی سادگی اور مجوسیوں اور یہودیوں کی سازش نے یہ کیفیت پیدا کر دی کہ گویا ان لاکھوں اصحابِ رسولؐ کو تاریخ و عروج اسلام میں کوئی مقام حاصل نہیں، جنھوں نے سیاسی، اخلاقی، روحانی اور دینی فتوحات کے ذریعے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان فیض ترجمان سے پیغام حق سن کر متمدن دنیا میں پھیلایا۔

دوسرا خطرناک حملہ روحانیت کے میدان میں کیا گیا۔ گزشتہ اوراق سے یہ حقیقت آشکار ہے کہ خدا اور رسول کی کامل اتباع سے امت مسلمہ نے وہ سب کچھ حاصل کیا، جو روحانی میدان میں خدا اور رسولؐ کی کما حقہ، اتباع سے مل سکتا ہے، بلکہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے والے سعادت مندوں نے آپ کی صحبت میں رہ کر سالہا سال آپ کے اشاروں پر قربانی دے کر حاصل کیا وہ بعد میں ہونے والے اہل ایمان کو کسی صورت میسر نہیں آ سکتا، اور اگر بعد میں کسی کو کوئی روحانی مقام ملے گا تو بھی ان اصحابِ رسولؐ کی محبت اور کامل اتباع سے ملے گا اور ان کے مسلک سے ذرہ برابر دوری، علیحدگی اور انحراف خسران مبین کا باعث ہے۔

کیا یہ انتہائی حیرت، بلکہ شرم کا مقام نہیں کہ بعد میں اس امت میں لاکھوں اولیاء اور صاحبانِ کشف و الہام تسلیم کئے گئے، ان کے نام سے نئے نئے روحانی سلسلے، زاویے، خانقاہیں اور خلافتیں قائم کی گئیں۔ ان سلسلوں کے بانیوں کو خدا اور رسولؐ کا قائم مقام قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے بغیر معرفت کے دروازے بند بیان کئے جاتے ہیں، اماموں، مجتہدوں اور مجددوں کو بڑھا کر عملاً مطاعِ امت بنا دیا گیا ہے، ان کے مقرر کردہ وظائف و اوراد تو پڑھے جاتے ہیں، ان کی قبروں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں، حالانکہ عرش

منائے جاتے ہیں، تعزیوں اور مزاروں کی چادروں کو حصول جنت کا وسیلہ ٹھہرایا جاتا ہے۔
مگر جن سردارانِ امت کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا، جن کی نصرت کے لئے ہر میدان میں
فرشتے اترتے رہے، جن پر خدا کے فرشتے درود وصلوٰۃ بھیجتے رہے، انھیں ایک گہری سازش
کے ماتحت امت کی مجالس سے نکال دیا گیا، اور اس طرح صدیوں کے پروپاگنڈے کے
زیر اثر آسمانِ رشد وہدایت کے ان مہ پاروں کو فراموش کر دیا گیا، جنھوں نے ہادیِ عالم کی
شمعِ رسالت سے نور حاصل کیا۔

اس ضمن میں سب سے عظیم المیہ یہ ہے کہ امت کو گمراہ کر کے ایسے مسائل میں
الجھا دیا گیا ہے، جن کا قوم کی عملی زندگی اور اساسی اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی
واسطہ نہیں اور اہل دین کی اکثریت متکلمین، مقلدین اور روایت پرستوں کے جال
میں الجھ کر رہ گئی۔ بعض علمار کی علمی اور ذہنی کاوشوں کو دوام بخشا گیا، قرآنی احکام
کو ان کے تابع کر کے ان کی عینک سے دیکھا جانے لگا، احادیث اور مزعومہ ائمہ سے
منسوب اقوال کو قرآن پر قاضی ٹھہرایا گیا، علم لدنی اور الہام کی آڑ میں نئے نئے فتنوں
کو ابھارا گیا، حتیٰ کہ دینی درسگاہوں سے قرآن حکیم کو نکال دیا گیا یا برائے نام رکھا
گیا، اور آج اس کا مصرف زیادہ تر اسی قدر ہے کہ یا تو از آیات آسان بیری یا مرنے
کے بعد قرآن کا ختم کر کے مرنے والے کی سیاہ کاریوں کی پردہ پوشی کی جائے۔

جب قرآن حکیم کو دینی درسگاہوں سے خارج کر دیا گیا تو پھر دینی درسگاہوں کے
فارغ التحصیل علمار کے اذہان میں دیو مالائی قصوں، خود ساختہ افسانوں، فرسودہ
روایات اور گمراہ کن واقعات کے سوا اور کیا ہوگا، اور ایسے حالات میں اگر مسلمان
قوم اصحاب نبیؐ کی عظمت اور پیروی سے محروم ہو کر دنیا میں ذلیل وخوار ہو چکی ہے تو
چنداں تعجب کی بات نہیں، کیونکہ قرآن مجید کی رُو سے دنیا و آخرت میں غلبے کی
راہ وہی اور صرف وہی ہے جس پر شمع محمدیؐ کے پروانے اصحاب رسولؐ چل کر غالب

کامران ہوئے اور جن کی خاطر آنحضرتؐ نے جنگ بدر کے دن اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے عرض کی تھی:

"اے اللہ اگر آج یہ مختصر سی جماعت ہلاک ہوگئی تو قیامت تک تیرا کوئی نام لیوا نہیں ہوگا۔"

ذریت آدم انسانیت کے درجہ کمال تک اس امت کی صورت میں پہونچی، جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، جس کی تطہیر، تربیت اور تزکیہ خاتم الانبیاء، افضل الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس امت پر آج بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے صلوٰۃ بھیجتے ہیں، اور جس کے حق میں ارشاد ربانی کے کے مطابق امت کے تمام اہل ایمان کے قلوب کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم

(الحشر)

اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی مغفرت فرما جو ایمان میں ہم سب سے سبقت لے گئے، اور ہمارے دلوں میں ان کے لئے جو ایمان لائے حسد و کینہ نہ پیدا ہونے دے، اے ہمارے رب تو مہربان رحم کرنے والا ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

(ختم)

ایران کا دیوزاد شاعر

ملک الشعراء بہارؔ

جناب ڈاکٹر آفتاب اختر صاحب

صدر شعبۂ فارسی و اُردو، گاندھی کالج۔ شاہجہان پور

قاآنیؔ کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سرزمینِ ایران پر شاعری کا آتشکدہ خاموش ہو چکا ہے اور طبیعتوں میں شعر وسخن کا پرانا ذوق باقی نہیں رہا ہے لیکن ملک الشعراء بہارؔ کی گرم نوائیوں نے اس خیال کی تردید کر دی اور دنیا پر واضح کر دیا کہ ذوقِ شعری کی چنگاریاں صرف زیر خاکستر ہوئی تھیں بجھی نہیں تھیں۔

ہفت روزہ "تہران مصور"[1] نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شعر وسخن کے استادانِ فن اس امر پر متفق ہیں کہ حافظؔ کے بعد یعنی تقریباً سات سو برس قبل سے بہارؔ کی وفات تک اتنی استادی، مہارتِ فن، توانائی، عظمت اور قدر ومنزلت کا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ وہ آخر دور کے تابندہ ستاروں جامیؔ، ہاتفؔ، صباؔ، سروشؔ اور قاآنیؔ وغیرہ کے درمیان ایک روشن سورج کی طرح تھے جس نے تقریباً نصف صدی تک ایران کے آسمانِ شعر وادب پر نور افشانی کی ہے

---

[1] مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۵۱ء ـ

ممتاز حسن کا خیال ہے کہ قاآنی کے بعد ایران کی شاعری پر جو ایک حد تک جمود طاری ہو گیا تھا اُسے ملک الشعرا بہار نے توڑا ہے[1]۔ "تہران مصور" کا یہ بھی خیال ہے کہ بہار کو عالی مرتبت بلند پایہ اور بزرگ شاعروں کی صف میں محسوب کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اُن کا ثانی عہد امروز کے ایران میں تو ملنا مشکل ہی ہے۔ صدیوں پرانی ایرانی تاریخ میں بھی اس کی نظیر مشکل سے ہی ملے گی[2]۔ ناظر زادہ کرمانی نے بہار کا شمار آخری صدیوں میں ایرانی آسمانِ شعر و ادب پر چمکنے والے تابناک اور درخشاں ستارے کی حیثیت سے کیا ہے۔ کرمانی نے خدا کو گواہ بنا کر کہا ہے کہ بہار عصرِ حاضر کے آخری بزرگ ترین و قوی ترین کلاسیکی فارسی شاعر تھے[3]۔ سید عبدالحمید خلخالی نے بہار کا شمار جدید ایران کے صفِ اوّل کے دانشمندوں اور نثر نگاروں میں کیا ہے اور انھیں بزرگ ترین شاعر قرار دیتے ہوئے ملکِ سخن کا بادشاہ بھی قرار دیا ہے[4]۔ ڈاکٹر منیب الرحمان نے بہار کو معاصر شعرائے ایران میں اہم مقام کا مالک قرار دیا ہے[5]۔ اور کہا ہے کہ اُن کے ہموطن انھیں موجودہ صدی کا اہم ترین شاعر سمجھتے تھے[6]۔ صادق سرمد نے انھیں مَلِک مُلکِ شعر قرار دیا ہے[7]۔ علاّمہ علی اکبر دہخدا نے سبکِ خراسانی کا بزرگ ترین شاعر کہنے کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ آخری چار پانچ صدیوں میں اس سبک میں اُن کی طرح جودتِ طبع اور ذوقِ سلیم رکھنے والا کوئی شاعر معرضِ وجود میں نہیں آیا[8]۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بہار صرف اپنی ہی زبان کے موجودہ شاعروں میں سب سے زیادہ

---

[1] ماہِ نو کراچی مارچ ۱۹۵۲ء۔ [2] مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۵۱ء۔ [3] ایران و پاکستان کی ادبی انجمن کے سربراہ ڈاکٹر ناظم زادہ کرمانی نے یہ خیال عرفانی کی کتاب "شرحِ احوال و آثار ملک الشعرا بہار" میں "اشارہ ای بارزش این کتاب" کے تحت پیش کیا ہے جو فہرست مطالب سے قبل درج ہے۔ [4] تذکرہ شعرائے معاصر ایران در چاپ اول ص ۲۸ [5] پوسٹ ڈاکٹورل یونیورسٹی پریس ۱۹۵۵ برگزیدہ شعر فارسی معاصر ص۔ ۱۸ [6] یہ خیال شعراء کے تعارف میں ظاہر کیا ہے۔ [7] دیوان اشعار بہار جلد دوم۔ ص ۲۲۵۔ [8] شرح احوال و آثار بہار مصنفہ عرفانی کے ص ۱۱۹ پر یہ اقتباس کسی تفصیل کے بغیر دہخدا کے نام سے منسوب ہے۔

عظیم نہیں تھے بلکہ عصرِ حاضر کے بزرگ ترین شاعر بھی تھے[۱]

سعید نفیسی کا خیال ہے کہ بہار بلاشبہ عصرِ حاضر کے عظیم ترین اور دلیر ترین ایرانی شاعر تھے اور وہ تقریباً ۴۳ سالہ عرصے شاعری کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ نفیسی نے یہ بھی کہا ہے کہ عوام کو اُن کے اشعار بیشتر زبانی یاد ہیں۔ انھوں نے بہار کو اپنے زمانے کا اور اپنی زبان کا عظیم ترین شاعر قرار دیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ ہر لحاظ سے شاعر تھے۔ اُن کی طبیعت میں لطافت تھی۔ وہ بے حد باذوق تھے اور اچھے برے کی تمیز کرنا خوب جانتے تھے۔ ایرانی ادبیات میں انھوں نے کافی محنت کی تھی۔ یہاں تک کہ پہلوی زبان بھی سیکھ لی تھی اور اس پر کام بھی کیا تھا۔ وہ موجودہ زمانے میں تازہ ترین افکار و خیالات کو قدیم فصیح شعرا کی زبان میں زیادہ فصاحت کے ساتھ پیش کرنے والوں میں اوّلیت رکھتے تھے۔ جس طرح ہر شاعر عمدہ و خراب، بلند و پست اشعار کہا کرتا ہے اُن کے یہاں بھی یہ روایت موجود ہے لیکن اُن کے عمدہ اشعار کی تعداد دوسرے درجے کے اشعار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ عمدہ اشعار کی تعداد بھی دوسرے شعرا کے عمدہ اشعار کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ جہاں تک اُن کی عظمت کا سوال ہے کوئی شخص بھی اس کا منکر نہیں ہو سکتا۔ وہ عظیم تھے عظیم رہے عظیم مرے اور مرنے کے بعد بھی عظیم ہی رہیں گے۔ سعید نفیسی نے وثوق سے کہا ہے کہ اُن کی شاعری اُن کا نام اور اُن کا کام ایرانی ادبیات کی تاریخ میں ہمیشہ اہم مقام پر فائز رہے گا۔[۲]

ایران کے مشہور شاعر حبیب یغمائی نے بہار کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ایران کے اُن عظیم شاعروں میں تھے جو ایران کے قابلِ فخر ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایران کے نامور اور تاریخی شعرا کی صف میں بلند مقام پر فائز تھے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ نویں صدی یعنی حافظ شیرازی کے بعد سے آج تک اُن کی

۱؎ شرح احوال و آثار ملک الشعرا بہار۔ ص ۱۱۱۔ ۲؎ مقالہ بعنوان "مرگ بہار" مطبوعہ در مجلہ [illegible] اُردی بہشت ۱۳۳۰ ص ۵-۹۔

مثال نظر نہیں آتی۔ عہدِ تیموریہ و صفویہ اور قاچاریہ میں سے کوئی شاعر اُن کے مرتبے تک نہیں پہنچتا۔ اُن کے اشعار پختگی میں قدمائے کلام کے ہم پلہ ہیں اور اُن کے سرمایہ شعر سے مجموعی طور پر لطفِ کلام، ترکیبوں کی دلآویزی و شیرینی ظاہر ہوتی ہے۔ زبان اور محاورے میں مستقبل کی نسلیں اُن سے ضرور متاثر ہوں گی۔ بالکل اسی طرح جیسے آج سعدی کے طرز سے موجودہ زبان و ادب متاثر ہوا ہے[1]۔

مجلۂ کاظمی نے بہار کی ارفع و اعلیٰ شخصیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ موجودہ صدی میں ایران نے بہار جیسا دہ جامع شاعر پیدا کیا ہے جسکی نظیر اس صدی میں نہیں مل سکتی۔ اس عظیم اور ستیزہ کار شاعر سے مشرق بہت جلد الہام حاصل کرے گا اور اکتسابِ فیض کرے گا۔ یہ امر قابلِ فخر ہے کہ کہ موجودہ صدی نے جس میں سیاسی و اجتماعی ایران کا بھی شمار ہوتا ہے ملک الشعرا بہار جیسے عظیم شاعر کو پیدا کیا ہے[2]۔

بہار کی وفات کے چار روز بعد مجلہ "امید نو" میں ایک مضمون "ضایعہ عظیم در عالم سیاست و ادب" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ اس مجلہ نے بہار سے متعلق درج ذیل رائے کا اظہار کیا تھا۔

کسی صدی میں بہار کی طرح لوگ ایک بار ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے نوابغ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اُن کی وفات بہت بڑا حادثہ ہے لیکن یہ اس لیے اور بھی عظیم ہے کہ اُن کی اعلیٰ ادبی، علمی اور سیاسی شخصیت پر اظہارِ رائے کے لیے جامع و مانع الفاظ کی قلت کا احساس ہر ہر قدم پر ہوتا ہے۔ کیونکہ استادِ بے نظیر "سخنور بزرگ" اور "شاعر ارجمند ملی" جیسے روایتی کلمات ہی نظر آتے ہیں جن کا صحیح و غلط استعمال اس سے قبل دوسروں کے لیے بھی ہو چکا ہے۔ اب بہار جیسے عظیم شاعر کے لیے ان کلمات کا استعمال ایک منصف مزاج ادیب

---

[1] مجلہ یغما فروردین ۱۳۳۰ ج ص ۶۔ [2] پاکستان ریویو۔ فروری ۱۹۵۲ء۔

کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے ۔ ارباب سخن اور فارسی ادب کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ گذشتہ سات سو برس کے آخر تک بہار جیسا پُر مایہ اور سرشاری وکیفیت سے معمور شاعر سرے سے نظر ہی نہیں آتا۔ یہ دعویٰ بے جا تملق اور مردہ پرستی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں اچھی خاصی مضبوط ہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر احتیاط سے کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ انوری وسعدی کے زمانے سے اور اگر انتہائی محتاط رہنا ہے تو جامی کے زمانے سے بعد تک بہار کی شاعری جیسی پُر قوت شاعری و سخنوری وجود میں نہیں آئی ۔ جامی کے عہد سے موجودہ عہد تک کا اگر جائزہ لیا جائے تو صاحب ذوق واستعداد تو بہت ملیں گے لیکن کسی نے خود کوئی چیز ایجاد کی ہو ایسی مثال موجود نہیں۔ کیونکہ لوگ گذشتہ افکار کی نقل کرتے رہے یا شعرائے متقدمین کی تقلید۔ وصال، فرزند اور قاآنی وغیرہ بھی عظیم شاعر تھے لیکن ان میں سے ہر ایک کسی ایک شعبے کا ماہر تھا۔ لیکن جہاں تک بہار کا تعلق ہے انھوں نے مخصوص کلمات، تعبیرات اور ترکیبات کے استعمال، اختراع، ایجاد اور فروغ کے علاوہ جدید مضامین اور عمدہ نکات کے پیش کرنے میں اپنی پوری مہارت صرف کی تھی۔[1]

نیکو ہمت کا خیال ہے کہ بہار کو شعر گوئی میں اتنی مہارت اور استادی حاصل تھی کہ انھوں نے شاعری میں نئے سرے سے تازگی و طراوت پیدا کر دی۔[2]

جہاں تک بہار کی شاعرانہ عظمت اور انفرادیت کا سوال ہے عام طور سے بیشتر ایرانی وغیر ایرانی ادیب، نقاد اور شاعر اس کے معترف ہیں اور عنصری و فرخی اور حافظ و سعدی اور جامی و قاآنی کی صف میں ہی جگہ دیتے ہیں ۔ بعض تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ بہر حال اس سے تو انکار ممکن نہیں کہ اُن کے ہم عصروں میں اُن کا مقابل کوئی اور نہیں۔ نقادوں نے اگر انھیں ایک طرف عہد جدید کا کلاسیکی شاعر مانا ہے تو دوسری طرف شعر برائے زندگی کا مبلغ بھی قرار دیا ہے ۔ اگر قدما کے طرز کا پیرو بتایا ہے تو جدت فکر اور نوگوئی

---

[1] پنجم اُردی بہشت ۱۳۳۰ ع ۔ [2] مجلہ ارمغان ۔ پنجم مہر ماہ ۔ ۱۳۳۰ ع ص ۲۸۔

تجربات کو موجبِ ترویج بھی قرار دیا ہے۔

اس ضمن میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بہار میں آخر وہ کون سی خصوصیتیں تھیں جنھوں نے صفِ اوّل کے ایرانی شعرا میں انھیں جگہ دی اور عصرِ جدید کے تمام شعرا پر انھیں فوقیت حاصل ہوئی۔ حالانکہ بہار نے بھی بجز قصیدہ، غزل، مثنوی، قطعہ اور رباعی جیسی اصناف ہی کو قدما اور اپنے ہم عصروں کی طرح اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

بہار کو دراصل جدید شعرا کی فہرست میں ممتاز درجہ دینے کی عام وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ زبان و بیان پر انھیں استادانہ قدرت حاصل تھی اور فنّی لحاظ سے ان کی شاعری میں وہی پختگی تھی جو کلاسیکی شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اُن کا دائرۂ انتخاب بہت وسیع تھا اور وہ اکثر ایسے کلمات استعمال کرتے تھے جو قدیم یا متروک ہونے کے باوجود معنویت رکھتے تھے۔[1] اس کے علاوہ وہ جس طرزِ ادا کے مالک تھے وہ شاعر فرخّی سیستانی کے بعد کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی تھی۔[2] انھیں جذبات کے اظہار میں کامل مہارت حاصل تھی اور اُن کی روایت پرستی جدیدیت کی تبلیغ میں مانع نہیں ہوتی تھی۔ وہ معاصر افکار و مسائل کو پیش کرنے اور اُن کے حل کرنے میں ماہرانہ قدرت رکھتے تھے جس کے ثبوت میں "دماوندیہ" اور "جغد جنگ" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بہار نے کلاسیکی انداز کے باوجود لکیر کا فقیر بنے رہنا پسند نہیں کیا۔[3]

بہار کی خوبی یہ بھی ہے کہ اُن کی شاعری اگرچہ بیشتر روائتی اسلوب کی پابند ہے لیکن اُن کی چند نظمیں اسلوب کے لحاظ سے بالخصوص قوافی کی ترتیب کے لحاظ سے یورپی شاعری کی تقلید میں بے حد کامیاب ہیں۔ اُن کی مشہور نظم "شباہنگ" کو اسی سبب بلند مقام حاصل ہے۔[4]

---

[1] جدید فارسی شاعری۔ منیب الرحمان۔ ص ۱۸۔ [2] ممتاز حسین۔ مجلہ ماہِ نو کراچی، مارچ [illegible]

[3] پوسٹ رِوولیوشن پرشین ورس۔ منیب الرحمان۔ ص ۳۲۔ [4] جدید فارسی شاعری۔ منیب الرحمان۔ ص ۱۷۔

بہار کی عظمت و انفرادیت کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ انھوں نے شاعری کے تمام اصنافِ سخن پر یکساں قدرت سے طبع آزمائی کی ہے اور کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں چھوڑا جہاں اپنی عظمت و شخصیت کا اثر نہ ڈالا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بہار نے فارسی شاعری کے خزانے میں بلند خیالی، تازہ اصطلاحات اور نادر تشبیہات کا بیش بہا اضافہ کیا ہے[1]۔

بہار کو شاعری کی تمام طرزوں پہ عبور رحتا۔ اُن کے وہ شاہکار ہیں جن میں انھوں نے اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی متنوع اور کثیر ہیں۔ بہت سے ایسے موضوعات زیرِ فکر رہے جن میں جولانیِ طبع کے دریا بہا دیے۔ سیاسی، اخلاقی، اجتماعی اور مذہبی تمام موضوعات کو مرکزِ فکر و نظر بنایا۔ اپنے مطالب کو نہایت مضبوط، پُرجوش اور پُرکشش انداز میں پیش کیا۔

نگینہ کاظمی نے کہا ہے کہ بہار کی شاعرانہ شخصیت کی بلندی محض اُن کے تنوع اور شعری جامعیت ہی پہ منحصر نہیں بلکہ اس کا انحصار اُن کی شاعری کی لطافت، شیرینی اور قدرتِ شعرگوئی پر بھی ہے۔ اسی قدرت نے انھیں موجودہ بلند مقام تک پہنچایا ہے[2]۔

بہار کی عظمت و انفرادیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو سماجی، ملی اور سیاسی تحریکوں سے علاحدہ نہیں رکھا بلکہ اُن کے عمق میں اُتر کر گہرائیوں میں شناوری کی اور قومی، سیاسی اور سماجی شعور و ادراک حاصل کر کے اپنی شاعری کو وطنی، سیاسی اور سماجی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے کبھی اپنی شاعری کے توسط سے اپنے ہم وطنوں کی جراحتوں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی اور کبھی اُن کے زخموں کو اس لیے کریدا بھی تاکہ عوام کو زخموں کی شدت و تکلیف اور اُن کے پہنچانے والوں کی شقی القلبی کا احساس ہو جائے اور وہ اُن ظالموں سے اپنا انتقام لینے کے لیے متحد و آمادہ ہو سکیں۔

بہار نے اپنی شاعری کو سیاسی رنگ دے کر وطن پروری کے جذبات کی ترجمانی کی تھی اور اپنی قوتِ تخیل کو محض خیالی و وہمی فضاؤں میں پرواز کے لیے وقف نہیں کیا تھا۔

---

[1] شرح احوال و آثار ملک الشعرا بہار، مصنفہ عرفانی ص ۱۸۰۔ [2] پاکستان ریڈیو ۔ فروری [illegible]۔

ایران کو اغیار کے تسلط اور دستبرد سے نجات دلانا ہی اُن کی نظر میں مقدم تھا۔ اس دور میں ملکی حکمرانوں کی کمزوری کے سبب ایران پر طاقتور پڑوسیوں کی طرف سے جو مظالم کیے جا رہے تھے وہ بہار جیسے حساس شاعر کو بے چین کرنے کے لیے کافی تھے۔ قدرت نے اُن کے قلم کو زبان عطا کی تھی اور زبان کو قلم۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے سے اپنی حب الوطنی کا خوب مظاہرہ کیا۔ ایران اور ایرانی قوم کی بے دست و پائی اور مظلومیت کا بڑے زور شور سے مرثیہ پڑھا۔ لیکن رضا شاہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جب بہار نے اغیار کی دست درازیوں میں نمایاں کمی دیکھی اور کسی حد تک اس کی حد بندی ہوتے ہوئے دیکھی تو "چہار خطابہ" جیسی مشہور مثنوی کی تخلیق کی جو اُن کی شاعرانہ عظمت میں ہمیشہ چار چاند لگاتی رہے گی۔

بہار کی شاعری میں جس قسم کی سیاسی تبلیغ کی گئی ہے لوگ اُس سے متفق نہ ہوں یا اُن کے سیاسی مسلک اور سیاسی خدمات کے معتقد نہ ہوں لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ اُن کی شاعرانہ سحر کاری و فنکاری کے معترف نہ ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اُن کے شاعرانہ مرتبہ کی عظمت کا قائل نہ ہو۔ اگر اُن کے بلند مرتبہ اشعار یا اُن کے کلاسیکی انداز کی صناعی اور فنکارانہ مہارت کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو وہ ایرانی شاعری کی دنیا میں ایک پیغامبر اور نئے مکتبِ فکر و نظر کے حامی و مبلّغ ہی نظر آئیں گے۔

حبیب یغمائی نے بہار کے سیاسی مرتبے کو ان کے ادبی مرتبے سے اس لیے کمتر قرار دیا ہے کہ وہ میدانِ ادب میں صدیوں تک ایرانی اسرار و رموز اور علم و دانش کی قلمرو پر بادشاہت کریں گے[1]

بہار کی شاعرانہ عظمت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگرچہ انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا کیا تھا لیکن اُن کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف

(باقی صفحہ ۳۷۸ پر)

---

[1] مجلۂ یغما خرداد ۱۳۳۰ھ ش ص ۶۔

پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس

اور

میرے مشاہدات وتاثرات

(۸)

سعید احمد اکبرآبادی

۱۴ر مارچ کو کانفرنس ختم ہوگئی، لیکن ۱۵ر کو دو پروگرام اور تھے جو کانفرنس کے سلسلہ میں ہی تھے چنانچہ امپریل بازار میں پیارے میاں جو اصل شاہجہان آباد (اترپردیش) کے رہنے والے تھے، اور اب کراچی کے بڑے صنعت کاروں میں ہیں، اُن کی طرف سے لنچ تھا، شام کو عصرانہ جمعیت پنجابی سوداگران، دہلی کی طرف سے تھا، یہ جمعیت اپنی سلور جوبلی منا رہی تھی، مندوبین بھی اس میں مدعو تھے۔ ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی اور ہر مندوب کو تحائف دیئے گئے اس موقع پر جن حضرات نے تقریریں کیں ان میں نمایاں امام حرم شیخ عبداللہ بن سبیل، مولانا کوثر نیازی، مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا احتشام الحق تھانوی تھے، لیکن سب سے زیادہ موثر، پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر مولانا کوثر نیازی کی تھی، ان کا روئے سخن دراصل حکومت کے ان نکتہ چینوں اور مخالفین کی طرف تھا جنھوں نے کانفرنس کی نسبت پبلک میں طرح طرح کی غلط باتیں مشہور کر رکھی تھیں، مثلاً یہ کہ پاکستان میں اگلے سال جو انتخابات ہونیوالے ہیں اُن

کے لئے زمین ہموار کرنا اور نیشنل پارٹی جس سے مسٹر بھٹو کا تعلق ہے اور جو پاکستان کی حکمران پارٹی ہے اس کے لئے ووٹ حاصل کرنا کانفرنس کا مقصد ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے مولانا کوثر نیازی اعلیٰ درجہ کے خطیب اور مقرر ہیں، انھوں نے اس موقع پر اپنی خطابت کا پورا مظاہرہ کیا اور اس جوش و خروش سے تقریر کی کہ پسینہ پسینہ ہو گئے، پورا مجمع کَاَنَّ عَلٰی رُءُوْسِهِمُ الطَّیْرُ کا مصداق تھا۔

مولانا کوثر نیازی کی تقریر مولانا نے اسلام کے محامد و محاسن اور اس کی تعلیمی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح کی سیرت کانفرنسوں سے کیا ہوتا ہے، اہمیت اور ضرورت تو عمل کی ہے، بیشک یہ صحیح ہے کہ ضرورت عمل کی ہے، لیکن عمل کے لئے کسی محرک کی اور لوگوں میں ذہنی بیداری اور دلوں میں حرارت ایمانی اور ولولۂ و جوشِ عمل پیدا کرنے کی ضرورت بھی تو ہے ہم نے یہ کانفرنس منعقد کر کے اس بنیادی ضرورت کی تکمیل کی ہے، دو ہفتہ تک پاکستان کی پوری فضا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک اور آپ کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کے تذکار و بیان سے گونجتی رہی ہے لاکھوں انسانوں نے امام حرم کی امامت میں جوش و خروش سے نمازیں ادا کی ہیں تو کیا یہ عمل نہیں ہے؟ کیا اس سے مسلمانوں میں جوشِ ایمانی پیدا نہیں ہوا، کیا کانفرنس نے ان کو یہ یاد نہیں دلایا کہ وہ کون ہیں اور انھیں اپنے عمل، اخلاق اور کیرکٹر کے اعتبار سے کیسا ہونا چاہئے، ہم نے یہ کانفرنس منعقد کر کے ایک مستقل تحریک سیرت شروع کی ہے جو تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد کوشش ہے، ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ سیرت مبارکہ کا پلیٹ فارم ہی اس زمانہ میں ایسا پلیٹ فارم ہو سکتا ہے جس پر دنیا کے سب مسلمان اپنے باہمی اختلافات کے باوجود یکجا مجتمع ہو سکتے ہیں اور دوسری قومیں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ وہ مینارۂ حق و صداقت ہے کہ جو لوگ قرآن کو کلام الٰہی نہیں مانتے اور اسلام کے حلقہ بگوش نہیں ہیں وہ بھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے عمل و کردار کا ذکر سنتے یا پڑھتے ہیں تو عقیدت و ارادت سے ان کے سر بھی جھک جاتے ہیں اور ان کی زبانیں بھی مدح و ثنا میں گویا ہو جاتی ہیں، جیسا کہ اس کانفرنس میں مشاہدہ کیا گیا۔ سیرت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ دنیا کو اسلام سے قریب لایا جا سکتا ہے اور اسی راہ سے اقامتِ دین بھی ہو سکتا ہے دنیا کے مختلف نظامہائے زندگی کا تجربہ کر کے دیکھ لیا کہ اسے کہیں چین، امن و امان اور سکھ نہیں ملا۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اس کو سیرت کے ذریعہ اسلام کے نظامِ زندگی سے واقفیت پیدا ہو تو وہ اسے اپنے درد کا درمان سمجھ کر قبول نہ کرے۔ ہم نے جو مستقل تحریک سیرت شائع کی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گی، اور خدا نے چاہا تو آیندہ صدی اسلام کی صدی ہو گی یعنی اس صدی میں اسلام کو غلبہ ہو گا، اس کے نظامِ فکر و عمل کا جھنڈا اونچا ہو گا اور دکھوں اور درد و الم کی ماری دنیا اس کے دامن میں پناہ لینے کے لئے دوڑے گی، لوگ پوچھتے ہیں: ہماری ثقافت کیا ہے؟ لاکھوں انسانوں نے امامِ حرم کے پیچھے نماز پڑھ کر بتا دیا ہے کہ ہماری تہذیب کیا ہے؟ یعنی!

دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست

واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی تقریر نے سماں باندھ دیا اور چونکہ یہ تقریب بھی کانفرنس کا ایک جز تھی اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اس تقریر پر کانفرنس کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

عشائیہ اس وقت ڈنر بھی جمعیت پنجابیان دہلی کی طرف سے مہران ہوٹل میں تھا۔ اس ڈنر میں مقامی حضرات بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، چنانچہ متعدد احباب جن سے اب تک کانفرنس میں یا اس کے باہر کہیں ملاقات نہیں ہو سکی تھی، کیونکہ وہ کہیں نظر ہی نہیں آئے، اُن سے یہاں ملاقات ہو گئی، انھیں دوستوں میں جناب (اور اب) مولانا ماہر القادری ہیں، موصوف برصغیر انڈو پاک کے بلند پایہ اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے آسمانِ شہرت پر طلوع ہوئے، تقسیم کے بعد جب یہ پاکستان منتقل ہو گئے تو ان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہو گیا، اپنے ہم عصروں میں

روشؔ صدیقی مرحوم کی طرح طبیعت کے ہمیشہ سے نیک اور صالح تھے، چنانچہ بمبئی کے تو بہ شکن ماحول میں برسوں رہنے کے باوجود وہ "بے سجادہ رنگین کن" کے کبھی قائل نہ ہوئے، کراچی پہونچنے کے بعد ان کا یہ رنگ اور نکھرا اور اب شعر سے زیادہ انھوں نے نثر پر توجہ کی، فاران جسان کا ماہنامہ ہے اس کو "اسلامی ادب" کا ترجمان کہنا چاہئے۔ ان کی شاعری جو پہلے حسن و شباب کی شاعری تھی اب وہ چولا بدل کر حکمت ہوگئی، اور انھوں نے تنقیدی مضامین میں اصلاح زبان و بیان پر اس شدت سے زور دیا کہ بڑے بڑے مصنف اور ارباب قلم بھی اس کی زد سے نہیں بچے، جب تک وہ یہاں تھے اُن سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ تقسیم کے بعد یہ ان سے پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی نہایت رواروی میں، اگرچہ اب ان کی ہیئت اور وضع میں کافی فرق ہوگیا ہے، لیکن جب انھوں نے محبت آمیز لہجہ میں السلام علیکم کہنے میں سبقت کی تو مجھے ان کو پہچان لینے میں ذرا دیر نہیں لگی، تقسیم سے کچھ دنوں پہلے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون جو شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتی تھیں میرے ہاں مقیم تھیں، ایک دن میں نے ان کی فرمائش پر مولانا ماہر القادری کو اپنے گھر مدعو کیا اور موصوف نے اپنا کلام سنایا، اب اس وقت ماہر القادری صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ تیس برس کے بعد انھوں نے اس واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے بڑی بے ساختگی سے کہا کہ "بس ہماری آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی" مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا کل کی بات ہے، اس سے طیّ زمان کا عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

مہران ہوٹل سے رخصت

یہ ڈنر کانفرنس کی آخری تقریب تھی اس کے بعد مندوبین ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے۔ میں نے شب ہوٹل میں بسر کی اور دوسرے دن یعنی ۱۶ مارچ کو صبح ناشتہ کے بعد مونا آگئے، اور میں ہوٹل سے رخصت ہو کر ان کے ساتھ گھر آگیا، یہ مکان کراچی کے سول لائن میں ہے جسے کوئنز روڈ لالہ زار کہتے ہیں، مکان طرز جدید کا کافی وسیع اور کشادہ ہے، چونکہ اب صرف مزید پانچ دن قیام کا ارادہ تھا، اس لئے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کوئی بیرونی مصروفیت قبول نہیں کروں گا۔ اور خاموشی سے اپنے بچوں میں اور اعزا و اقربا اور چند احباب سے ملنے ملانے میں یہ دن گذاردوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا بھی، متعدد اداروں کی طرف

سے تقریر کی فرمائش ہوئی لیکن میں نے معذرت کر دی اور چونکہ عذر معقول تھا اس لئے کسی نے برا نہیں مانا۔

حیدر آباد کا سفر

بایں ہمہ عہد و پیمان حیدر آباد سندھ کا سفر کرنا پڑا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حیدر آباد سندھ میں کئی روز سے سیرت کانفرنس ہو رہی تھی، ہم لوگ ابھی پشاور میں تھے کہ وہاں حیدر آباد کے ایک نہایت معزز بزرگ مولانا سید محمد ہاشم صاحب فاضل شمسی کا ایک خط حکیم محمد سعید صاحب کے نام پہونچا کہ سعید احمد اکبر آبادی کی تقریر سننے کے لئے حیدر آباد کے لوگوں کا بڑا اصرار ہے اس لئے آپ ان کو یہاں آنے پر آمادہ کر دیجئے۔ حکیم صاحب نے مجھ سے پوچھے بغیر مولانا کی دعوت کو میری طرف سے قبول کر لیا اور ان کو اطلاع دے دی، بعد میں حکیم صاحب نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو طبعاً مجکو ناگواری تو ہوئی لیکن حکیم صاحب کی مروت میں اسے پی گیا اور ہاں کر لی اور پھر خیال ہوا کہ اس بہانہ پاکستان کا ایک مشہور شہر بھی دیکھ لوں گا جو اب تک نہیں دیکھا ہے۔

کراچی آکر حیدر آباد کے حضرات ۱۴ر تاریخ کو بات پکی کر گئے اور پروگرام سے مطلع کر گئے تھے اس کے مطابق ۱۶ر کی شام کو چار بجے ایک صاحب حیدر آباد سے کار لیکر پہونچے اور میں اپنے لڑکے جنید کے ساتھ روانہ ہوا، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بھی مدعو تھے، راستہ میں ناظم آباد سے انھیں لیا، کراچی سے حیدر آباد کا راستہ کار سے تین ساڑھے تین گھنٹہ کا ہوگا، سڑک چوڑی، نہایت پختہ اور صاف ستھری، شام کا سہانا وقت، موسم خوشگوار اور فضا کھلی اور نشاط انگیز، اور پھر سید صاحب کی رفاقت جو بڑے اچھے گفتگو باز (Conversationalist) اور دلی دوست ہیں، ان سب باتوں کی وجہ سے کانفرنس کے پروگراموں میں جکڑے رہنے کے باعث طبیعت میں طائر زیر قفس کی مانند جو گھٹن پیدا ہو گئی تھی وہ کافور ہو گئی اور یہ سفر اک طرح کا پکنک ہو گیا، مغرب کے قریب اک رستوران آیا تو وہاں کچھ دیر ٹھہر کر چائے پی۔ ساڑھے سات آٹھ بجے حیدر آباد پہونچے، مولانا سید محمد ہاشم فاضل شمسی اور بعض حضرات نے

استقبال کیا، سید صاحب کا قیام اُن کے ایک عزیز کے ہاں تھا یہ قیام جلسگاہ کے قریب نامکمل تو تعمیر شدہ مکان میں ہوا۔ عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد کھانا کھایا اور پھر ہم لوگ جلسہ گاہ میں پہونچ گئے، مجمع بہت بڑا تھا۔ مہاجرین کی آبادی کے اعتبار سے کراچی کے بعد حیدر آباد کا دوسرا نمبر ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگ دہلی یا لکھنؤ کے کسی جلسہ گاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، وہاں کچھ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پہونچتے ہی ایک مختصر تعارفی تقریر کے بعد میری تقریر شروع ہوگئی جو کم و بیش ایک گھنٹہ کی ہوگی، میرے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی تقریر ہوئی جس کو پاکستان کی سیرت کانفرنس پر ایک تبصرہ کہنا چاہیئے، موصوف تقریر و خطابت کے مرد میدان کبھی نہیں رہے، تقریر بھی گفتگو کے انداز میں بذلہ سنجی اور شگفتگی بیان کے ساتھ کرتے ہیں جس سے سامعین محظوظ ہوتے اور لطف لیتے ہیں، ایک مرتبہ کراچی میں ایک مقام پر میں اور صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ساتھ کھڑے تھے اتنے میں امام حرم تشریف لے آئے، اُن کا آنا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے ان کے دیدار کے لئے دیوانہ وار دوڑ پڑے، سید صاحب پر اس منظر کا بڑا اثر ہوا، کہنے لگے: "اللہ اکبر! مقبولیت کا کیا عالم ہے!" میں نے برجستہ کہا: "یہ سب کچھ نتیجہ ہے اس محبت اور عقیدت و ارادت کا جو ہر قسم کی معصیت کوشی کے باوجود ہر مسلمان کے قلب میں سرزمین حجاز کی خاک قدس کے لئے پنہاں ہے، چنانچہ امام حرم تو امام حرم! ابھی اگر کراچی میں یہ خبر اڑ جائے کہ یہاں مدینہ کی گلی کا ایک کتا دم ہلاتا اور لوگوں کو مسترحمانہ نگاہوں سے دیکھتا یہاں پہونچ گیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ لاکھوں مسلمان آناً فاناً میں اس کتے کو دیکھنے کے لئے لپک پڑیں گے۔" یہ بات سید صاحب کے دل کو لگ گئی، اس وقت تو وہ خاموش رہے، لیکن اپنی اس تقریر میں میرے حوالہ سے انھوں نے میرے یہ فقرے بھی دہرائے، لیکن میں نے یہ بات اپنے انداز میں کہی تھی، سید صاحب نے یہ بات پیکر جذبات بن کر گلوگیر آواز، مرتعش لب، چہرہ پر تمتماہٹ، آنکھیں پرنم، "مدینے کے کتے" پر زور دیا اور گردن کو تھوڑا سا خم دیکر اور ہاتھوں کو گھما کر جو کہی تو سامعین پر جذب و وجد کا عالم طاری ہوگیا اور بہت سے لوگ

کے منہ سے چیخ نکل گئی، اور کیوں نہ ہو! سرکار دو عالم کے نام نامی اور اسم گرامی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ ؎

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

سید صاحب نے اس کے بعد کہا کہ پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔

اس کے بعد جلسہ ختم ہو گیا تو جلسہ گاہ سے بہت سے حضرات میرے ساتھ قیام گاہ پر آئے، میں نے سب کے ساتھ چائے پی، ان حضرات کے رخصت ہونے کے بعد میں لیٹنے لگا تو مولانا شمسی نے پوچھا: کوئی ضرورت! میں نے عرض کیا: صرف اس قدر کہ میں علی الصباح اُٹھکر چائے کی ایک پیالی پینے کا عادی ہوں اس کا انتظام کر دیجئے، خادم موجود ہی تھا انھوں نے اُس سے کہدیا، اور ٹھیک چار بجے جب میں اٹھا تو چائے تیار تھی، صبح ناشتہ پر بہت سے حضرات تھے، یہ سب اترپردیش اور بہار کے اصل باشندے تھے، ان میں گورنمنٹ آفیسر اور اردو زبان کے شاعر اور ادیب اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی تھے، یہ حضرات برہان اور میری کتابوں سے واقف تھے، بلکہ بعض حضرات نے بیان کیا کہ انھوں نے ہندوستان میں اِدھر اُدھر میری متعدد تقریریں بھی سنی ہیں، دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ کراچی کی واپسی کے لئے جب میں اور جنید کار میں بیٹھے تو پہلے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو ان کی قیام گاہ سے لیا پھر میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ آج سندھ یونیورسٹی بند ہے، ورنہ وہاں ضرور جاتا، اب کم از کم حیدرآباد میں گھوم پھر کر اس کا ایک نظارہ تو کرا ہی دیجئے، چنانچہ یونیورسٹی اور کالجوں اور یہاں کے دوسرے قابل دید مقامات پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے ہم لوگ حیدرآباد سے رخصت ہو گئے۔

طلباء کے ایک وفد سے ملاقات | دو بجے کے قریب گھر پہنچا تین بجے ہوں گے کہ چند طلباء کا

ایک وفد آگیا، ان حضرات نے صبح ٹیلیفون پر ملاقات کی درخواست کی تھی اور مسعود نے حیدرآباد سے میری متوقع واپسی کا وقت بتا کر ان سے آنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ علیک سلیک اور مزاج پرسی وغیرہ کے بعد ان سے بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔

سیرت کانفرنس کی نسبت میرے تاثرات

انھوں نے پوچھا: سیرت کانفرنس کا دعوت نامہ آپ کو براہ راست ملا تھا یا گورنمنٹ آف انڈیا کی معرفت۔ میں نے جواب دیا: دعوت نامہ براہ راست میرے نام سوئز ایمبسی کی معرفت آیا تھا۔ میں نے وزارت خارجہ کو لکھا انھوں نے فوراً بڑی خوشی سے اجازت دے دی، ساتھ ہی مجھے یہ معلوم ہوا کہ اگر دعوت نامہ گورنمنٹ کی معرفت آتا تو گورنمنٹ خود اپنا ایک وفد بھیجنے کے لئے تیار تھی اور اس صورت میں آمد و رفت کا سارا خرچ گورنمنٹ برداشت کرتی۔ اب انھوں نے سوال کیا: "کانفرنس کی نسبت آپ کے تاثرات کیا ہیں"۔ میں نے کہا: "سیرت کانفرنس بہت کامیاب رہی ہے اور اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا"۔ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک نوجوان نے فوراً کہا: "لیکن کانفرنس کا مقصد تو آیندہ الکشن جیتنا اور عوام کو دھوکا دینا ہے"۔ یہ سن کر مجھے طیش آگیا اور میں نے ذرا بلند آواز میں کہا: جتنے اچھے کام ہیں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سماجی، سیاسی یا تعلیمی وغیرہ ان کا سیاست پر لازمی اثر پڑتا ہے خواہ ان کا براہ راست مقصد سیاست ہو یا نہ ہو، تو پھر کیا آپ کا مقصد یہ ہے کہ ارباب سیاست کو کوئی اچھا کام اس ڈر سے کرنا ہی نہیں چاہیے کہ لوگ اس کا مقصد سیاست سمجھیں گے؟ مجھے یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ آپ اسلام کے علمبردار ہیں، لیکن آپ نے اپنے چند مخصوص نظریات و افکار کے علاوہ اسلام کی تمام اخلاقی تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک شخص نے اسلام کے ایک شدید دشمن اور کافر کو اس وقت بھی قتل کر دیا تھا جب کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرما کر اس شخص سے باز پرس کی۔ اس نے جواب

دیا: حضور! اس نے تو تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا: هَلَّا شَقَقْتَ قَلْبَهُ" تو پھر تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہیں دیکھ لیا" غور کیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دو لفظی ارشاد میں حکمت و موعظت کے کتنے بیش بہا گوہر پوشیدہ ہیں اور حسن معاشرت کا کس درجہ اہم اصول آپ نے ایک مختصر سے جملے میں بیان فرما دیا ہے، اس سلسلہ میں آپ کا وہ ارشاد بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا: ولا تجسسوا اعمال الناس یعنی کوئی شخص اپنے گھر میں کیا کرتا ہے، تم اس کی ٹوہ مت لیا کرو، یہ مختصر سا جملہ بھی ایک بہترین اور اعلیٰ اصول حسن معاشرت کا حامل ہے کیونکہ اگر ٹوہ لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو سوسائٹی کا نظم ونسق درہم وبرہم ہو کر رہ جائے گا، اولاد کو ماں باپ پر، طلبا کو استاذ پر، عوام کو لیڈر پر، مریدوں کو شیخ پر، بیوی کو شوہر پر، غرض کہ کسی کو کسی پر اعتماد اور بھروسہ نہیں رہ جائے گا اور پھر کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا، میں نے کہا: حضور کے یہ دو قول تو میں نے بہ طور نمونہ سنائے ہیں ورنہ کتب احادیث آپ کے اس ہی جیسے اقوال اور اُن کے مطابق آپ کے اعمال و افعال کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر دنیا ان اقوال کو اپنا لے اور ان پر عمل پیرا ہو تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ جہنم کدہ ایک جنت ارضی میں تبدیل ہو سکتا ہے، لیکن دنیا کو ان گوہر ہائے آبدار حکمت سے کیا واسطہ! جب ہمارے مدارس عربیہ میں ہی ان کی اہمیت نہیں ہے اور وہاں سارا زور فقہ کے جزئی مسائل و مباحث پر ہوتا ہے۔ پھر قرآن مجید کو دیکھئے، اس میں بھی اس سلسلہ کی کس قدر اعلیٰ تعلیمات ہیں، ارشاد ہوا: ان بعض الظن اثمٌ بے شبہ بعض ظن وتخمین کی باتیں گناہ ہیں، ان الظن لا یغنی من الحق شیئًا بے شبہ ظن حق اور سچائی کا ذرا بھی فائدہ نہیں پہونچاتا، پھر حکم دیا گیا وظنوا بالمومنین خیرًا اور مومنوں کے ساتھ حسن ظن ہی رکھو، ایک جگہ متنبہ کیا گیا: ولا تقفُ ما لیس لك به علمٌ یعنی جن چیزوں کا تم کو علم نہیں ہے ان کے پیچھے مت پڑو، ایک مقام پر فرمایا گیا: ولا یغتب بعضکم بعضًا خبردار! ایک دوسرے کی کوئی پیٹ پیچھے

بدگوئی نہ کرے، میں کہاں تک گناؤں، آپ خود قرآن پڑھتے ہیں ان سے اور ان جیسے دوسرے احکام اقدار اوامر و نواہی سے واقف ہوں گے، مگر افسوس! آج مسلمانوں کا حال کیا ہے، بڑے بڑے نماز روزہ کے پابند اور حج کرنے والے مسلمان بھی ان تعلیمات کی پرواہ نہیں کرتے، ہوا و ہوس کے گھوڑوں پر اڑتے اور اپنی ذاتی رغبت و نفرت کی ہواؤں کے رخ پر چلتے ہیں جس سے ذرا ناراض ہوئے اسے تحت الثریٰ میں پہونچا دیا اور جس سے کسی بات پر خوش ہوئے اسے ثریا پہ لے جاکر بٹھا دیا: "وائے گر در پس امروز بود فردائے"۔ اتنے میں چائے اپنے لوازم کے ساتھ آگئی اور میں نے محسوس کیا کہ میری تقریر بے اثر نہیں رہی ہے تو میں نے چائے سے تواضع کرتے ہوئے اپنا لب ولہجہ نرم کیا اور پھر کہا: عزیزان من! آپ نوجوان ہیں، آپ پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آیندہ قوم کی تعمیر و ترقی کا بارگراں آپ کو ہی اٹھانا ہے، آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ قومیں انتشار ذہن و فکر اور پراگندگی خیال سے نہیں بنتی، ایک کیرکٹر، اعلیٰ کردار، متوازن فکر اور جہد و عمل مسلسل سے بنتی ہیں، اگر آپ آیندہ الکشن میں مسٹر بھٹو اور ان کی کابینہ کو ووٹ دینا نہیں چاہتے تو آپ آزاد ہیں، کوئی جبر نہیں، لیکن یہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ گورنمنٹ نے جو اچھی باتیں کی ہیں یا کر رہی ہے آپ ان پر بھی خاک ڈالنا شروع کردیں، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے انسان کو سنجیدگی فکر کے ساتھ اپنا موقف متعین کرنا اور اس کے اچھے اور برے پہلوؤں پر اچھی طرح غور و فکر کرلینا چاہیئے، میں سیاسی آدمی نہیں ہوں، اور نہ مجھے آپ کے ملک کی سیاسیات پر کچھ بولنے کا حق ہے البتہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں وہی بات کہہ سکتا ہوں جو ایک عالمگیر اصول معیشت و معاشرت کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بھی قرآن مجید اور سیرت مقدسہ کی روشنی میں۔

دوسرا سوال اب انھوں نے ایک سوال اور کیا اور وہ یہ کہ اچھا! لاہور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا احتشام الحق تھانوی کیوں کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے، میں نے جواب دیا کہ اول تو شخصی

لات مجھے ناگوار ہوتے ہیں، میں افراد و اشخاص کو موضوع بحث بنانا پسند نہیں کرتا، ہمیشہ اصول سے سروکار رکھتا ہوں، پھر اس کا تعلق سیرت کانفرنس کی مجلس منتظمہ سے ہے، مجھے کیا خبر کہ انھوں نے کس کو بلایا تھا اور کس کو نہیں بلایا اور اگر کوئی نہیں آیا تو کیوں نہیں آیا۔ علاوہ ازیں کراچی میں اگرچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علالت کے باعث خود شریک نہیں ہوئے لیکن انھوں نے مقالہ بھیجا تھا جس کو ان کے فرزند رشید مولانا محمد تقی عثمانی نے پڑھکر سنایا تھا اور خود مولانا محمد تقی اجلاس میں برابر شریک رہے، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کو بھی میں نے ایک دو مرتبہ کانفرنس میں دیکھا، مولانا احتشام الحق کو اگرچہ کانفرنس میں نہیں دیکھا لیکن وہ دو استقبالیوں میں شریک تھے اور انھوں نے تقریر بھی کی تھی، اور ایک بات یہ بھی ہے کہ چونکہ کانفرنس کی کارروائی زیادہ تر انگریزی میں ہوتی تھی اس لئے اس میں شرکت انگریزی نہ جاننے والے حضرات کے لئے گرانی کا باعث تھی، البتہ ہاں! مولانا مودودی کو کہیں نہیں دیکھا۔ وہ مدعو تو ضرور ہوں گے، لیکن اس زمانہ میں علیل تھے اس لئے شریک نہ ہوسکے[1] میں نے مزید کہا کہ جب عالم اسلام کے اکابر علماء و فضلاء اور شیخ الازہر ایسے بلند مرتبت زعماء دین اس کانفرنس میں شریک ہوگئے اور سب تعریف کرتے ہوئے گئے تو پھر آپ کو اس بات کا کیا غم کہ پاکستان سے کون شریک ہوا اور کون شریک نہیں ہوا۔

مولانا کوثر نیازی کے متعلق ایک سوال

اب انھوں نے مولانا کوثر نیازی کی نسبت میرے تاثرات پوچھے، میں نے وہی باتیں کہیں جن کا اظہار میں برہان میں

---

[1] چنانچہ شاہ ایران کی آمد کے موقع پر جو سرکاری دعوت ہوئی تھی اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی مدعو تھے، اور اگرچہ دوسری مخالف پارٹیوں نے اس دعوت کا بائیکاٹ کردیا اور اس میں شریک نہیں ہوئے، لیکن مولانا مودودی نے حزب مخالف کی حیثیت سے اس ضیافت میں شرکت کی اور جہاں دوسری مخالف پارٹیوں کو اخبارات نے سخت برا بھلا کہا انھوں نے مولانا مودودی کے اس موقف کی تعریف کی۔

کرچکا ہوں، اس پر ایک نوجوان نے کہا : وہ پہلے تو جماعت اسلامی کے ممبر تھے میں نے کہا ہوں گے! مجھے اس کا علم نہیں ہے، میں تو وزارت میں آنے سے پہلے انھیں بحیثیت ایک ادیب، صحافی اور مقرر کے جانتا تھا لیکن جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر یہ صحیح بھی ہے تو اس سے مولانا کی منقصت کیسے لازم آگئی کیونکہ جماعت اسلامی حق کا مدار نہیں ہے، مولانا امین احسن اصلاحی جیسے کتنے ہی مسلمہ طور پر دیندار اور صاحب فکر و نظر حضرات ہیں جو ایک زمانہ تک جماعت سے وابستہ رہے اور پھر اپنی فہم و بصیرت کے مطابق وہ اس سے الگ ہو گئے، مولانا نیازی اگر پہلے جماعت سے وابستہ تھے تو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے جذبہ سے ہی ہوں گے اور ان میں یہ جذبہ اب بھی ہے، پہلے ان کے لئے خدمت دین کا دائرہ بہت محدود تھا، آج یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ اگر چاہیں تو اسلام اور مسلمانوں کی وہ عظیم الشان خدمات انجام دے سکتے ہیں جو جماعت سے وابستگی کی صورت میں ہرگز انجام نہیں دے سکتے تھے، لیکن مسلمانوں کی یہ ذہنیت بڑی افسوسناک ہے کہ وہ حکومت کو ایک گندہ تالاب سمجھتے ہیں، جو اس میں داخل ہوا اُن کے نزدیک ناپاک ہو گیا، حالانکہ حکومت ملک و قوم کی خدمت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ہاں اس میں شبہ نہیں کہ گذشتہ زمانہ میں آپ لوگوں کو بڑے تلخ تجربات ہوئے ہیں، لیکن اچھے برے کہاں نہیں ہوتے، کسی ادارہ میں برے لوگوں کے گھس آنے کے باعث وہ ادارہ برا نہیں ہو جاتا، ہندوستان ہو یا پاکستان ہر جگہ قومی حکومتیں قائم ہیں، لوگوں کے دلوں میں ان کا احترام ہونا چاہیئے، اور حکومت کو غلط راستے پر پڑ جانے سے بچانے کے لئے پارلیمنٹ اور اسمبلی میں ایماندار، سچے اور صائب الرائے نمائندوں کو بھیجنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

گفتگو یہاں تک ہوئی تھی، ساڑھے چار ہو گئے تھے کہ مونا نے یاد دلایا کہ پانچ بجے تک بھٹولاں جگہ حسب وعدہ پہونچنا ہے، اس لئے میں نے طلبار سے اجازت لی، رخصت ہوتے وقت ان سب نے [illegible] شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی گفتگو سے ہم کو بہت فائدہ ہوا ہے کاش! آپ یہ تقریر مجمع عام میں کرتے۔ (باقی)